رسالہ ندیم گیا (۱۹۳۱ء — ۱۹۴۹ء) سے انتخاب ۱۶

نام پرنٹ: رفتگاں مناظر کی

اسلامی تہذیب و ثقافت

(۲)

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

Marfat.com

۲۹۷٫۹۰۹
خ ۱۴۸
۹۵۷۷۱
جلد ۲

سال اشاعت : ۱۹۹۹ء

قیمت : سو روپے

غیر ممالک کیلئے : پانچ ڈالر

طابع و ناشر:- خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

Marfat.com

حرف آغاز

ہماری اشاعتی پالسی رہی ہے کہ کتابوں کے علاوہ رسالوں کے انتخابات بھی شائع کیے جائیں جو علم وادب کی ترویج اور تحقیق وتدوین میں معاون ثابت ہوں۔ لہٰذا اردو کے اہم اور قدیم رسالوں کے موضوعی انتخابات شائع کیے جاتے ہیں۔ رسالہ "ندیم" گیا کا شمار نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے مؤقر رسالوں میں ہوتا تھا۔ یہ ۱۹۳۱ء سے نکلنا شروع ہوا اور ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ اب تک اس کے انتخابات کی چار جلدیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

"اسلامی تہذیب وثقافت" کے عنوان سے دو جلدیں پیش خدمت ہیں۔ اس انتخاب میں جو مضامین شامل ہیں، ان میں بلا کا تنوع اور بوقلمونی ہے۔ ان کے لیے ایک نام تجویز کرنا بہت مشکل تھا۔ اسلامی تہذیب وثقافت بہت وسیع عنوان ہے اور یہ اس مجموعے کے مندرجات کا پوری طرح احاطہ کرلیتا ہے۔

ہم نے جدید کتابت کی بجائے عکسی شکل کو اس لیے ترجیح دی ہے تاکہ یہ احساس رہے کہ اصل رسالے ہی کا مطالعہ کیا جارہا ہے۔ علاوہ ازیں متن کی صحت بھی برقرار رہے۔

توقع ہے انتخابات کا یہ سلسلہ لائق پذیرائی ہوگا۔

—— حبیب الرحمٰن چغانی

Marfat.com

Marfat.com

فہرست

عربی تہذیب	سید احمد بہاری	۱
خالص عربی سیاست	خواجہ محمد عبدالمجید دہلوی	۴
جھوٹی آزادی	مسعود عالم ندوی	۹
عربوں کے جغرافی معلومات	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	۱۴
مغربی تمدن کا اثر اسلامی ممالک پر	سید اختر حسن	۱۹
عرب کے چند غیر مسلم سیاح	مسعود الرحمٰن ندوی	۲۴
حضرت امام حسین نے شہادت کیوں قبول کی	سید حسین امام	۲۷
حضرت امام حسین نے شہادت کیوں قبول کی	ادارہ ندیم	۳۱
حضرت عمر بن عبدالعزیز	محمد طیب عثمانی	۳۵
عرب کی چند کنیزیں جنہوں نے نام پیدا کیا	ادارہ ندیم	۳۸
جمیلہ: قدیم عرب کی شہرہ آفاق مغنیہ	سید ریاست علی ندوی	۴۲
سلامہ و حبابہ: دو عرب گانے والیاں جن کا اسلامی خلافت پر قبضہ تھا	" " "	۴۵
مسلمان سلاطین و امرا کے اخلاق پر ایک نظر	عبدالسلام ندوی	۵۰
دور عباسیہ کا اخلاقی اثر علوم و فنون پر	" "	۶۳
ہارون الرشید اور شارلیمین: کیا ان میں کوئی سیاسی تعلق تھا	عبدالحلیم ناظم دربھنگوی	۶۸
ہارون رشید اور شارلمان کے تعلقات پر موتمر الہلال مصری کا خیال	فخر عالم	۷۱
جعفر برمکی	خواجہ عبدالمجید دہلوی	۷۴
عریب مامونیہ: خلیفہ مامون رشید کی مشہور محبوبہ	سید ریاست علی ندوی	۷۸

Marfat.com

اسپین موجودہ خانہ جنگی سے پہلے	معین الدین دردائی	۸۲
اسپین کا ایک نامور مسلمان حکمران: خلیفہ عبدالرحمن الناصر	سید ریاست علی ندوی	۸۸
افغانستان جنگ عظیم کے بعد	سید محبوب احمد وارثی	۱۰۲
سید جمال الدین افغانی	مسعود عالم ندوی	۱۰۷
حضرت علامہ سید جمال الدین افغانی	محمود بریلوی	۱۰۹
البانیہ: یورپ کی ایک ننھی سی سخت جان حکومت	پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی	۱۱۷
شاہ احمد زدغ کی شادی	" " "	۱۲۶
شاہ البانیہ کی ہمدردی عورتوں کے ساتھ	سید علی منظفر امام	۱۲۸
ایران: رضا شاہ پہلوی کے دور حکومت میں	سید محبوب احمد	۱۳۱
رضا شاہ پہلوی کی داستان محبت	ثاقب عظیم آبادی	۱۳۶
ٹیونس کی کشمکش	پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی	۱۳۹
موجودہ جنگ کے اہم محاذ۔ جبرالٹر اور اس کی سرگزشت	مظفر گیلانی	۱۴۲
نوخیز عراق اور اس کا پہلا بحری بیڑہ	مسعود عالم ندوی	۱۴۵
دنیا کا سب سے پرانا شہر	پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی	۱۴۸
سامرا	حکیم سید احمد اللہ ندوی	۱۵۳
غرناطہ کے جشن فتح پر ایک عرب سیاح کے تاثرات	عبدالسلام ندوی	۱۵۷
کراچی	زخشاں ابدالی	۱۶۰
مصر کی نئی سیاسی تشکیل	منصور کاکوی	۱۶۴
سلطان نورالدین زنگی	حکیم سید احمد اللہ ندوی	۱۷۱
اسماعیل پاشا کے محلات کی زندگیاں	فخر عالم	۱۷۷
محمد علی پاشا	عبدالرحمن ناصر	۱۸۲
شیخ محمد عبدہ	سید ولایت اصلاحی	۱۸۶

Marfat.com

مسلمان اور ریاضیات	ادارہ ندیم	۱۸۸
علم طب اور مسلمان	نبی احمد اصلاحی	۱۹۳
اسلام چین میں	محمد ناظم ندوی	۲۰۶
مسلمانان چین کی سابقہ غفلت اور موجودہ بیداری	بدر الدین چینی	۲۱۶

Marfat.com

Marfat.com

عربی تہذیب

(ماخوذ از ایچ۔ جی۔ ولس)

عربوں کی ذہنی ارتقا کا دور آمدِ اسلام کے ساتھ ہی شروع ہوگیا اور تھوڑے ہی دنوں میں عربی تہذیب نے یونانی تہذیب کی جگہ لی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے قبل ہی سے اہل عرب کے دماغوں میں ترقی کی آگ سلگ رہی تھی، لیکن اسلام کے بعد آگ اس زور و شور سے بھڑک اٹھی کہ اس کا جواب شاید یونانی تہذیب کے سوائے کوئی اور نہیں دیکھتی ہے، عربوں نے لوگوں میں علم کی جستجو کا شوق نئے سرے سے پیدا کردیا اور سچ تو یہ ہے کہ اگر اہل یونان حقیقی معنوں میں سائنس کے ابوالآبا کہلانے کے مستحق ہیں تو اہل عرب انکی خدمت اور نشر و اشاعت کی وجہ سے یہ فخریہ لقب مزید اختیار کر سکتے ہیں اس لیے کہ دورِ حاضرہ کی ترقی عربوں کی منت پذیر ہے نہ کہ یونانیوں کی۔

عربوں کے پہلے فتوحات نے انکی تہذیب کو یونانی روایات کے بہت جلد ہمکنار کردیا، یہ ادبی روایات یونانی زبان میں ترجمہ کی صورت میں تھیں سلطنتِ روم سے مشرق کی طرف رہنے والے عیسائی جنہیں نسطورین (Nestorian) کہا جاتا ہے بزنطیم کے عیسائیوں سے کہیں زیادہ ذہین اور جوش و خروش والے تھے، تعلیم میں بھی انکا مرتبہ مغربی لاطینی زبان بولنے والے عیسائیوں سے کہیں ارفع و اعلیٰ تھا، ساسانی خاندان کے زمانہ میں ان سے رواداری برتی گئی اور ترکوں کے دورِ اقتدار میں بھی انکی آؤ بھگت ہوتی رہی، یہ یونانی طب کے ماہر تھے، بنو امیہ کے وقت میں ان میں کے بہتیرے مسلمان ہوگئے تھے اور اطبا کی حیثیت سے ساری سلطنت میں چھائے ہوئے تھے، علم ریاضی میں بھی یہ کافی مہارت رکھتے تھے، عربوں کی تعلیم کا معیار گرچہ بہت اعلیٰ نہ تھا تاہم عربوں کا دماغ، ذہانت اور تیزی میں اپنا آپ مثال ہے، جب ان کا ان نسطورین معلموں سے سابقہ پڑا تو انہوں نے بہت جلد تعلیم حاصل کرلی اور اس تعلیم میں کافی اضافہ کیا

عربوں کے اساتذہ یونانی تعلیم پائے ہوئے سریانی ہی نہ تھے بلکہ یہودی بھی تھے، یہودیوں کی تہذیب و معاشرت جداگانہ تھی، مشرق کے اکثر بڑے شہروں میں یہ پائے جاتے تھے، عربوں کا ان سے سابقہ پڑا اور دونوں نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا، عربوں نے یہودیوں سے بہت سی نئی باتیں سیکھیں اور یہودیوں کا دماغ بھی پھر عربوں کے اثر سے مجلّیٰ ہوگیا۔ یہودی اپنی زبان کی ناجائز ہمدردی نہ کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آمدِ اسلام کے ہزار برس قبل وہ اسکندریہ میں یونانی زبان بولتے تھے اور اب اسلامی دور میں وہ عربی بولنے لگے۔

اس کے علاوہ عربوں کے تعلیمی معیار بڑھانے کا ذریعہ ہندوستان بھی کہا جاسکتا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ علم ریاضی میں عربوں نے ہندوستانیوں سے بہت کچھ سیکھا، یہ خیال کہاں تک صحیح ہے ٹھیک

Marfat.com

طور سے نہیں کہا جا سکتا' لیکن اتنا ضرور ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا۔

عہدِ بنی امیہ ہی سے عربوں کی دماغی قابلیت نمایاں ہو چکی تھی' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عباسیوں کا دور آتے آتے انکی قابلیتیں پورے آب و تاب کے ساتھ منصۂ شہود پہ آگئیں' فلسفہ اور ادب کی ابتداء تواریخ سے ہوا کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ عربوں میں پہلے پہل بہت اچھے مورخ اور سوانح نگار پیدا ہوئے' جیسے جیسے عوام میں تعلیم کا شوق پیدا ہوتا گیا' ویسے ویسے فساد اور تعصب کی بنیاد پڑی ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ شرفاء اور کاروباری لوگوں کے لئے تعلیم ضروری سمجھی جانے لگی اور اس وجہ سے تعلیم کے لئے باضابطہ مدارس قائم ہوئے یہاں تک کہ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں عربوں نے گرامر کو مرتب نہ کیا بلکہ لغات اور علم المعانی والبیان پر بھی کتابیں لکھیں۔

یورپ کی تہذیب و تمدن کے اوراق جب سادہ نظر آتے ہیں' اس وقت ہماری نظر عربوں کے دورِ ارتقاء پر پڑتی ہے اور ان کے اوراقِ تہذیب قسم قسم کے نقش و نگار سے پر دکھائی دیتے ہیں' اسلامی ممالک کے مختلف شہروں میں بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم تھیں مثال کے طور پر بصرہ' کوفہ' بغداد' قاہرہ اور قرطبہ کے نام کافی ہیں' ان تعلیمی مراکز کی روشنی اسلامی ممالک تک محدود نہ تھی بلکہ مشرق و مغرب تمام دنیا پر پھیلی ہوئی تھی' جامعہ قرطبہ کا اثر اطالیہ اور مغربی یورپ کی یونیورسٹیوں پر پڑ رہا تھا عربوں نے ابن رشد (۱۱۲۶ء تا ۱۱۹۸ء) سا فلسفی پیدا کیا جس نے ارسطو کی تعلیم کو مکمل کر کے مذہب و سائنس کو یکجا کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سائنس کو ترقی کا موقع ملا اور اعتقادات کے پھندے میں پڑنے سے ایک حد تک بچا رہا' دوسری بڑی ہستی ابن سینا بخاری کی ہے جو کہ صحیح معنوں میں حکماء کا شاہزادہ کہا جا سکتا ہے' غرض یہ کہ کتابوں کی تصنیف دمشق' قاہرہ اور بغداد وغیرہ میں ہونے لگی' اور قرطبہ میں سنہ ۹۷۰ء میں غریبوں کی تعلیم کے لئے ۲۷ مدارس جاری کئے گئے۔

تھیچر (Thatcher) اور اسکول (Schwill) کہتے ہیں کہ جہاں تک علم ریاضی کا تعلق ہے عربوں نے یونانی ریاضی دانوں کی پیروی کی اور اس میں بہت اضافہ کیا' عربی اعداد کیسے بنے یہ ابھی تک ایک راز ہے' تھیوڈورک اعظم (Theodoric the great) کے زمانے میں بوتھیس (Boethius) نے چند نشانات استعمال کئے تھے جو کہ نوں اعداد سے بنتے ہوتے تھے' لیکن بارہویں صدی عیسوی تک صفر (Zero) کا پتہ نہ تھا' اسے ایک عرب ریاضی دان محمد ابن موسیٰ نے ایجاد کیا' اسی شخص نے اعداد کو ایک مستقل چیز بنایا'

علم ہندسہ میں عربوں نے اقلیدس پر بہت اضافہ کیا لیکن علم الجبر تو خاص انہیں کی تخلیق ہے۔ انہوں نے حساب المثلثات مستدیر (Spherical trigonometry) میں اضافہ کیا اور اس میں ماس (tangent) اور جیب (Sine) وغیرہ جیسے محاورات ایجاد کئے۔ علم الطبیعیات میں انہوں نے الرقاص (Pendulum) ایجاد کیا اور علم النور والبصریات (Optics) پر مقالے کا مقالہ لکھ ڈالا' علم الہیئت میں بھی انہوں نے بہت ترقی کی جا بجا رصدگاہیں قائم کیں' اس کے متعلق بہتیرے آلات نکالے جو اب تک استعمال کئے جاتے ہیں' انہوں نے مدار الشمس (Ecliptic) کے زاویہ کا حساب کیا اور اعتدال شمسی (Equinoxes) کو معلوم کیا کہ غرض یہ لوگ اس فن میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

علم طب گرچہ عربوں نے ایک حد تک یونانیوں سے حاصل کیا تاہم انہوں نے اس میں اس قدر ترقی کی کہ گویا یہ فن انہیں کا ہو رہا' ادویہ پر ان کی کتابیں موجودہ مخزن الادویہ سے کم نہیں ان کے علاج کے اکثر طریقے اب تک مروج ہیں' ان کے جراح احساس کے زائل کرنے والی ادویہ (Anaesthetics) کا استعمال پورے طور سے جانتے تھے' ان جراحوں نے جراحی میں وہ کمال حاصل کیا تھا کہ ان کے عمل کا حال پڑھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے' جبکہ یورپ میں ادویہ کا استعمال پادریوں کی طرف سے ممنوع قرار دیا گیا تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ مذہبی ٹوٹکے امراض کو فنائیت کا جام پلانے کے لئے کافی ہیں' اس وقت عربوں کے یہاں علم طب کا حقیقی وجود موجود تھا'

علم کیمیا میں بھی عربوں نے کافی ترقی کی' انہوں نے بہت سی چیزیں پردۂ راز سے باہر نکالیں' مثال کے طور پر البوٹاسا (Potash) ملح الحامض نتفہ (Nitrate of Silver) اور الحامض الکبریتی (Sulphuric

Marfat.com

ر acid وغیرہ ہیں، صنعت و حرفت میں بھی وہ اپنے دور میں سارے جہان سے گوئے سبقت لے گئے، وہ ہر قسم کا دھات استعمال کرتے، مثلاً سونا، چاندی، تانبا، پیتل اور لوہا وغیرہ، پارچہ بافی میں وہ اپنی آپ مثال تھے، وہ بہترین قسم کا شیشہ اور برتن بناتے تھے انہیں رنگنے کا بھی راز معلوم تھا اور کاغذ بنانا بھی جانتے تھے، چمڑے کی دباغت و صباغت کی وجہ سے وہ سارے یورپ میں مشہور تھے، بہت سی چیزوں سے شربت وغیرہ طیار کرتے تھے، انہیں گنے سے شکر بنانی آتی تھی، اور قسم قسم کی شراب طیار کرنا بھی جانتے تھے، آب پاشی کا خاص انتظام رکھتے، اور زراعت سائنٹفک اصول کے ماتحت کرتے تھے انہیں کھاد کی ضرورت کا صحیح اندازہ تھا۔ اور زمین کے حسن اور قسم کے مطابق سے بیج بوتے تھے، علم فلاحۃ البساتین (Horticulture) میں وہ اپنی آپ مثال تھے، انہوں نے سرزمین مغرب میں بہت سے مشرقی پودے اور درخت لگائے اور زراعت پر مقالے کا مفصلاً تذکرہ ڈالا۔

عربوں کا ایک احسان جس نے اہل یورپ ہی نہیں بلکہ کل بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود میں حصہ لیا۔ وہ ان کا کاغذ بنانے کا علم تھا، کاغذ بنانا انہوں نے اہل چین سے سیکھا تھا، اور یورپ والوں نے اسے عربوں سے سیکھا، اس زمانہ تک کتابیں پتوں اور چمڑوں پر لکھی جاتی تھیں جب تک کہ کاغذ بنانے کا علم معلوم نہ ہوتا اور کاغذ کافی مقدار میں نہ بنایا جاتا، طباعت کا کام بیکار اور اخبارات کی اشاعت اور تعلیم کا عام طور پر نشر ناممکن تھا۔

سید احمد (بہاری)

(مارچ ۲۵ء)

خالصِ عربی سیاست

(از جناب نواب خواجہ محمد عبد المجید صاحب دہلوی)

خلیفہ ثانی کا دور فتوحات کا دور ہے۔ جزیرہ نمائے عرب پر مستقل حکومت قائم ہو چکی ہے۔ یہ تو فتح مکہ کے بعد ہی ہو گئی تھی۔ طوعاً کرہاً یا مصلحتاً سارا عرب مسلمان ہو گیا۔ سب کی وردی شرعی ہو گئی۔ نماز روزہ کے بھی پابند۔ ظاہر آباد، باطن خراب۔ مہاجرین سب کے سب اور انصار بیشتر صدق دل سے ایمان لائے۔ تاہم فتح مکہ کے بعد کا معاملہ دگرگوں ہے۔ اکثر مصلحتاً یا مجبوراً داخل اسلام ہوئے۔ عقل کا بھی یہی مقتضی ہے۔ ایک منٹ میں کایا پلٹ نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی بعض کچے پکے بیروں[1] پر اسلام کا رنگ چوکھا آیا۔ اوّل درجے کے مسلمان بنے۔ باقی کا حال خدا پر روشن ہے۔ کلام پاک حلق کے نیچے نہیں اُترا۔ آگے چل کر یہی گروہ یا انکی ذریات خرابی کا باعث ہوتے ہیں، اسلام کے نام کو دھبا لگاتے ہیں۔ خانہ جنگی کا بیج بوتے ہیں۔ ادھر سایۂ رسالت سر سے اُٹھا، ادھر دلوں میں کجی آ گئی۔ یہ انہیں لوگوں کا مقولہ ہے۔ زکوٰۃ سے انکار اور خلیفہ اوّل کی لشکر کشی شاہد حال ہے۔

عرب کا بیشتر حصہ بے آب گیاہ صحرا۔ بیت المال کی آمدنی کے صرف دو ذریعہ۔ صدقہ یعنی زکوٰۃ یا عُشر۔ بڑی آمدنی زکوٰۃ کی مد۔ وہ بھی کچھ زیادہ نہیں، حکومت کے ضروریات کیلئے ناکافی۔ عُشر ہوا نہ ہوا برابر۔ یہ تو ایران کی چیز ہے، عرب میں نووارد۔ اُسی ملک کیلئے موزون جو سیر حاصل ہو۔ یہاں کیا دھرا ہے جو عُشر معتد بہ ہو۔ اس پر روزانہ جہاد یا لشکر کشی کا بار۔ دینی احکام اور دنیوی مصلحت دونوں کا یہی اقتضا۔ ہمسایہ ملکوں کو زیر نگیں کیا جائے۔ وہاں کے مال غنیمت سے عرب کی پرورش ہو۔ پڑوس میں دو سلطنتیں موجود، دونوں پراگندہ حال، ایک کم ایک زیادہ۔ دونوں برسرِ پیکار۔

رومتہ الکبریٰ یعنی Byzantine Empire اور ایرانی تخت کسریٰ پر جھگڑے بکھیڑے۔ نت نیا بادشاہ سریر آرا۔ عامل بے عمل، متمرد۔ جزیرہ یعنی عراق سارا عرب قوم سے آباد۔ عرب پر قومی جذبہ سارے جذبات پر مقدم۔ حقیقت فتح شام اور فلسطین کے وقت آشکار ہو گی۔ اس علاقہ پر لشکر کشی سہل ترین نظر آ رہی ہے۔ سیاست یہی چاہتی ہے۔ خلیفہ ثانی کے فتوحات انہی نواح سے شروع ہوتے ہیں، جو سوچا سمجھا تھا وہی ظاہر ہوتا ہے۔ قوت میں اضافہ ہوا، مذہب پھیلا۔ دولت میں توفیر ہوئی

---

[1] بیروں یعنی بیر کی جمع۔ ب ی ر فارسی کنایہ۔ عربی سادہ

Marfat.com

پھر سارے ایران کو بے سپر کرنا دشوار کام نہ تھا۔ یہاں کی ساری دولت اور ثروت آئی۔ بہادر اور متمدن قوم مشرف بہ اسلام ہوئی۔ ایرانی فنون اور ثقافت کے عرب مالک ہوگئے۔ عرض کر چکا ہوں، جو قومیں کرہاً مسلمان ہوتی ہیں، ان پر بھی اسلام کا رنگ اچھا خاصا چڑھ جاتا ہے۔ اس مذہب کی یہ عجیب تاثیر ہے۔ ورنہ جہاں بہ اکراہ تبدیلئ مذہب عمل میں آتی ہے۔ صدیوں بعد قوم اپنے آبائی مذہب کی طرف رجوع کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اس مذہب کے انسانی فطرت کے موافق ہونے کی بنیاد پر ہو۔

بس اب کیا تھا۔ رومۃ الصغریٰ کی باری آگئی ۔ یہ سلطنت ایران سے زیادہ مستحکم تھی۔ بنی فاطمہ کے عہد کے بعد تک اسکی پا برجائی برے بھلے حال ہی سہی اسکا ثبوت ہے۔ اس پر مسلمانوں کے پے درپے حملے جاری ہیں۔ فیصلہ کن جنگ کوئی نہیں ہوتی ۔ یہ اجمال تفصیل کا محتاج ہے۔ مرور ایام ہر بلند کو پست اور ہر پست کو بلند کرتے ہیں۔ رومۃ کی سلطنت باوجود اپنی عظمت و شان کے اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، اس پر بھی سایہ ہما ڈھلا اور بوم شوم کا سایہ پڑا۔ تاج قیصر Praetorian Guards[1] کا کھلونا بن گیا۔ ایک قیصر تخت پر آتا ہے، دوسرا تختہ پر جاتا ہے۔ قسطنطین نے قسطنطنیہ کی بنیاد ڈالی۔ سلطنت شرقی اور غربی حصوں پر منقسم ہوگئی۔ ہنس اور تاتار دو بربری قوموں نے ہنی بال اٹلور کی سرکردگی میں حملہ کیا۔ تخت و تاج قیصر تاراج ہوا۔ رومۃ الصغریٰ کا ادنی مغربی حصہ برقرار رہا۔ بہ انجام کار محمد فاتح قسطنطنیہ کی بھینٹ چڑھا۔ پا برجائی کی وجہ سلطنت نو کا قائم ہونا۔ دین مسیحی کی تبلیغ۔ نو ساختگی سلطنت اور نو آموزی مذہب ہمیشہ طاقت کا باعث ہوتے ہیں۔ حکومت کی عمر میں برکت ہو جاتی ہے۔ اوراق تاریخ ہر عہد میں اسکے گواہ ہیں۔ اس قصہ کو یہیں پر چھوڑئیے۔ اسلامی فتوحات کی کیفیت ملاحظہ ہو :-

جزیرہ اور ایران کی فتح کے بعد فلسطین و شام کی باری آئی۔ خلیفہ ثانی کی سیاست اسکی داعی ہوئی کہ مجاہدین اسلام ادھر کا رخ کریں۔ سیاسی قابلیت قابل داد ہے۔ ان دونوں ملکوں میں عرب قوم آباد ہے۔ یہ قوم مذہب سے زیادہ قومیت کی دلدادہ ہے ہمارا ساتھ دیگی۔ ملک پر انشاء اللہ فتح و نصرت کے پرچم لہرا دینگے۔ واقعات نے رائے کی تصدیق کی۔ یہاں کی عرب رعایا عیسائی تھی اور بادشاہ بھی مسیحی، تاہم اکثر فوج اسلام میں شامل ہوئے۔ اپنے ہم قوم بھائیوں کے دوش بدوش لڑے۔ جن میں اتنی جرأت نہ تھی، جاسوس بنے۔ دم دم کی خبریں پہنچائیں۔ ہر کمزوری کو عیاں کیا۔ آذوقہ فراہم کیا۔ کشور کشائی آسان بنادی۔ یہ حال وہیں تک رہا جہاں تک عرب قوم آباد تھی۔ آگے ملک گیری مدت مدید تک بند رہی۔

قانون منزل من اللہ یہ کہ ذمی سے جزیہ لیا جائے اور مسلم سے زکوٰۃ۔ جزیہ میں حقارت کا پہلو پنہاں حکم کے الفاظ میں بھی اس کا شائبہ۔ یہاں کی رعایا اور راعی قومی بھائی۔ فتوحات میں مددگار، قوت بازو۔ مذہب میں اختلاف سہی، صغار[2] ناقابل برداشت۔ (ابھی تک یہ حالت قائم ہے، انگلستان نے اس سرزمین میں یہودیوں کی آبادی کا بیڑا اٹھایا مسلمان اور عیسائی دونوں برخلاف متحد ہیں) مسئلہ پیش گاہ خلافت میں پیش ہوا۔ دستور صادر ہوا صدقہ یعنی زکوٰۃ لیجائے۔ اجتہاد اس کو کہتے ہیں اور یہ اجتہاد احسن ہے۔ آئندہ زمانہ میں جو اجتہاد ہوئے ان سے خدا کی پناہ۔

---

[1] جیسے ترکی سلطنت میں ینی چری تھے اور عباسیہ میں ممالیک اسی طرح رومۃ الکبریٰ میں یہ فوج تھی، یہ بے حفاظت پر مامور۔ پھر ان لوگوں نے سلطنت پر ایسا قابو پایا کہ جسکو چاہتے قیصر بناتے اور جسکو چاہتے قبرستان میں لے جا سلاتے۔

[2] صغار - ص - غ - الف - ر - بمعنی ذلت - چھوٹا بنانا۔

Marfat.com

نمائندہ اہل غرض نے کئے خواہ ناعاقبت اندیش علماء اور حکام نے۔ تفصیل سے احتراز لازم۔ اندیشہ ہے کہ قلم صدق رقم بے قابو ہو گستاخ نگار نہ ہو جائے۔

فلسطین و شام کی فتح کے بعد مصر کی باری ہے۔ پہلے کچھ بیت المال کا حال بیان ہو جائے۔ خزانہ اُبلنے لگا۔ مخارج کم اور مداخل وافر۔ خلیفہ نے اہل مدینہ کے بیش قرار وظائف مقرر کئے۔ فہرست تیار ہوئی۔ اصول وضع الدا کا بیان طویل۔ اس مختصر میں گنجائش نہیں۔ ایک صحابیٔ رسول اکرم نے پیش گاہ خلافت میں اختلاف کیا، اتراف یعنی مسرفانہ زندگی میں اضافہ ہو گا۔ اہل مدینہ تجارت اور دیگر ذرائع تحصیل معاش ترک کر دینگے۔ آسائش اور آرام کے بندے بن جائیں گے۔ معروض قبول نہیں ہوئی۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ حجاز میں ہر نوزائیدہ بچہ کیلئے رقم مقرر ہوئی۔ غرض سارے مجموعے عرب بیٹھے بھرے ہو گئے۔ دوسری سیاسی تدبیر یہ عمل میں آئی کہ بنی ہاشم کو مدینہ سے باہر مسکن ہونیکی ممانعت ہو گئی۔ خطرہ یہ کہ باہر جا کر خروج کرینگے۔ آیندہ زمانہ میں جو خیال تھا وہی پیش آیا۔ غزوات میں بھی انکی شرکت شاذ۔ گھر میں بیٹھے رہو۔ خدا کا دیا رزق اللے تللے سے کھاؤ اور اللہ اللہ کیا کرو۔

اب مصر کی دلکشا زمین پیش نظر ہے۔ نیل کی خضرت اور سرخاصیت دجلہ اور فرات پر طعنہ زن۔ فراعنہ کے آثار عجوبہ روزگار۔ کتاب اللہ تک میں یہاں کا مذکور۔ آسائش کی زمین فراغت کا آسمان۔ خدا کی زمین پر خدا کی شان کا نمونہ۔ فراعنہ بے سامان کا سامان یہیں کی برکت کا نتیجہ۔ منھ میں پانی نہ بھر آئے تو کیا ہو۔ عمرو بن العاص اس زمین کے چپہ چپہ سے آگاہ۔ فوجی اور سیاسی نشیب و فراز سے واقف، بارگاہ خلافت میں عرض پرداز ہوا۔ ترکتازی کے حکم کا طالب۔ خلیفہ کو پس و پیش ہے۔ قطعی فیصلہ کیلئے مہلت درکار، جلد بازی عاقبت اندیشی کے خلاف، اجازت ہو گئی مگر مشروط۔ تاحکم ثانی اگر سرحد مصر میں داخل ہو جاؤ تو اللہ کا نام لیکر آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ ورنہ وہیں رُک جاؤ۔ پیش قدمی موقوف۔ ابن العاص خلیفہ کا مزاج داں۔ ممانعت کا یقین۔ حکم عدولی ناممکن۔ حیلہ جوئی اس کا شعار، قصہ طویل ہے نظر انداز کرتا ہوں۔ شائقین کتب تواریخ میں ملاحظہ فرمائیں۔

غرض مصر فتح ہو گیا۔ خلیفہ نے اسلامی فتح کی خوشی میں [illegible] کی پرواہ نہیں کی مسامحت سے کام لیا۔ یہ خلیفہ ثانی کی خصلت نہ تھی، انجام اچھا نہ ہوا۔ سرکش۔ سر زور اور حیلہ جو خواہ کیسے ہی سلطنت کیلئے فائدہ بخش ہوں ان کو برسر اقتدار رکھنا احتیاط کے خلاف ہے۔ الانسان مرکبٌ من الخطاء و النسیان۔ باوجود خلیفہ کے حزم کی استمالت کے ابن العاص خوارج کے ساتھ ہو گئے، انکی قوت کے باعث ہوئے۔ مملکت کے دو حصے ہو گئے۔ بستر مرگ پر صاحبزادے سے فرماتے ہیں۔ حکومت کی دلربائی نے بے قابو کر دیا تھا۔

اب اسلامی دنیا میں پر آشوب زمانہ کا آغاز ہوتا ہے۔ بنی امیہ جزو و کل کے مالک ہو جاتے ہیں۔ پانی سر سے گزر جاتا ہے۔ قسم قسم کے مظالم کی اشاعت ہے۔ بدکرداری کا دور ہے۔ جو نفوس قدسی ہیں اور جن پر دنیا غالب نہیں۔ تابعین، تبع تابعین کی صحبت بابرکت سے مستفید، اسلام کی حقیقت سے آگاہ یہ مجبور بکریاں لیکر پہاڑوں اور جنگلوں میں نکل گئے۔ ان پر بسر اوقات کرتے ہیں اور اللہ اللہ میں مصروف ہیں ایسی ضلالت اور گمراہی کے عہد میں ایک ہستی ستارۂ صبح کی مانند درخشاں نظر آتی ہے۔ از یاد رفتہ ماضی کی یاد دلاتی ہے۔ یہ خلیفہ عمر بن عبد العزیز ہے۔ بس ستارۂ صبح ہی تھا، جھلک دکھائی اور غائب ہو گیا۔ مجملاً اس دور پر فتنہ و فساد کا حال بھی گوش گزار کرتا ہوں۔ بہ جبر قلم روک کر لکھ رہا ہوں۔ حُبِ جاہ اجتہاد بیجا کا باعث ہے۔ علماء اور فضلاء تک دنیا کی لپیٹ میں آگئے۔ بعد میں جو آئے انہوں نے بھی انکے کردار سے

---

۵ اتراف ۔ الف ۔ ت ۔ ر ۔ الف ۔ ف ۔ بمعنی خوش حالی۔

آنکھیں بند کرلیں - اجتہاد کی غلطی کی آڑ پکڑی - جب جواب بن نہ آئے تو یہ خوب جواب ہے - ابتک مولوی اور مولوی منش اس جواب کو شافی خیال فرماتے ہیں - البتہ گڑے مردے اکھیڑنے بھی بالغ نظری کے خلاف ہے جو نہ کرنا تھا سو کیا - خلیفہ برحق کے خلاف برسرپیکار ہوئے - قرآن کو بازیچہ طفلاں بنایا - نیزوں پر لگایا! قسمیں کھائیں اور قسمیں توڑیں، ایسے اشخاص کو مسند خلافت پر لا بٹھایا جو زہد و ورع کا تو کیا ذکر معمولی اخلاق سے بھی معرا تھے - ظلم جنکی طینت میں تھا - شراب جنکی گھٹی میں، ہر قسم کی گمراہی ان کو مباح - نہ خدا کا ڈر نہ دنیا کی شرم - محشر کا عالم بپا تھا - سطوت اور جبروت کے سہارے سارے کام چل رہے تھے - ایک امر قابل لحاظ ہے - اس ابتری میں بھی غیر مسلم سلطنتوں کے خلاف پہلی ہی سی پامردی دکھاتے تھے - ورنہ اسلامی حکومت کے پرخچے اڑ جاتے ہمسایہ حکومتیں بھی کچھ کمزور پڑ گئی تھیں - سابقہ اسلامی رعب و داب ان پر غالب تھا غرض مفتوحہ ممالک کو خراب نہ ہونے دیا - نہ ذمی رعایا نے سر اٹھایا - یہ زمانہ بھی ختم ہوا - اور منصور عباسی نے تخت و تاج سنبھالا -

ہارون الرشید کا دور آیا - دور ماسبق سے بدرجہا بہتر - آب و تاب سلطنت وہ کہ آنکھیں خیرہ ہوں - ہیبت اور جبروت کا یہ عالم کہ دشمن تھر تھر کانپیں - علم و ہنر دست بستہ کھڑے ہیں، عیاشی ہے مگر اندازہ کے ساتھ اب اس زمانہ کے بیرونی حالات اور معاملات ملاحظہ ہوں :-

اندلس میں اموی سلطنت قائم ہے، بغداد کے ہمسر علم و ہنر سے آراستہ - ہردم ترقی پر - آپس میں رقابت ہے - رشید ان کو خوارج یعنی خلافت کا باغی تصور کرتا ہے - لہو کے گھونٹ پیتا ہے - بس نہیں چلتا کہ گلا گھونٹ دے - راہ دراز بے آب و گیاہ بیابان درمیان لشکر کشی سے مانع آتے ہیں - دل ہی دل میں کھول کھول کر رہ جاتا ہے - آدمی مغلوب الغضب ہے، درگزر اور رواداری کا طبیعت میں نام و نشان نہیں - دشمن پر قابو پانے کے بعد اسکو نہیں بخشتا - رحم چھو نہیں گیا - سخت سے سخت سزائیں دیتا ہے -

دوسری سلطنت اس زمانہ میں فرانسہ کی ہے - شارلیمان تخت شاہی پر متمکن ہے - اٹلی کی سلطنت پر اس نے قابو پا لیا ہے - ہنگری اور جرمنی اسکے زیر نگین ہیں - یہاں کی بربری اقوام میں مذہب عیسوی کی تبلیغ اس نے کی ہے - اسکی طاقت روز افزوں ہے - مدمقابل قسطنطنیہ کی سلطنت ہے - شارلیمان اس پر برتری کا خواہاں ہے - اسوقت قسطنطنیہ کے تخت پر ملکہ رینی راج رہی ہے - اپنے نابالغ بچہ کے نام پر حکومت کر رہی ہے، پھر حکومت کو غصب کرتی ہے اور مستقل حاکم بن بیٹھتی ہے - اس کے اور رشید کے تعلقات اچھے رہیں، تاہم صوائف (موسم بہار کی جنگیں) جاری ہیں کہ انکی کوئی بڑی اہمیت نہیں - شاہ نقفور ملکہ رینی پر غالب آتا ہے - تخت و تاج پر قابض ہوتا ہے - رشید سے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں، لشکر اسلام خلیفہ بغداد کی سرکردگی میں حملہ آور ہوتا ہے - موسم کا بھی لحاظ نہیں کیا جاتا - سرما میں جنگ ہوتی ہے - نقفور کو شکست اور مسلمانوں کی فتح - نقفور جزیہ قبول کرتا ہے، جب جا کر جان بچتی ہے - شارلیمان رشید سے اچھے تعلقات قائم کرنے چاہتا ہے، سفراء آتے ہیں، ہدایا لاتے ہیں - رشید بھی خیر مقدم کہتا ہے - شارلیمان کے اسمیں کئی مقصد ہیں اول تو یہ کہ خلیفہ مسلمین کو دوست بنا کر نقفور پر سبقت اور برتری حاصل کرے - اسوقت یورپ پر جہل کے بادل چھائے ہیں - روستہ الکبریٰ کی ساری تہذیب اور تمدن کو بربری قوموں کے تسلط نے مٹا دیا ہے - یہ قومیں جنگ جو ہیں اور غارتگر - ان کو سیاست، علم و ہنر اور حکمرانی سے کیا واسطہ - شارلیمان یورپ میں علم کا چراغ روشن کرنا چاہتا ہے - علم و ہنر کا سرچشمہ بغداد ہے یا اندلس - اندلس سے عداوت ہے، حکومتیں پیوستہ ہیں بامنابطہ جنگ تو نہیں، مگر اندلس کے خوارج کی امداد کیجاتی ہے - بس اب علم کی روشنی صرف بغداد سے لیجا سکتی ہے باقی سارے جہاں پر اندھیرا چھایا ہوا ہے، یہ منشا بھی اسی طرح پورا ہوتا ہے کہ خلیفہ بغداد سے اجازت کے

Marfat.com

مراسم جاری کیے جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خلیفہ بغداد کا یہ مطلب کہ شارلیمان کو اپنا بنا کر اندلس کے خلاف کھڑا کریے، اور یوں دل کے بخارات نکالے۔ کامیابی نہیں ہوئی۔ حکومت اندلس بلا قوت تھی، شارلیمان کے قابو سے باہر۔ ہاں خوارج کی امداد ہوتی رہی۔ رشید کے منصوبے پروان نہیں چڑھے۔

ہارون الرشید کا زمانہ خالص عربی سیاست کا زمانہ نہیں۔ یہاں سیاست مشترک ہے۔ جعفر برمکی عجمی النسل، گرد و پیش عجمی جمع۔ سیاست و نظام میں عجمیت کی بو آرہی ہے۔ پھر فضل بن ربیع نے قلمدانِ وزارت سنبھالا۔ خالص عرب۔ لیاقت کے نام صفر۔ دسیسہ کاری کا بادشاہ۔ افسر منہیاں[۱] ہونے کے قابل۔ اسکو برسر عہدہ لانا رشید کی کمزوری، خلیفہ کی سعایت پسندی کی طینت اسکی سربلندی کا باعث ہوئی۔ رشید کے بعد کا زمانہ امین اور مامون کے باہمی جھگڑے فساد کا زمانہ ہے۔ ملک میں اضطراب ہی۔ امین کے قتل پر امن قایم ہوا۔ سارے جھگڑے کی بنیاد فضل بن ربیع کی بدطینتی، ناعاقبت اندیشی۔ اور خود غرضی رشید کی غلطی کا خمیازہ۔

مامون ایرانی ماں کا پوت تخت پر آیا۔ دربار کا رنگ بدل گیا۔ عجمی عنصر غالب آیا۔ سیاست عجمی ہو گئی ہمارا مضمون ختم ہو گیا۔

خواجہ محمد عبدالمجید

ندیم - ماہ نومبر ۱۹۳۲ء

۱؎ منہی - م - ن - ہ - ی - جمع منہیان یہاں لکھی گئی ہے - معنی C.I.D. افسر محکمہ جاسوسی -

Marfat.com

جھوٹی آزادی

از جناب مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، مدیر "الضیاء" (عربی) لکھنؤ

جنگ عظیم میں عربوں کی بغاوت اور اس کے ہولناک نتائج، اخبار بیں طبقہ سے پوشیدہ نہیں، کرنل لارنس اور سر پرسی کاکس، شاطران بساط سیاست کے کارنامے منظر عام پر آچکے ہیں، اور آئے دن اس موضوع پر کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں، ہمارے عرب [بھائی] اسے "جہاد آزادی" سے تعبیر کرتے ہیں، ابھی حال ہی میں "الثورۃ العربیۃ الکبریٰ" کے نام ایک کتاب تین جلدوں میں شائع ہوئی جس میں تمام وثائق اور معاہدے شائع کردئے گئے ہیں۔ اور ابھی پچھلے دنوں، ان عرب نوجوانوں کی یادگار میں، جو جمال پاشا [کے ظ]لم سے تختۂ دار پر لٹکائے گئے تھے، تمام عربی ممالک میں "یوم الشہداء" منایا گیا۔

اردو خواں طبقہ تصویر کے صرف ایک رخ سے واقف ہے۔ اسے صرف یہ معلوم ہے، کہ عربوں نے جنگ عظیم میں ترکوں [کے خ]لاف علم بغاوت بلند کرکے، شعائر دین کی خلاف ورزی کی، اور اسی لئے شریف حسین —— جسے عرب اپنا نجات دہندہ [منق]ذ الامۃ العربیۃ) مانتے ہیں —— اردو اخبارات کے حلقہ میں بری طرح بدنام ہے، لیکن ہندوستان کے [مسلم]ان عموماً اندرونی حالات سے ناواقف ہیں، ہم بھی شریف حسین کو بے گناہ نہیں سمجھتے، اور نہ اس کی بغاوت کو [روا] خیال کرتے ہیں، لیکن بعض اندرونی حالات سے پوری واقفیت کے بعد، یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہیں، کہ عرب اس قدر ملامت [کے مست]حق نہیں، جتنا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔

"آویزش ترک و عرب" ایک مستقل مضمون ہے، اور اس کے لئے ایک مخصوص فرصت درکار ہے، آج کی صحبت میں، ہم [ا]یک جدید کتاب (Shifting Sands) کے ایک باب "جھوٹی آزادی" (False Freedom) کا ترجمہ [پیش کر]نا چاہتے ہیں، جس سے معلوم ہوگا، کہ اثنائے بغاوت میں عرب سپہ سالاروں کے جذبات کیا تھے؟ اور کن خیالات کے ماتحت ترکوں کے خلاف، نبرد آزما ہوئے؟ کتاب کا مصنف میجر ن-ن-ی-برے (Bray) مصر میں انگریزی فوجی افسر تھا۔ اور [عر]بوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ جیسا کہ مضمون سے معلوم ہوگا۔

Marfat.com

اتنی تمہید کے بعد ہم قارئین سے اصل مضمون کے پڑھنے کی درخواست کرتے ہیں کہ مفید اور دلچسپ ثابت ہوگا کہیں کہیں ضروری نوٹ دیدئے گئے ہیں ۔

مسعود عالم ندوی

ایک عرب

۱۹۱۷ء[1]' موسم گرما میں' سر مارک سائکس اور موسیو پیکو ——— جن نے معاہدہ سائکس ۔ پیکو پر حکومت فرانس کی جانب سے دستخط کئے تھے ——— مصر آئے' میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا' اور سر مارک سے درخواست کی' کہ ایک عرب دستہ (Legion) کی تیاری میں اپنے اثر و نفوذ سے ہماری مدد کریں' تاکہ عربوں کی تحریک بغاوت ایک خالص قومی رنگ اختیار کرلے ۔ یہ ممکن تھا کہ گرفتار شدہ عرب فوجیوں اور دوسرے عرب قوم پرستوں کی شرکت سے یہ دستہ جلد از جلد آسانی سے تیار ہو جائے' اور اس کی قیادت انگریز اور فرانسیسی افسروں کے ذمہ کی جائے ۔ ہم نے ان موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ۔ اور سر مارک سے تحریک کی بنیادی کمزوری بیان کی ۔ اور ایک مرکزی محور کی حاجت جتائی' جس کے زیر اثر اس تحریک کا بارآور ہونا ممکن ' ہو ۔ اور امید ظاہر کی' کہ یہ عربی دستہ انگریزی لشکر کے لئے قوت بازو ثابت ہوگا ۔ سر مارک نے میری رائے سے اتفاق کیا' اور ایک عربی دستہ کی تشکیل کا پختہ ارادہ کر لیا ۔

محکمہ حرب نے بھی اس تجویز سے اتفاق کیا اور مال و سلاح سے امداد کا وعدہ کیا گیا ۔ حکومت سوڈان نے اپنے ذمہ وردیوں کا انتظام لیا ۔ میرے سپرد یہ خدمت کی گئی کہ عرب فوجی قیدیوں سے مل کر' انہیں تیار کروں'

حسب تجویز قیدیوں سے ملا' اور افسروں سے اپنا مقصد وضاحت سے بیان کیا ۔ ان کی ایک بڑی تعداد اس مقصد کے لئے تیار ہو گئی' فوراً ان کی رہائی کے احکام صادر ہوئے اور وہ آزاد ہو گئے ۔

افسروں کی کمیٹی

افسروں کی ایک جماعت مشورہ کے لئے منتخب کی گئی ۔ ہم لوگ روزانہ عرب کی تفصیلات پر غور کرنے کے لئے مجتمع ہونے لگے ۔ ہم نے قواعد (Drill) کی عربی کتاب کی ضرورت محسوس کی اب تک عرب فوجیوں کو ترکی زبان میں قواعد کرائی جاتی تھی ۔ ہم نے اس بارے میں' مصر کے علماء و ادباء سے امداد طلب کی اور انھوں نے وضع اصطلاحات میں ہماری خاطر خواہ مدد کی ۔

سائکس ۔ پیکو عہدنامہ

ہمیں آگے چل کر' دوسری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ قید خانہ کی تاریک کوٹھریوں میں' ان عرب افسروں کو آئے دن کے سیاسی انقلابات کی بالکل خبر نہ تھی ۔ آزاد ہونے کے بعد عرب قوم پرستوں سے ملنے جلنے کا موقع ملا ۔ لازمی طور پر سائکس پیکو معاہدہ کی بھنک ان کے کانوں میں پہنچی ۔ اگرچہ وہ اس کی اصلیت اور تفا

---

[1] ۱۶ مئی ۱۹۱۶ء میں انگلستان اور فرانس نے ایک دوسرے خفیہ معاہدہ پر دستخط کئے ۔ جو معاہدہ سائکس ۔ پیکو کے نام سے مشہور ہے ۔ اس معاہدہ کی رو سے ترکی عرب صوبجات کی باقاعدہ تقسیم ان تجاویز کے مطابق ہو گئی ۔ جو سال ماقبل کے اصلی عہد نامہ مورخہ ۵ مارچ ۱۹۱۵ء میں قرار پائی تھیں ۔ سائکس پیکو عہد نامے کی رو سے عراق کا بہت بڑا حصہ برطانیہ کے قبضہ میں اور سا[illegible] تھوڑے سے لے کر اسکندرونہ تک بشمول ارمینیا اور اناطولیہ کوچک' فرانس کے قبضہ میں آیا' فلسطین بین الاقوامی را[illegible] اس کا بندرگاہ حیفا برطانیہ کو ملا ۔ ۔ ۔ ۔ خلاصہ یہ کہ وہ آزادی' جس کا وعدہ سر ہنری میکموہن نے عربوں سے کیا تھا ۔ ہباءً منثورا ہو گئی ۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو (جدید دنیائے اسلام از استاد[illegible]
'م ۔ ع'

Marfat.com

ے بالکل ناواقف تھے۔ پھر بھی اس سے عرب وطن پرستوں کا اضطراب بڑھ گیا، ہمارے پاس انکا ایک وفد آیا، کل سوا
ی تھے۔ مشن بہت اہم تھا۔ ان کے نمائندہ نے اس طرح گفتگو شروع کی :۔

"آپ نے ہم لوگوں کو عربی دستہ میں شریک ہوکر، ترکوں سے لڑنے کا مشورہ دیا، جن کی سپاہ میں کل تک ہم افسر تھے۔ اس طرح پر ہم اپنے کو موت کے منہ میں ڈال رہے ہیں، ہماری عورتیں اور بچے خطرات میں گھرے ہوئے ہیں، ہمارے گھر بار بھی محفوظ نہیں، ہم یہ سب کچھ خوشی خوشی برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں، اگر ہمیں اس کا یقین دلادیا جائے کہ ہم اپنے وطن کی حقیقی آزادی کے لئے جنگ کر رہے ہیں، ورنہ ہمیں اجازت دیجئے کہ پھر قیدخانہ کی تنگ و تاریک کوٹھریوں کا رخ کریں۔ کہ یہ قربانیاں، ہم صرف آزادی ہی کے لئے گوارا کرسکتے ہیں"

ی طور پر، مجھے ان کے رویہ سے پوری ہمدردی تھی، میں نے محسوس کیا، اور اب تک اسی رائے پر قائم ہوں۔ کہ انکا مطالبہ حق بجانب ہے۔ ان بیچاروں سے یہ کوئی توقع نہیں کرسکتا کہ مجوزہ آزادی کے لئے وہ اپنا تن من دھن قربان کردیں۔ مجھے غور و فکر کے لئے مہلت و سکون کی ضرورت تھی، ایک دو روز کے بعد ان سے پھر ملنے کا وعدہ ہوا، اور مجلس ختم ہوگئی۔

نصفانہ غور و فکر یہ غور و تفکر میرے لئے جاں گسل ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ اس سے پوری عربی تحریک کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا، حکومت برطانیہ اور شریف حسین کے درمیان، عربی ممالک کے حدود کے متعلق کتنی ہی غلط فہمی کیوں نہ ہو، مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عربوں نے معرکہ کارزار میں صرف اس لئے حصہ لیا، کہ تمام عربی علاقہ ترکوں کے پنجہ استبداد سے آزاد ہو جائے، عراق ہو یا شام، حجاز ہو یا فلسطین، ہر باشندہ کے دماغ میں ایک آزاد عربی حکومت کا تخیل تھا، یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ عرب، اپنے مستحکم عقیدہ کے مطابق، اپنی آزادی کے لئے لڑ رہے تھے، یقینی وہ کسی غیر ملکی لشکر میں تنخواہ دار سپاہیوں کی حیثیت سے کام نہیں کر رہے تھے۔ پھر وہ اپنے عزیز ملک کو، ایک فرماں روا کے قبضہ سے نکال کر دوسرے فرماں روا کے پنجہ استبداد میں دینے کے لئے، اپنی عزیز جانیں کیوں قربان کریں؟ یہ توقع ان سے کس طرح کی جاسکتی ہے کہ ترکوں کے بعد وہ کسی دوسری طاقت کو اپنی قسمت کا مالک بنانا گوارا کرلیں گے؟

مجھے شام، عراق اور فلسطین کا حشر معلوم تھا؟ پھر انہیں کس طرح تسلی دیتا؟ میں نے ایک سخت خطرہ کا احساس کیا موجودہ حالات میں میرے لئے دشوار تھا کہ اس دشوار مسئلہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھ سکوں،

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے، عربوں کو اس میں مطلق شک نہیں تھا، کہ وہ عربی ممالک کی آزادی کے لئے آگ اور خون سے کھیل رہے ہیں۔ اگرچہ شبہات نے ان کو حقیقت سے قریب تر کردیا تھا، مگر برطانیہ اور حلفاء کے وعدوں پر انہیں اتنا اعتماد تھا کہ شبہات اور افواہوں کے باوجود ان کے اس عقیدہ میں کوئی کمزوری نہیں آنے پائی۔ مجھے یقین تھا کہ جب حقیقت بے نقاب ہوگی

---

۵ ہمیں اپنے عرب دوستوں سے بڑی شکایت ہے، جس کا عربی پریس میں ہم نے بارہا اظہار کیا ہے ۔۔۔ خود شریف حسین کے بارے میں علامہ سید رشید رضا نے لکھا ہے کہ "اسے اپنے خاص وزراء پر بھی اعتماد نہیں تھا۔ گزشتہ دین برطانیہ کے وعدوں کو وعدی زبانی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔"
"(المنار، محرم ۱۳۵۰ھ؛ م۔ع)"

Marfat.com

ارادے اپنی اصلی صورت میں نمایاں ہوں گے، عربوں کے شریفانہ جذبات کو سخت ٹھیس لگے گی، ممکن ہے اس وقت خطرناک ردعمل ہو۔ اور بہرحال ہم لوگ عہد شکنی اور دغابازی کے مجرم قرار پائیں گے

سر مارک سائکس] سر مارک سائکس، کسی مہم سے بحر احمر کی طرف گئے ہوئے تھے، آج ہی ان کی واپسی تھی، میں نے انکے پاس پیغام بھیجا کہ "فوراً ملنا چاہتا ہوں" آدھی رات کو، انکا جواب ملا کہ صبح کو آٹھ بجے وہ ملاقات کے لئے تیار رہیں گے۔ ناشتہ ساتھ ہی ہوگا۔

حسب عادت وہ، بشاش تھا، شریف حسین کی ملاقات کی تفصیلات مزے لے لے کر بیان کرتا رہا۔ اتنے میں یک بہ یک بول اٹھا:۔

"ہاں بتاؤ، کیا مصیبت آپڑی ہے"؟

"اس عربی بٹین کے لئے آپ کسی اور آدمی کا انتظام کیجئے، مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا" یہ سن کر وہ اچھل پڑا جیسے ناگن نے ڈس لیا ہو۔

"ناممکن! ناممکن!! مجھے کوئی دوسرا معاون نہیں مل سکتا۔ آخر تم کیوں معذور ہوگئے"؟

میں نے تفصیل سے تمام حالات بیان کئے، اور آخر میں یہ بھی واضح طور پر کہہ دیا کہ میں ان لوگوں میں شامل نہیں ہونا چاہتا جن پر مستقبل میں بددیانتی کا الزام لگایا جائے۔

گفتگو ذرا تلخ ہوگئی، سر مارک متوحشانہ انداز سے کمرے میں گھومتا رہا، غصہ کی حالت میں یہ اس کی عادت تھی، لیکن سر مارک دیر تک غصہ نہیں رہ سکتا، دفعتہً وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور اسی معصومانہ مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا:۔

"تم بھی عجیب گداگر ہو، بتاؤ، کیا کرنا چاہتے ہو"؟

"میں چاہتا ہوں کہ ان غریب لوگوں سے آپ صاف صاف کہہ دیجئے" میں نے جواب دیا۔

"اچھا تو کیا وہ اپنی آزادی کے لئے جنگ کر رہے ہیں"؟

"اس کے معنی یہ ہوئے، کہ اہل شام، نابلس و بغداد کے باشندے آزاد ہو جائیں گے"!! اب اس کا چہرہ متین ہوگیا اور کچھ دیر تک خاموش رہا۔

"بہت خوب، میں ان لوگوں سے، تمہاری حسب خواہش، صاف صاف کہہ دونگا"

سرکاری بیان } ہم لوگ ناشتہ کے لئے بیٹھ گئے اور عرب افسروں کو طلب کیا گیا اور حلفا کی اصلی نیت کو ظاہر کرکے اس نے پوزیشن بالکل واضح کردی، اس نے ایک بات بہت صاف کہی کہ عربوں کا مستقبل خود ان کے ہاتھ میں ہے، اگر وہ چاہیں، تو آزاد ہو سکتے ہیں"

بحیثیت مجموعی، میں مطمئن ہوگیا، سر مارک سائکس کی پوزیشن بہت پیچیدہ تھی، اسے کوئی بیان دینے کا بالکل اختیار نہ تھا

ا؎ مصنف کا یہ بیان حد درجہ قابل ستائش ہے کہ موجودہ استعمار پرستوں کی ڈکشنری میں دیانت وایفائے عہد کے کوئی معنی نہیں، م۔ع

یہ حکومت برطانیہ کا منصب تھا، وہ سیاسی معاہدوں کو طشت از بام بھی نہیں کر سکتا تھا، بہر حال ممکن حد تک اس نے بہت صاف گفتگو کی اور سچائی سے قریب رہا، میں اور تمام عرب سردار مطمئن ہو گئے۔

(کتاب کے اس ٹکڑے سے یہ بات آئینہ ہو جاتی ہے کہ عرب اپنی فہم کے مطابق 'آزادی وطن' کے لئے جنگ کر رہے تھے، ان پر دو الزام عائد ہوتے ہیں:- ایک ترکوں کے مقابلہ میں غیر مسلم طاقتوں کی اعانت — دوسرے حلفا کے وعدوں پر بیجا اعتماد، ترکوں کے خلاف تلوار اٹھانا کتنا ہی سنگین الزام کیوں نہ ہو، مگر اس کی ذمہ داری بڑی حد تک انجمن اتحاد و ترقی کی مسلم کش اور عرب آزار پالیسی پر عائد ہوتی ہے۔ ہاں البتہ حلفا اور خصوصاً برطانیہ کے ساتھ بیجا حسن ظن کی کوئی وجہ نہیں۔)

نعیم۔ بہار سنہ ۳۵ء

Marfat.com

مقالات

عربوں کے جغرافی معلومات[1]

از جناب صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم اے۔ پروفیسر گورنمنٹ کالج۔ لاہور

عرب عرصۂ دراز سے کتاب جغرافیہ بطلیموس[2] سے واقف تھے اور انہوں نے اس کتاب کے ایسے نسخے دیکھے تھے جو رنگین نقشہ جات پر مشتمل تھے۔ مسعودی[3] جو اس عالم کو غلطی سے شاہانِ مصر کے خاندان بطالمہ[4] میں شمار کرتا ہے یوں رقمطراز[5] ہے۔

"یہ فیلسوف (بطلیموس) اپنی کتاب موسوم بہ "جغرافیہ" میں روئے زمین اور اس کے شہروں، پہاڑوں، سمندروں، جزیروں اور دریاؤں اور منبعوں کا حال بیان کرتا ہے۔ وہ مزروعہ علاقوں اور آباد شہروں کا بھی ذکر کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ اس عہد میں ایسے شہروں کی تعداد ۴۵۲۰ تھی۔ وہ ہر شہر کو اقلیم وار بیان کرتا ہے۔ اس کتاب میں روئے زمین کی پہاڑوں کو سرخ، زرد، سبز وغیرہ رنگوں میں ظاہر کیا گیا ہے اور ان کی تعداد دو سو سے زائد بیان کی جاتی ہے۔ بطلیموس پہاڑوں کی بلندی، معادن اور ان کے قیمتی پتھروں کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس کے بعد مسعودی سمندروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"جغرافیہ[6] میں ان سمندروں کو مختلف رنگوں میں ظاہر کیا ہے جو بحیثیت وسعت و ہیئت ایک دوسرے سے جداگانہ ہیں۔" ان میں سے بعض کی شکل طیلسان کی سی ہے بعض کی شابورہ[7] یا آنت کی اور بعض مثلث ہیں، لیکن چونکہ یہ نام یونانی زبان میں ہیں اس واسطے بعید الفہم ہیں۔"

مسعودی نے سمان سمندروں اور دریاؤں کی اشکال کا ذکر جو اگلے پرانے نقشوں میں دیکھی ہیں، اور جو بالکل ملوہ اور بعض کوفات ہند کی ہیں

---

[1] یہ مضمون فریخ ربانی کی مشہور تصنیف حکمائے اسلام Penseurs del' Islam Carra de Vaux (French) Vol. II. کی دوسری جلد سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب پانچ جلدوں میں ہے۔ مترجم [2] بطلیموس مصر کا باشندہ تھا بعض کے نزدیک یہ یونان میں پیدا ہوا۔ یہ ایک مشہور حساب دان اور ہیئت دان تھا۔ اس نے ایک کتاب "جغرافیہ" بھی لکھی جو اس کی حساب دانی اور ہیئت دانی کا نتیجہ تھی۔ قریباً تیسری صدی عیسوی کے آغاز میں ہوا ہے۔ مترجم [3] ابو الحسن علی ابن حسین بن علی المسعودی نویں صدی عیسوی کے اواخر میں بغداد میں پیدا ہوا۔ اس کی زندگی باکثر سیر و سیاحت میں بسر ہوئی۔ اس نے اصطخر، ملتان، منصورہ، سیلون اور چین تک سفر کیا۔ آخری برس اس نے شام اور مصر میں گذارے۔ مترجم [4] خاندان بطالمہ ۳۲۳ قبل مسیح سے ک قبل مسیح تک مصر میں حکمران رہا۔ اس خاندان کا بانی بطلیموس، سکندر اعظم کے معتمد سپہ سالاروں میں تھا اور مقدونیہ کے امراء میں تھا۔ مترجم [5] مروج الذہب ج ۱ ص ۱۰۳ [6] بطلیموس کی کتاب جغرافیہ کا نام (مترجم) [7] بقول ڈوزی یہ لفظ مشہور بات شبور کے معنوں میں ہے۔ اس کا اطلاق ایک قسم کی مچھلی پر ہوتا ہے۔ ابو الفدا نے اپنے جغرافیہ میں لکھا ہے "والحاب جغرافیا المطلع فی تعریف البحور یقولون یشبہ کالفوارہ وکالشابورہ وکالطیلسان وغیرہ ذالک"۔ غالباً کا شابورہ سے ایسی خلیج کی طرف اشارہ ہے جو خشکی کی طرف زاویہ منفرجہ بناتی ہو اور اس اعتبار سے وہ مچھلی کے مشابہ ہو۔ ایڈیٹر

Marfat.com

واضح طور پر کیا ہے۔ اس میں بعض جگہ بحیرہ روم کی شکل مستطیل کی سی ہے۔ اور دہانۂ نیل مثلث اور دریائے نیل ایک موٹی سیدھی لکیر کی مانند ہے جو منبع کی جانب کئی شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔ ہر شاخ ایک سید ھا خط ہے جو ایک دائرہ سے خروج کرتا ہے۔ بحر محیط کو جو زمین کے گرد احاطہ کئے ہوئے ہے ایک ایسے دائرہ میں ظاہر کیا گیا ہے جو پرکار سے کھینچا گیا ہو۔

مسعودی نے مارینوس صوری کی کتاب کا بھی مطالعہ کیا ہے جو اب شائع ہو چکی ہے۔ وہ خلیفہ مامون الرشید کے عہد کے عربی جغرافیہ نگاروں کی تصنیفات سے بھی واقف تھا اور ان کو تحسین کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"میں نے بہت سی کتابوں میں اقالیم کے نقشے مختلف رنگوں میں دیکھے ہیں۔ اس موضوع پر جو بہترین کتاب میری نظر سے گذری ہے وہ مارینوس کا جغرافیہ ہے۔ اور مامون الرشید کے عہد کے بہت سے ارباب فضل و کمال نے اس نقشہ کی تکمیل میں حصہ لیا تھا۔ اس نقشے میں دنیا، اسکے افلاک، اس کے سیارے، بر اعظم اور سمندر، آباد علاقے اور ویرانے، مختلف اقوام کے ممالک اور شہر دکھائے گئے ہیں۔ موخر الذکر کتاب، بطلیموس مارینوس اور دیگر متقدمین کی کتب جغرافیہ سے جو اس سے پیشتر لکھی جا چکی ہیں حسن و خوبی میں سبقت لے گئی ہے۔ بطلیموس کی کتاب جغرافیہ" کا ترجمہ عربی زبان میں سب سے پہلے ثابت بن قرہ نے کیا (۲۱۱ھ — ۲۸۸ھ) قدیم ترین عربی جغرافیہ نگار جنکی تصنیفات مطالعہ کے لئے موجود ہیں، یعقوبی اور خرداذبہ ہیں۔ مقدم الذکر کو مسلمانوں میں جغرافیہ کا موجد سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ مشاہیر جغرافیہ نگار بالخصوص ادریسی اور ابو الفدا نے اسی کی کتب سے استفادہ کیا ہے، مصنف نے یہ کتاب ۲۷۸ھ میں لکھی۔ وہ ۲۹۲ھ میں زندہ تھا

یعقوبی فطرتاً جغرافیہ داں تھا۔ وہ خود ہی اپنی تصنیف کتاب البلدان کے شروع میں اپنے ابتدائی حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" اوائل شباب سے لیکر اس وقت تک جبکہ دماغ میں تعمق و ذکاوت زیادہ ہو گئی ہے مجھے ممالک کی تاریخ اور ان کے جغرافیائی حالات دریافت کرنیکا بیحد شوق تھا۔ کیونکہ بچپن ہی سے میں نے دور و دراز کے علاقوں کے سفر کئے تھے۔ جب کبھی بھی مجھے کسی دُور کے باشندے سے ملنے کا اتفاق ہوتا تو میں اس سے اسکے وطن کا نام پوچھے بغیر نہ رہ سکتا بعد ازاں میں وہاں کے لوگوں کے حالات دریافت کرتا کہ وہ عرب تھے یا عجمی، ان کی زراعت کیا تھی، وہ اپنے مشروبات کہاں سے حاصل کرتے تھے۔ لباس کا کیا انتظام تھا، وہ کس فرقہ سے متعلق تھا۔ اور انکا حاکم کون تھا۔ پھر میں اسکے ملک کی وسعت کے بارے میں سوال کرتا اور ملحقہ علاقوں اور ممالک کے نام پوچھتا۔ اگر وہ شخص معتبر معلوم ہوتا تو میں اسکے جوابات کو قلمبند کر لیتا، اسی طرح میں مشرق و مغرب کے متعدد باخبر لوگوں سے ایام حج[2] اور دیگر اوقات میں سوالات کرتا۔ اور اخبار و روایات کو لکھتا۔ میں خلفاء اور امراء، ان کے مفتوحہ ممالک اور فوجی نوآبادیوں اور وہاں کے خراج و محصول کے حالات درج کرتا رہا۔ چنانچہ ہر ایک ملک کے متعلق ضروری کوائف جمع کر کے ایک بڑی مدت کے بعد یہ کتاب تیار ہوئی۔

الغرض میں نے ان تمام تحریرات کے متعلق ممالک کی تاریخ کا خلاصہ تیار کر لیا۔ جس طرح فقیہہ اور ادیب فقہ و نحو، لغت اور علم ادب پر مختصرات تیار کرتے ہیں۔ اس کے بعد یعقوبی لکھتا ہے۔ "میرا ارادہ تھا کہ شہروں اور ملکوں کے نام اور انکی آبادیوں اور حاکموں کے علاوہ شہروں کے درمیانی فاصلوں، دور اسلامی میں انکے فاتحین، سال فتح، زمینوں کے خراج، علاقوں کی طبعی حالت یعنی وہ میدانی ہیں یا کوہستانی، بری ہیں یا بحری (ساحلی) ان کی آب و ہوا کی خشکی تری، پانی کے بہاؤ کا رخ اور انکے منابع و مشارب کا بھی ذکر کروں۔

مذکورہ بالا عبارت سے مترشح ہے کہ ہمارے مصنف کے تصور میں علم جغرافیہ کا دائرہ نہایت وسیع تھا۔ وہ پیشتر ہی سے اس علم سے مطلع تھا، جس کو ہمارے معاصرین جغرافیہ انسانی[3] کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس امر کا اندازہ کرنے کے لئے کہ یعقوبی نے اپنے لائحہ عمل کی تکمیل کس طرح کی

---

[1] قصر تستبیہ واالاشراف صفحہ مارینوس، بطلیموس سے کچھ عرصہ پہلے ہوا ہے۔ دوسری صدی عیسوی میں گذرا ہے اور وہ جغرافیہ کا بانی تھا۔ (مترجم!) [2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایام حج میں مسلمانوں کا یہ اجتماع عظیم نہ صرف مذہبی اہمیت رکھتا تھا بلکہ مختلف اسلامی ممالک میں تجارتی و تمدنی تعلقات پیدا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ اصحاب سیر و سیاحت، مورخین و مصنفین ضروری معلومات بہم پہنچانے کے لئے اسے زریں موقعہ تصور کرتے۔ (مترجم)

[3] 'HUMAN GEOGRAPHY.

ہم ذیل میں وہ عبارت درج کرتے ہیں جو اس نے اپنے صوبہ برقہ (افریقہ) اور اس کے متعلقہ ریگستان کے متعلق لکھی ہے۔

"شہر جس کا نام پنٹا پولس تھا اور جس کو عمرو بن عاص نے فتح کیا ایک ایسے وسیع میدان میں واقع ہے جس کی سرزمین گہرے سرخ رنگ کی ہے۔ خلیفہ متوکل کے حکم سے اسکے گرد فصیل کھڑی کر دی گئی اور آہنی دروازے لگائے گئے۔ فصیل کے ساتھ ساتھ خندق کھودی گئی تھی۔ خلفا اور ولاۃ کے حکم کے مطابق بارش کے پانی کو جو پہاڑوں سے چھوٹی چھوٹی ندیوں کی صورت میں بہہ کر آتا تھا ایک بڑے تالاب میں جمع کر لیا جاتا تاکہ لوگوں کے لئے آب خوردنی کا کام دے سکے۔ گرد و نواح کے شہر اور خاص برقہ میں قدیم جند کی اولاد اور دیگر لوگ آباد ہیں۔ اس علاقہ سے متعلق دو بندرگاہ ہیں۔ "اجیبہ" اور "طلمئویہ" اجیبہ چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہاں ایک عظیم الشان عبادتخانہ ہوٹل اور فارم ہیں۔ شہر کے گرد باغات، خیابان اور مرغزار ہیں۔ دوسری بندرگاہ طلمویہ کے قریب سال کے صرف خاص خاص موسموں میں جہاز رانی ہو سکتی ہے۔ اس علاقہ میں خراج اراضی خلیفہ ہارون الرشید کے قائم کردہ قوانین کے مطابق جمع کیا جاتا ہے۔ اس خلیفہ نے اپنے مولی بلطار کو بھیجا کہ تمام علاقے کی زمینوں پر چوبیس ہزار دینار لگائے جو بصورت رسدی لوگوں سے وصول کئے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ پندرہ ہزار دینار عشر زکوٰۃ اور جزیہ کے مدات سے وصول ہوتے تھے۔ اس رقم میں کبھی اضافہ ہوتا اور کبھی کمی واقع ہو جاتی تھی۔"

یعقوبی ایک سنجیدہ اور متین مصنف ہے۔ وہ اپنے معاصر خردادبہ اور دیگر مشرقی اصحاب جغرافیہ کی طرح بعید از عقل افسانوں اور حکایتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ تاہم ہم دیکھتے ہیں کہ شہروں کے درمیانی پیمائش میں ابن خرداذبہ اس سے زیادہ صحیح ہے۔ یعقوبی فاصلوں کو منزلوں کے حساب سے اور ابن خرداذبہ میلوں کے حساب سے ظاہر کرتا ہے۔

ابن خرداذبہ ایک زردشتی نو مسلم کی اولاد سے تھا۔ وہ صوبہ جبال میں محکمہ برید واحتساب کا افسر اعلےٰ تھا۔ بعد میں خلیفہ معتمد کا مقرب ہو گیا۔ ہم اس کی نہایت عمدہ تصنیف "المسالک والممالک" کے لئے اس کے ممنون ہیں جو اس نے ۲۳۲ھ اور ۲۳۳ھ کے درمیان لکھی۔ اور جس میں مقامات کے درمیانی فاصلے، ان کے محاصل، خاص کر دجلہ اور فرات کے درمیانی اضلاع کے خراج کی تفصیل درج ہے۔ ہم اسکا ذکر کسی اور جگہ بحیثیت ماہر موسیقی کے کریں گے۔

ندیم۔ نومبر ۱۹۳۹ء

۲

قدامہ پہلے عیسائی تھا بعد میں مسلمان ہو گیا۔ اس کی تصنیف حساب کتاب یعنی بہی کھاتے کے متعلق ہے۔ یہ رسالہ کاتبوں کے لئے دستور العمل کا کام دیتا ہے۔ اسکا عنوان کتاب الخراج ہی ہے۔ اس میں سرکاری دفاتر اور نظام حکومت کے متعلق بہت سی معلومات ہیں اور ڈاک کے راستوں کی تفصیلات درج ہیں۔ اس کتاب کا سنہ تصنیف ۲۶۶ھ مطابق ۸۸۰ء ہے وہ ۳۲۰ھ (۹۳۲ء) میں فوت ہوا۔

الجیہانی ۲۷۹ھ اور ۲۹۵ھ کے درمیان سامانیوں کا وزیر تھا۔ اس نے بہت سی معلومات خصوصاً دریائے سندھ کے متعلق ہم پہنچائی ہیں۔ بلاشبہ یہ بات ان ممالک کو فتح کرنے کے خیال کو ظاہر کرتی ہے۔ اسکی کتاب جو اب ضائع ہو چکی ہے ابن الفقیہ نے از سر نو مختصر طور پر ترتیب دی ہے۔

اصطخری نے تقریباً ۳۴۰ھ میں کتاب الاقالیم تصنیف کی جس میں ہر ایک ملک کے لئے ایک علیحدہ باب مخصوص ہے۔ اور ہر باب میں ایک رنگین نقشہ دیا گیا ہے۔ اس کتاب کو ۱۸۳۹ء میں ایچ مارٹنے ڈیوک آف میکسی گوتھا کے کتبخانہ کے ایک قلمی نسخہ سے نقل کر کے شایع کیا۔ اسکا نقشہ بھی جو بہت سیدھا سادہ ہے۔ لیتھو گرافی کے ذریعہ نہایت صحت کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔ ابن حوقل نے ابن خرداذبہ، قدامہ اور جیہانی کی تصنیفات کے مطالعہ کے بعد ۳۳۱ھ میں دنیائے اسلام کا سفر شروع کیا۔ دریائے سندھ کی وادی میں اس کی ملاقات اصطخری سے ہوئی، اصطخری نے اپنی کتاب اسے دی۔ ابن حوقل نے اس میں کچھ اصلاح کی۔ اسکی اپنی ایک تصنیف (المسالک والممالک) ہے جس کی بنیاد اصطخری کی کتاب پر ہے۔ یہ کتاب ۳۶۶ھ میں ختم ہوئی۔ اس میں ہر ایک ملک کا نقشہ دیا ہوا ہے۔ ان دونوں جغرافیہ نگاروں

Marfat.com

کی کتابیں نہایت مقبول ہوئیں۔ مہلبی نے دسویں صدی عیسوی کے آخر میں ایک کتاب علم جغرافیہ پر فاطمی خلیفہ عزیز باللہ شاہ مصر کے لئے لکھی۔ بکری بھی خاصہ معروف مصنف ہے۔ اسکی زندگی اشبیلیا میں شاہان آل عباد کے دربار میں اور بعد ازاں المریہ میں بسر ہوئی جہاں وہ عہدۂ وزارت پر متمکن تھا۔ اس نے بھی ایک کتاب المسالک والممالک کے نام سے لکھی ہے جس میں ہسپانیہ اور مغرب کے حالات نہایت توضیح کے ساتھ درج کئے ہیں۔ اس کا سنہ وفات ٤٨٧ھ ہے۔

(۲)

ابو عبداللہ محمد ادریسی عرب کا ممتاز ترین جغرافیہ نگار نہیں لیکن جب علمی دنیا میں مشرقی علم جغرافیہ کا ذکر آئے تو ابوالفدا کے نام کے ساتھ اس کا نام بھی ذہن میں آتا ہے۔ اسکی کتاب بلا شک و شبہ ایک نہایت مفید تصنیف ہے رینو[1] لکھتا ہے مجموعی حیثیت سے یہ کتاب سترابو[2] کی کتاب کی طرح فن جغرافیہ کی ایک حقیقی یادگار ہے۔ اس کا ایک حصہ ابتدا ہی میں چھپ گیا تھا جس کو میرونائٹ جبریل سیونیتا[3] اور جون ہزرونیٹ[4] نے ترجمہ کیا جو دربار شاہی کے عربی اور سریانی زبانوں کے مترجم تھے۔ ان دونوں ایڈیشنوں میں کتاب کا عنوان جغرافیہ نوبی انسس[5] لاطینی زبان میں ہے۔ اس کتاب کو شائع کرنے والے عربی مصنف کا نام نہ پڑھ سکے۔ ادریسی کی تصنیف کو مکمل صورت میں ژوبیر[6] نے فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ لیکن یہ ترجمہ قابل اصلاح ہے[7]۔

ادریسی جس کو عرب والوں نے شریف کا لقب دیا ہے۔ ادریسیوں کے اس علوی خاندان سے تھا جس کی ایک شاخ مراکو میں حکمراں رہی۔ وہ مقام سبتہ میں ٤٩٣ھ میں پیدا ہوا جہاں اس کے والدین جا کر آباد ہوئے تھے۔ اس نے پہلے قرطبہ میں تعلیم پائی۔ جوانی میں بہت سے سفر کئے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ "میں نے لزبن، اندلس کی کانوں، مراکو اور قسطنطنیہ کو بھی دیکھا ہے"۔ وہ فرانس اور انگلینڈ کے سواحل تک پہنچا تھا۔ اگرچہ وہ ان ممالک کے حالات صحیح نہیں بیان کرتا۔ ادریسی ایک عبارت میں جسکو ابوالفدا نے نقل کیا ہے۔ یوں بیان کرتا ہے:۔

"ہم نے اپنی آنکھوں سے بحر ظلمات کے مد و جزر کو دیکھا ہے۔ بحر محیط کے اس حصے میں جو ہسپانیہ اور برطانیہ کے مغرب میں واقع ہے سمندر کا پانی دن کے تیسرے گھنٹے سے چڑھنا شروع ہوتا ہے اور نویں گھنٹے کے آخر تک چڑھتا رہتا ہے۔ پھر جو گھنٹوں تک چڑھتا اور علیٰ ہذا القیاس اترتا رہتا ہے۔ چاند کی تیرھویں، چودھویں، پندرھویں اور سولھویں راتوں میں اس مد و جزر کا زیادہ زور ہوتا ہے۔ ان راتوں میں پانی معمول سے زیادہ چڑھتا ہے اور دیگر اوقات کی نسبت اس کا درجہ بلندی زیادہ ہوتا ہے۔ اس واقعہ کو مغربی سواحل کے باشندے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں"۔ مشرق میں ادریسی نے ایشیائے کوچک تک سفر کیا تھا۔

ہمارا جغرافیہ نگار صقلیہ کے نارمن بادشاہ روجر دوم کے دربار میں ٥٤٨ھ میں تھا۔ الصفدی تذکرہ نگار لکھتا ہے کہ یہ بادشاہ فلسفیانہ علوم کا بہت شائق تھا۔ اس نے ادریسی کو افریقہ سے بلا کر یہ کام اس کے سپرد کیا کہ ایک ایسی چیز بنائے جو ہیئت ارض کا نمونہ ہو۔ ادریسی نے چاندی کی کچھ مقدار طلب کی۔ بادشاہ نے چار لاکھ درہم کے ہم وزن ایک ٹکڑا اسے دیا۔ ادریسی نے اس دھات سے متعدد دائرے بطور کرۂ سادی تیار کئے۔ اور ساتھ ہی ایک ترس یا مسطح یا مدور تیار کی جو وزن میں ٤٥٠ رومن پونڈ (جس کا وزن ۱۱۲ ڈرام کے برابر ہے) تھی۔ پھر خواہش کی کہ ایک ایسی کتاب تصنیف کی جائے جس میں سطح مدور کی تشریح اور توضیح اداروں کا پورا پورا بیان ہو۔ اس سوانح نگار کا خیال ہے کہ بادشاہ نے مختلف ممالک میں کارندے اس غرض سے بھیجے کہ وہاں جا کر ان علاقوں کے جغرافیائی حالات لکھیں۔ اور جو قابل ذکر واقعات ان کی نظر سے گذریں ان کی تفصیل بیان کریں۔ ادریسی کی کتاب کی بنیاد انہیں بیانات

---

[1] دیباچہ Renaud

[2] Stralon

[3] Maronites Gabriel Sionita

[4] Joannes Hesronita

[5] Geographia nubiensis

[6] Jombert

[7] یہ ترجمہ پیرس کی انجمن جغرافیہ کی مطبوعات کی پانچویں اور چھٹی جلد پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

پر ہے۔ اس نے اس کتاب کا نام نزہتہ المشتاق رکھا ہے۔ اس کا دوسرا نام روجری بھی ہے یعنی منسوب بہ روجر۔

یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ چونکہ صقلیہ کی بندرگاہوں میں مسافروں کی کثرت ہوا کرتی تھی۔ ادریسی کو مسافروں، سوداگروں، حاجیوں اور دوسرے آنے جانے والوں کی زبانی بہت سے حالات دستیاب ہوئے ہونگے۔ اور چونکہ وہ ایک عیسائی بادشاہ کے دربار میں تھا۔ عیسائی ممالک مثلاً اٹلی، فرانس، جرمنی وغیرہ کے حالات ان سے دریافت کرنے میں بہت آسانی ہوگئی ہوگی جو پہلے عربی جغرافیہ نگاروں کی کتابوں میں نہیں ملتے۔ اسکو سکنڈینیویا یا جزہ نامی سویڈن ناروے تک کے حالات معلوم تھے۔ جن کے متعلق قدما کا خیال مبہم تھا۔ اسیطرح اس نے افریقہ کے اندرونی علاقوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائے لیکن پھر بھی ایک قدیم غلطی پر اضافہ کرتے ہوئے اس نے براعظم افریقہ کو خط استوا کے نیچے مشرق کی جانب اس طرح بڑھا دیا کہ بحر ہند جنوب میں تنگ ہو کر دوسرا بحیرۂ روم بن گیا ہے۔ ادریسی کی کتاب میں بہت سے نقشے بھی ہیں لیکن وہ بہت ناقص ہیں[1]۔

ابوالفدا کی تصنیف تقویم البلدان فن جغرافیہ میں عرصہ دراز سے مشہور ہے۔ اور مغرب میں اس نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ رینو لکھتا ہے کہ اس کتاب کا ترجمہ شکرڈ[2] نے سترھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف میں کیا جو شائع نہ ہو سکا۔ جے گریوی[3] اس نے چند سال بعد (لندن ۱۶۵۰ء) اس کے چند اقتباسات خوارزم اور ماوراءالنہر کے متعلق میں شائع کئے۔

اس کا مکمل ترجمہ جو ۱۷۲۶ء میں ہوا تھا رسکی[4] نے لیڈن میں ۱۷۷۱ء میں بُشنگ کے سلسلۂ کتب میں شائع کیا۔ ایف ڈی مکیلس[5] نے اس کا کچھ حصہ متعلقہ مصر مع اس کے لاطینی ترجمہ کے شائع کیا۔ (گوٹنجن ۱۷۷۶ء) ایکورن[6] نے اسی جگہ افریقہ کا جزو شائع کیا۔ سولوا[7] نے ۱۸۳۹ء میں جزء المغرب کا ترجمہ الجزائر میں شائع کیا اور بالآخر رینو اور دی سلان[8] نے مکمل متن عربی اور آدھی کتاب کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا (پیرس ۱۸۴۰ء) جنہیں لا فیچ غیار نے کتاب کو ۱۸۸۳ء میں مکمل کر دیا۔ ان تین صدیوں میں جو توجہ اس کتاب کی طرف کی گئی ہے وہ اس کی اہمیت کا کافی ثبوت ہے۔ رینو لکھتا ہے "ان چند تنقیحات سے ادریسی کی کتاب کی طرح ابوالفداء کی کتاب جغرافیہ کی قدر و قیمت بحیثیت فن جغرافیہ کی بہترین کتاب ہونے کے کم نہیں ہو سکتی۔ یورپ نے عہد وسطیٰ میں کوئی ایسی کتاب تصنیف نہیں کی جسے ابوالفدا کی کتاب کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکے۔ ابوالفداء کے معلومات بالخصوص شام اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں کے متعلق بالکل جدید ہیں۔ باقی علاقوں کے حالات وہ اپنے پیشرو جغرافیہ نگاروں

ادریسی ابن حوقل اصطخری سے استفادہ کرتا ہے۔ وہ ابن سعید کی کتاب اور قانون البیرونی سے بھی مستفیض ہوتا ہے۔ اور عموماً بطلیموس کا اتباع کرتا ہے۔

ندیم۔ دسمبر ۳۶ء

---

[1] نقشہ حال ہی میں بڑی تقطیع پر جرمنی میں شائع ہوا ہے۔ اسکو دیواری نقشوں کی طرح استعمال کیا جا سکتا ہے۔ [2] Schickara
[3] J. Graviius [4] Reiske [5] J.D. Michaelis [6] Eichhorn
[7] Solvet [8] De Slane

سید اختر حسن (کاکوی)

مغربی تمدن کا اثر اسلامی ممالک پر

قسطنطنیہ کی حالت بھی بجنسہ روم اور پاری کی ہے جہاں تغیر و تبدل ذرا مشکل ہی سے ظہور میں آتا ہے۔ زمانہ کی دستبرد اور امتداد کا بھی، پیر کوئی ایسا بین اور نمایاں اثر نہیں ہوتا۔ جدید انسانی عناصر کا سیلاب بھی جو اس شہر کی تنگ و تیرہ گلیوں اور کوچہ و بازار میں رواں دواں نظر آتا ہے' اس کی کایا پلٹنے میں کچھ زیادہ ممد و معاون نہ ہو سکا۔ بڑی وجہ اسکی اس شہر کے سحر آگیں اور دلفریب نواح و مضافات ہیں۔ سمندر، پہاڑ، ساحل و وادی اور سنہری کہر آلود فضا ان سب چیزوں نے ملکر طلسم ہوشربا کا کام کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اس خطہ کی فضا ہی کچھ ایسی دل آویز اور مسحور کن ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ صانع ازلی ہمہ دم مصروف بہ صناعی ہے اور اسکو فردوس بر روئے زمین بنائے ہوئے ہے۔ شاخ زریں سے یہ ابھی تک ویسا ہی دکھائی دیتا ہے جیسا کہ سلطان عبدالحمید کے وقت میں تھا۔ جب انسان اس شہر کے کوچہ و بازار میں گشت لگاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ سارے شہر میں ایک جدید روح کارفرما ہے۔

قسطنطنیہ مغربی وضع و تراش اور فیشن نے آخرالامر استنبول پر بھی اپنا اثر ڈال ہی چھوڑا۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ ترکوں نے مغرب کی کورانہ تقلید کی ہے بلکہ انھوں نے اپنے مخصوص ذوق کے مطابق مغربی چیزوں کو اپنا لیا ہے۔ ترکی ٹوپی اور آرام دہ مغربی پاجاموں کی جگہ ڈھیلے ڈھالے سوٹ اور ٹاپ ڈرلین وضع کی ہیٹ نے لے لی ہے۔ ان ہیٹوں کا گھیرا تنگ ہوتا ہے اور پتلون کی مہریاں آکسفورڈ وضع کے پتلون کی مہریوں سے بھی زیادہ چوڑی ہوتی ہیں۔ عورتیں بھی اب لندن اور نیویارک کی عورتوں کی طرح آزاد اور مختار ہیں۔ یہ شاہراہوں پر مغربی لباس میں ملبوس جو غالباً رُو۔ ڈلا۔ پے (Rue-de-la-Paix) کی جدید ایجاد ہے، چہل قدمی کرتی نظر آتی ہیں۔ گویا ابھی تک مغربی وضع کی اونچی ایڑیوں کے جوتوں کی عادی نہیں ہوئی ہیں تاہم وہ انکا استعمال ضرور کر رہی ہیں اور ان کی عادت میں روز بروز تدریجی اضافہ ہو رہا ہے۔ مغربی وضع کی ٹوپیاں بھی انھوں نے ابھی تک زیب سر نہیں کیا ہے۔ ان کے سروں پر ایک قسم کی جالیدار اوڑھنی ہوتی ہے جو سر اور مونڈھوں کو ڈھانکے رہتی ہے۔ قدیم یاشمک کی طرح یہ اوڑھنی چہروں کو اچھی طرح نہیں چھپا سکتی۔ آفتاب حسن ان ہلکی بدلیوں میں سے ضیا پاشیاں کرتا نظر آتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ذہنی اور لباسی تغیر کے سوائے فن معماری کا کوئی ایسا تغیر استنبول میں رونما نہیں ہوا ہے۔ پھر بھی واقعہ یہ ہے کہ یہ شہر یورپ کا حسین ترین شہر بن گیا ہے۔ مغرب نے مشرق کی اس فضا پر اپنا اثر خوب ڈالا ہے۔ ان چیزوں کو جانے دیجئے، میں یہ پوچھتا ہوں کہ کیا قسطنطنیہ کبھی بھی حقیقی معنوں میں مشرق کا حقیقی نمونہ رہا ہے؟

انگورہ جب انسان خاص ترکی یعنی انگورہ اور اناطولیہ میں داخل ہوتا ہے تو باشندوں کے اطوار

Marfat.com

وعادات اور حرکات و سکنات میں بہت بڑا فرق رونما پاتا ہے وجہ یہ ہے کہ جنگ عظیم سے قبل جو اطوار وعادات ان باشندوں کے تھے وہ اب باقی نہیں رہے ہیں۔ قدیم سکون و جمود جاتا رہا ہے۔ طبقۂ امراء نے بھی اپنی بوسیدہ خیالی او دقیانوسی ذہنیت کے باوجود غازی مصطفےٰ کمال کے جدید فلسفہ سیاسیات کا سبق پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ مذہب کی جگہ آزاد خیالی نے لے لی ہے۔ مادیت پرستی کا زور ہے۔ تدبیر کو تقدیر پر فوقیت دی جاتی ہے۔ بہرکیف دونوں کا نتیجہ واحد ہے۔ جو چیز فی الوقت قابل لحاظ ہے وہ یہ ہے کہ لوگوں کی عام اخلاقی حالت کسی ضابطہ اور قانون کی تابع نہیں ہیں۔ غالباً ترکی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ لوگوں کو اس درجہ اخلاقی آزادی حاصل ہوئی ہے۔

شام کی حالت بالکل جداگانہ ہے۔ اسکی مثال بجنسہ فاسٹ (Faust) کی ہے۔ جس نے دور حاضرہ کی لذات کی خاطر اپنی روح تک کو بیچ کر ڈالا ہے معلوم ہوتا ہے کہ شدید مذہبی جکڑ بند اور ناگوار پابندیوں سے یک بہ یک رہائی حاصل کرکے لوگ ہمہ تن ہوٹلوں اور رقص خانوں کی عیش و عشرت اور لطف وعظ میں مصروف ہو گئے ہیں۔

میں نے انگورہ میں نا بے نقاب عورتوں کو دکانوں میں کام کرتے دیکھا۔ یہ عورتیں ایسی سلیم الطبع اور با اخلاق تھیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ عہد وکٹوریہ کی نسوانی ہستیوں کی زندہ تصویریں ہیں۔ تم ان کو گھوڑ دوڑ دیکھنے جاتے تو ضرور دیکھو گے لیکن جوا بازی میں یہ کوئی حصہ نہیں لیتیں۔ شاہراہ غازی پر جو ابھی حال میں تیار ہوئی ہے عورتوں اور مردوں کا جمگھٹ برابر مصطفےٰ کمال پاشا کے مجسمہ کے نیچے کھڑا نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کے شوق نظارہ کو سڑک کی گرد و غبار تک بھی ٹھنڈا نہیں کر سکتیں۔

مشغلہ ان لوگوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ کام کا سلسلہ کبھی ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔ ہتھوڑوں پھاوڑوں اور سیمنٹ کی مشینوں کی لامتناہی آواز کا سلسلہ ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ ترک اپنے جدید دارالسلطنت کو نہایت ہی قلیل مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا دینا چاہتے ہیں نفس الامر یہ ہے کہ انگورہ مشرق و مغرب کا نہایت ہی عجوبہ سنگم ہے۔

جب میں اس ملک کے اندرونی جنوبی حصے میں داخل ہوا تو میں نے قدیم ترکوں کو انکی روایات قدیمہ پر عمل پایا۔ ان میں انکی قدیمی شوکت و حشمت اور شان و شکوہ اب تک موجود ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ جدید قانون کی رو سے انکو مجبوراً ترکی ٹوپیوں کو خیرباد کہنا پڑا ہے اور انگریزی لباس زیب تن کرنا پڑا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ حکومت کے قانون کی اتباع انہوں نے بجبر و اکراہ محض اوپری دل سے کی ہے۔

ایشیائی ترکی کی مثال بجنسہ کونیا (Conia) کے قدیم و جدید شہر کی ہے جس کا قدیم نام آئکونیم (Ene-conium) تھا۔ یہ ملک وسط اناطولیہ اور قدیم و جدید ٹورس پہاڑوں کی جائے انفصال کے درمیان واقع ہے اور بالکل الگ تھلگ اپنی ایک جداگانہ نوعیت رکھتا ہے۔ یہ سارا خطہ نظر فریب باغیچوں اور کھیتوں سے بھرا پڑا ہے۔ گویا کاشتکاری کا مرکز ہے۔ اگر اسکو قدیم ترکی کا قلب کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ غازی مصطفےٰ کمال صدر جمہوریہ ترکیہ کا مجسمہ بھی اس جگہ ہے۔ یہاں کے بازار دوکانوں اور بیل گاڑیوں سے پٹے نظر آتے ہیں۔ جدید تعمیر شدہ رہائش مکانات سیکڑوں نئی نئی سڑکیں۔ ناتمکل زراعتی میوزیم، ممبرس ٹریننگ کالج، بنک عثمانی اور دفاتر سرکاری کی عمارتیں سب اس حصہ میں واقع ہیں۔ مسجد عزیز الدین اور مذہب اسلام کے جلیل القدر

Marfat.com

صوفی حضرت جلال الدین رومی علیہ الرحمہ کا مزار بھی یہیں واقع ہے۔ اس مزار کے زینے سونے کے ہیں اور اس پر غلاف اطلس کا ہے۔ یہاں صوفیائے کرام اب تک حال و قال میں نظر آتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس حصہ پر ابھی تک حقیقی ترکی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ سب سے زیادہ تعجب خیز تو یہ ہے کہ طبقۂ نسواں نے اس قدامت پرست حصہ میں ترکی کا یوم آزادی سڑکوں پر بے نقاب گشت لگا کر منایا۔

مشاہیر پرستی باعث جدال و قتال ہے یا موجب صلح و امن مجھے اس سے بحث نہیں۔ میں نے اس چیز کا جو زبردست نظارہ انگورہ میں کیا وہ حقیقتاً مصطفےٰ کمال پاشا سے لوگوں کی غیر معمولی محبت و الفت کا ایک بدیہی ثبوت ہے۔ ایک روز صبح کی خاموشی میں میں پیدل پہاڑی پر چڑھا اور ٹہلتا ہوا صدر جمہوریہ ترکیہ کے مکان کے دروازہ پر جا پہنچا جو ایک ٹیلے پر واقع ہے۔ مسلح سنتری پہرہ دے رہے تھے۔ میں بیٹھ گیا اور ان سے گپ شپ کرنے لگا۔ میں ان لوگوں سے محو گفتگو ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک برقی رو ان کے جسموں سے مس کر گئی۔ سارے کے سارے فوجی دم بخود کھڑے ہو گئے۔ اور مجسمہ نظر آنے لگے۔ میری نظر یک بیک صدر جمہوریہ کے مکان کی دہلیز پر پڑی کیا دیکھتا ہوں کہ مصطفےٰ کمال پاشا انگریزی وضع کی ایک بلند ٹوپی ہاتھ میں لئے خیالات میں محو تخمینہ گیا وہ چہل قدمی فرما رہے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی میں وہاں سے چلتا بنا اور ایک سایہ دار درخت کے نیچے آکر ٹھہر گیا جہاں سے میں انکو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ غازی موصوف دس پندرہ منٹ تک اس طرح بحر تفکر میں غلطاں و پیچاں چہل قدمی فرماتے رہے، سورج کی ہلکی ہلکی شعاعیں ان کے چہرے پر رقص کناں تھیں۔ اتنے میں ترک مزارعین کی ایک جماعت دروازہ پر آ پہنچی۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ایک ٹوکرا تھا جس میں دور سے مجھ کو پھل جیسی کچھ چیز نظر آئی۔ سپاہی اپنی سنگین رائفلیں لے کر راستہ میں حایل ہو گئے ورنہ یہ دہقانی اندر جا پہنچتے۔ ان دہقانیوں نے سنتریوں سے رد و قدح شروع کر دی۔ اور راستہ دینے پر اصرار کرنے لگے۔ سنتری ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تو تو میں میں کی نوبت آ پہنچی اور مصطفےٰ کمال پاشا چونک پڑے۔ انہوں نے سنتریوں کی طرف دیکھا اور انکو اشارہ کر کے دروازہ کا رخ کیا۔

غازی پاشا کے چہرے پر تبسم کھیل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میری بھی ہمت بندھی اور میں قریب آ پہنچا۔ آہ! انسانی ڈرامہ کا یہ سین کتنا زبردست سین تھا۔ جب ان غریب کاشتکاروں کی نظر جن کے سروں پر کپڑے کی ٹوپیاں اور پاؤں میں شلواریں تھیں اپنے محبوب پر پڑی تو سب پر کچھ دیر تک سکتہ کا عالم طاری رہا۔ چند لمحہ بعد یہ ڈرتے اور کانپتے ہوئے ہاتھوں میں اپنی ٹوپیوں کو بھینچتے ہوئے صدر کی جانب بڑھے اور پھل کی ٹوکری ان کے قدموں کے پاس رکھدی۔ غازی موصوف سے گفتگو کرنے وقت ان کی زبانیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی مافوق الفطرت ہستی کے جاہ و جلال نے انکو دم بخود اور حواس باختہ کر دیا ہے۔ غازی پاشا ان کے بیچ میں شاداں و فرحاں کھڑے تھے۔ ایک بڈھے کی آنکھوں سے میوے کی یہ حقیر نذر پیش کرتے وقت آنسو ٹپک پڑے۔ اس چیز کا ظہور صرف مشرق ہی میں ہو سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مشاہیر پرستی اس درجہ کو پہنچکر اپنی آخری منزل کو پہنچ گئی ہے۔

شام

ارض شام میں پہنچ کر انسان اپنے آپکو نہ تو یورپ میں پاتا ہے اور نہ ایشیا ہی میں۔ کیا یہی وہ جگہ ہے جہاں تہذیب مشرق کی گود میں جنم لینا چاہتا ہے۔ ترکوں اور فرانسیسیوں کی نزاعی سرحد سے گذر کر ریل گاڑی حلب کی پہاڑیوں کے دامن

کی سبز بیلوں والی وادی کو طے کرتی ہوئی اس قدیم شہر کے
قدیم قلعہ کے قریب پہنچتی ہے جس کا نام حلب ہے۔ اس شہر
کی گزشتہ عظمت و شوکت اور سطوت و جبروت اب
محض افسانہ ہی افسانہ ہے۔

حلب سے ٹرین مروس چند انقطاعِ سلسلہ
کے بعد بیروت پہنچتی ہے۔ راستہ میں اعلیٰ اور دلفریب
مناظر نظر آتے ہیں۔ بومراد اور بالا عظیم الشان پن چکی بعلبک
کے خوبصورت کھنڈرات رات کے وقت درختوں کی بڑی
بڑی تناور جڑیں یہ ایسے نظارے ہیں جنکو چند ہی اصحاب
یورپ میں دیکھ سکتے ہیں۔ خاصکر جب بہت رات گئے ریل
گاڑی پھک پھک کرتی ان پہاڑوں سے گزرتی ہے جنکی
آغوش میں بیروت واقع ہے تو شہر کی روشنی معلوم ہوتا
ہے کہ پرستان کی شمعیں ہیں جو رات کی سیاہ قبا میں ہیرے
اور جواہرات کی طرح جگمگا رہی ہیں۔ جب ریل گاڑی بل کھاتی
اور پہاڑیوں کے گرد چکر لگاتی ہے تو یہ شمعیں کبھی نظر سے اوجھل
ہو جاتی ہیں اور کبھی سامنے آجاتی ہیں۔ ہلال اپنی تیغِ کج
لئے فضائے آسمان میں بادلوں کی گردن ناپنے میں منہمک
نظر آتا ہے۔ اسوقت کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ راستہ
کے مصائب و آلام اشیائے احتیاج کی عدم میسری وغیرہ
ان سب چیزوں کو انسان اس جنتِ نگاہ کے آگے بھول
بیٹھتا ہے۔ گاڑی کے ڈبوں کو نہ تو مصنوعی طریقے پر گرمی
ہی پہنچائی جاتی ہے اور نہ گاڑی میں رستوران کار (کھانے
کا ڈبہ) ہی لگا رہتا ہے۔ اسٹیشنوں پر سوائے خربوزے، ترلونے
ابلے آلو اور فرانسیسی و شامی سگریٹ جن کے پینے سے دم
گھٹنے لگتا ہے، کھانے پینے کی کوئی چیز میسر نہیں آتی۔

ان مصائب کے علاوہ دوسرے مصائب کو بھی محض راستہ
کے مناظر کی خاطر برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اگر خوش قسمتی
سے کسی اسٹیشن پر چائے مل جائے تو چائے چلانے کے لئے چمچہ
کا پاس ہونا بھی ضروری ہے۔ ایک مرتبہ کسی اسٹیشن پر میں
نے چائے خریدی۔ چمچہ پاس نہ تھا۔ چائے والے نے مجھ سے
کہا کہ اپنی انگلی سے چمچہ کا کام لو۔ چائے میں دودھ بھی علیحدہ
ایک طرفہ تماشا ہے۔ دودھ کی بجائے یہ لوگ چائے میں
مونگ پھلی ڈالتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دودھ تو چائے کا مزا
خراب کر دیتا ہے۔

بیروت میں ٹرام اور ٹکسی دونوں سواریاں کثرت
سے ہیں مگر دونوں کی رفتار یکساں ہے۔ ان سواریوں کے
ذریعہ بعلبک کے کھنڈرات کی جو کوہِ لبنان کے پرے واقع
ہیں یا دریائے سگان کی جو بیروت و ٹریپولی کے درمیان
واقع ہے سیر کی جا سکتی ہے۔ اسی مقام پر اسیریوں کے بادشاہ
سیناچیرب یا ایران کے بادشاہ دارا جنے مصر پر معرکہ
آرائی کی تھی اور نپولین اول و سوم و لارڈ النبی کے کتبوں
کو تم چٹانوں پر کندہ پاؤ گے اور ایک چٹان پر ہزاروں سال
کی تاریخ لکھی دیکھو گے۔

لیکن گمانِ غالب تو یہ ہے کہ تمہاری موٹر اثنائے
سفر ہی میں خراب ہو جائے اور تمہاری گاڑی کا شامی
شوفر جو عام طور پر آرمینیا کا باشندہ ہوتا ہے تم سے اپنی
بے بسی اور مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے بشرطیکہ تم اسکا کرایہ
تین پونڈ اسکو ادا کر دو، تم کو پیدل واپس جانے کی رائے دے
اب تمہارے پاس سوائے دو صورتوں کے کوئی تیسری صورت
نہیں ہے یا تو تم رات گڈریوں کے ساتھ بسر کرو یا شوفر کیساتھ
مکان پیدل واپس جاؤ۔ اگر راستہ تاریک ہے تو کوئی
حرج نہیں کیونکہ شوفر کو تو آئے دن اس قسم کے واقعات کا
سابقہ پڑتا ہے اور وہ ان راستوں کے چپہ چپہ سے واقف رہتا ہے

شام کی قدیم اور دقیانوسی طرزِ معاشرت سے
تنگ آ کر تم جیسے بھاگو گے۔ نصف مسافت ناہموار راستوں یعنی
کچھ حصہ سڑک اور کچھ ساحل پر طے کرنے کے بعد جب کہ تمہاری

Marfat.com

موٹر کے ڈگارڈ پر سو تمہارا سامان سمندر کی موجوں سے شرابور ہو جائے گا' تم جرمن نوآبادی میں ایک نہایت ہی عمدہ ہوٹل میں پہنچو گے۔ کارمل پہاڑ یہاں سے بالکل صاف دور پر دکھلائی دیتا ہے۔ راستہ کی گھسکنڈیوں اور تھکاوٹ سے چست و چالاق ہو کر جب تم صبح کو بیدار ہو گے تو تم دو آدمیوں کو پوستین کے کوٹ میں ملبوس انگریزی زبان میں بھرائی ہوئی آواز میں گفتگو کرتے سنو گے۔ ناشتہ کے وقت جب تم انکو میز پر جام اور انڈا کھاتے اور ہوٹل کے ملازم سے یہ استفسار کرتے ہوئے کہ بیت المقدس سے گولڈ فلیک سگریٹ آ گیا یا نہیں' دیکھو گے تو تم کو انکی قومیت کا پتہ چل جائے گا۔ فلسطین یہی ہے۔ اگر تم پیدل قدمی کرتے ساحل تک چلے جاؤ تو تمکو پتہ چلے گا کہ اس مقام پر یورپ کے آداب و اطوار بالکل مروج نہیں ہے۔ یہاں عورتوں اور مردوں کا یکجا نہانا ممنوع ہے۔ گھوڑا گاڑیاں تم کو سڑک کے ایک کنارے پر نہایت ہی سلیقہ سے کھڑی دکھلائی دیں گی۔ لیکن ان گاڑیوں کے لاغر اور نازک گھوڑوں کو دیکھ کر عربی گھوڑوں کی نسبت تمہارے جتنے عمدہ خیالات ہیں سب رفوچکر ہو جائینگے ان گاڑیوں کے کوچبان بھی عجیب مریل اور نحیف و لاغر نظر آئیں گے۔ تمہیں یہ سنکر تعجب ہو گا کہ میں اپنی اقامت گاہ سے کارمل پہاڑ کے دامن میں جو خانقاہ ہے وہاں تک تقریباً دو گھنٹہ میں پہنچا۔ یہی نہیں بلکہ گاڑی کے کیلے سے میری پتلون کو بھی کھونچا لگا اور وہ پھٹ گئی۔ جرمن نوآبادی کی عورتیں گھوڑے گاڑیوں کی ان خرابیوں سے بخوبی واقف معلوم ہوتی ہیں کیونکہ اپنے دوران قیام میں میں نے انکو کبھی بھی اسپر سوار ہوتے نہیں دیکھا۔ اس سواری کو انھوں نے صرف غیر ملکیوں کے لیے مختص کر دیا ہے۔

اس مقام پر تم کو ریلوے لائن بکثرت نظر آئیگی۔

گویا لائنوں کا ایک جال ہے جو ہر چہار طرف پھیلا ہوا ہے۔

قاہرہ' بیت المقدس' دمشق' عمارہ' اور جنوب میں ان کا الحاق یہ لائنیں ایک دوسرے سے کرتی ہیں۔ مشرقی نقطۂ نگاہ سے ہم انکو کم درجہ آرام دہ تصور کرتے ہیں' لیکن اہل فلسطین کی بڑی تعداد موٹروں کے ذریعہ سفر کرتی ہے۔ زمانہ حال میں فلسطین اعلیٰ شاہراہوں کی تعمیر میں دوسرے ممالک سے گوئے سبقت لے گیا ہے۔ اس میں اصلا مبالغہ نہیں اگر میں یہ کہوں کہ اس ارض پاک کی بعض سڑکیں مثلاً جافہ اور بیت المقدس کی سڑک انگلستان کی سڑکوں سے بھی بہتر ہیں' اور یہی وجہ ہے کہ موٹر گاڑیاں اسپر کثرت سے چلتی ہیں۔ امریکن سیاحوں سے کرایہ دگنا وصول کیا جاتا ہے۔ میں نے فلسطین والوں کو عام طور پر یہ کہتے سنا کہ ان اطلانٹک پار والوں کو اتنی مہلت کہاں کہ دو دن سے زیادہ صرف کر کے تمام مقامات مقدسہ کی زیارت کریں۔ قصہ مختصر میں اپنی کرایہ کی موٹر میں جا بیٹھا اور ڈیرہ سے دمشق تک ریل گاڑی کا نظارہ کرتا رہا۔ اسکے بعد شام کے ریگستان کو طے کرتا ہوا بغداد پہنچا۔ بغداد سے کاظمین تک میل کارٹ سروس ہے جو نہایت ہی آہستہ آہستہ چلتی ہے' یہ سڑک نئی سڑک کے نام سے مشہور ہے اور ابھی زیر تعمیر ہے' اسپر میرے سامنے القطرہ ڈالا جا رہا تھا۔ یہ سیدھی عراق کے ہوائی اسٹیشن کو چلی گئی ہے۔

(ندیم' مئی ۱۹۳۴ء) ••

Marfat.com

تلخیصات

عرب کے چند غیر مسلم سیاح

از مولوی مسعود الرحمٰن صاحب ندوی پڈھکوی

عرب کی پاک اور مقدس سرزمین پر دنیائے اسلام کا تنہا اور واحد قبلہ اپنی گوناگوں متبرک خصوصیتوں سے ممتاز ہے۔ پیغمبر اسلام، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام کے علاوہ اکثر اسلامی بادشاہوں کے مذہبی، تاریخی، سیاسی اور ملکی کارنامے بھی اس مقدس سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالخصوص سلاطین آل عثمان اور سلاطین مصر کی مذہبی اور تاریخی عظمت اس سرزمین سے وابستہ ہے۔

اس بنا پر ہر دور اور ہر زمانہ کے سلاطین کی نظروں میں یہ ایک انمول مقدس خطہ رہا۔ اس سرزمین پاک کی عظمت و تقدیس کو بحال رکھنے کیلئے یہ حکم عام جاری ہوا کہ۔

یاایھا الذین امنوا انما المشرکون نجس فلا تقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا

ترجمہ: مسلمانو! مشرک لوگ بالکل نجس ہیں اس لئے وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ جانے پائیں۔

چنانچہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد جب حج کا زمانہ آیا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہ منادی کرتے سنائی دئے۔

الا لا یحج بعد عامنا ھذا

"خبردار ہو جاؤ۔ ہمارے اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرنے پائے"

اور جناب رسالت پناہ کی زبان مبارک سے ارشاد ہوا کہ۔

اخرجوا الیھود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب

(یہود اور نصاریٰ کو جزیرہ عرب سے نکال دو)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد غیر مسلموں سے ملک عرب کو پاک کرنے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی ان کی روش اختیار کی، اور ان کے بعد بھی آج تک جو خلفاء اور سلاطین ہوئے۔ انہوں نے بھی اسی روش کی پیروی کی۔ اس لئے کسی غیر مسلم کو عرب کی پاک زمین پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

یہی وجہ ہے کہ اب تک اہل حرمین غیر ملکی سیاحوں کی سخت نگرانی کرتے رہے۔ اور یورپین حکومتوں کے اثر و نفوذ سے قلب عرب محفوظ رہا۔ مگر تا بکے، آخر مختلف یورپین قوموں اپنے سیاسی مصالح وفرد یات

Marfat.com

ے اس مشہور مگر نامعلوم خطہ عالم کے اندرونی رموز واسرار کی عقدہ کشائی کے لئے صدیوں سے تگ و دو میں مصروف رہیں اور رفتہ رفتہ انہیں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی اس سلسلہ جد وجہد میں معلوم نہیں کتنے ماہرین فن نے بھیس بدل بدل کر سرزمین عرب پر قدم رکھے۔ بعض اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوئے اور بعض بے نیل مرام واپس لوٹے۔

جن یورپین لوگوں نے مختلف زمانوں میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی سیاحت کی ہے۔ اور اپنے سیاسی، مذہبی تمدنی یا جغرافیانہ مذاق کے مطابق وہاں کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی فہرست اگر مرتب کی جائے تو وہ بہت طویل ہوگی۔ ذیل میں صرف ان چند مشہور سیاحوں کے نام پیش کئے جاتے ہیں۔ جن کے سفر کے کارنامے واقف کاروں کے حلقہ میں شہرت عام رکھتے ہیں۔

جزیرہ عرب کے جغرافیائی تمدنی، معاشرتی وسیاسی رازہائے سربستہ کے انکشاف کے لئے سراغرسانی کی مہم غالباً ۱۷۶۲ء سے شروع ہوئی۔ اس سال حکومت برطانیہ نے بعض وسائل اختیار کئے۔ دوسری طرف ایک جرمن ہمت ور نیوبھر (NIEUBWHR) رئیس ڈنمارک نے کمر ہمت باندھی اور بلاد یمن میں کچھ کام کر سکا۔ اس کے بعد اس سلسلہ میں۔ بورکارٹ سوسیری (باشندہ سوئزرلینڈ) بورٹون انگلستانی (انگریز)۔ مورجرج اہولاٹری (باشندہ انگلینڈ) اور کورنگموں الفر تناوی (فرانسیسی) نے نام پیدا کیا ان میں سب سے پہلے بورکارٹ نے اس ملک کی سیاحت کے لئے اپنی جان کو خطرہ میں ڈالا وہ پہلے مصر آیا اور مسلمان ہونے کا دعویٰ کیا۔ اپنا نام مہدی رکھا پھر جامع ازہر میں داخل ہو کر عربی زبان سیکھی۔ ان تیاریوں کے بعد عرب کا سفر اختیار کیا اور وہاں تقریباً سات سال تک اقامت اختیار کی اس سفر کے نتیجہ میں اس نے ایک کتاب لکھی جو اس سلسلہ کی کتابوں میں سب سے زیادہ قابل قدر ہے خصوصاً ملک عرب اور قبائل عرب کے بیان میں اس نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت زیادہ وقعت رکھتا ہے۔ اس نے اسلامی وضع میں مصر میں وفات پائی اور قرافہ باب الفتوح میں شیخ یونس کے مقبرہ کے متصل مدفون ہوا۔

اس کے نصف صدی بعد اسپانی بادیا (BADIA) نے اپنے سفر عرب میں نام پیدا کیا۔ اور اس نے بھی اس سفر کو کامیاب بنانے کے لئے مسلمانوں کی وضع وقطع اختیار کی۔ اپنے آپ کو علی بک عباس کے نام سے موسوم کیا اور مکہ معظمہ پہنچا۔ اور وہاں سے مصر آیا پھر ۱۸۰۷ء میں حلب کے لئے رخت سفر باندھا اور وہاں پہنچ کر وہاں کے شرفا میں کچھ اس طرح گھل مل گیا کہ بالکل ایک خاندان اور ایک ہی نسل کا معلوم ہونے لگے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنا سلسلہ نسب بھی انہیں لوگوں سے جا ملا دیا۔ پھر اپنی پہلی شکل میں دوبارہ عرب گیا۔ اور بلاد عرب کے حالات معلوم کئے۔

اس کے بعد ۱۸۰۹ء میں ایک فرانسیسی نے جو امیر عبدالقادر جزائری کا منشی تھا۔ عربوں کے بھیس میں مکہ معظمہ گیا۔ اور اپنی سراغرسانی کو کامیاب بنانے کے لئے شریف مکہ محمد بن عون پر ظاہر کیا کہ ایک امر کی تصدیق کیلئے امیر عبدالقادر کی جانب سے آیا ہوا ہے اور اس طرح واقعات معلوم کرکے مکہ معظمہ سے طائف کی راہ لی۔ مگر نوشتہ تقدیر کچھ اور تھا۔ جب طائف سے واپسی میں پھر مکہ معظمہ آیا تو اتفاق سے الجزائر کے چند حاجیوں نے اس کو پہچان لیا۔ چنانچہ فوراً گرفتار کیا گیا۔ اور آہنی زنجیروں سے مضبوطی کے ساتھ جکڑ دیا گیا۔

اسی طرح ۱۸۱۰ء میں المانی سیزن نے یمن کی راہ لی اور وہیں قضا وقدر کے ہاتھوں قتل ہو کر اپنے کیفر کردار کو پہنچا۔

۱۸۱۴-۱۵ء میں بورک ہارڈ (BUREKHARDE) نے واقعات کے تجسس کا خیال کرکے عیاری کے ساتھ مکہ معظمہ اور مدینہ طیبہ کا دورہ کیا۔ جغرافیائی معلومات کے خزانہ پر نقب زنی کی اور اپنا دامن مقصود بھر کر وطن

Marfat.com

کو لوٹا۔ لیکن اس کی خوش نصیبی کا ستارہ چمک چکا تھا۔ رحمت ایزدی سے اس کے دل میں نورِ اسلام کی حقیقی جھلک پہنچی۔ اور صدقِ دل سے اسلام لے آیا اور اخیر عمر تک پختہ مسلمان رہا اس کا.............

........اسلامی نام عبداللہ بورک بارڈ تھا۔ لیکن عوام اسے شیخ برکات کہا کرتے تھے۔ اس کے بعد جب مغربوں کے حملے دایموں پر ہوئے تو اجنبیوں کے داخلہ کے لئے بہت سہل اور آسان طریقے نکل آئے اور بے محابا بلادِ عرب میں اجنبیوں کا آنا جانا شروع ہو گیا۔

چنانچہ سب سے پہلے سادلیہ نے خلیج فارس سے بحرِ احمر کا راستہ نکالا اور المانی رابیل نے ۱۸۲۶ء میں حجاز اور اس کے اطراف جوانب کو سفر کیا پھر ولیسٹڈ نے ۱۸۲۸ء میں بلادِ یمن کا رُخ کیا اور بعد کو بوٹا اور ملازم ہاسانے ۱۸۳۶ء و ۱۸۴۲ء میں انکشافِ حال کی سعی کی اور بہت کچھ انکشافات حاصل کرکے واپس آیا۔

اسی طرح کرنل لابنس، عبداللہ فلبی وغیرہ موجودہ دور کے مشہور سیاحِ عرب ہیں ان کے واقعات ہمارے ذہنوں میں تازہ ہیں۔ اس لئے ان کے تذکرہ کی یہاں چنداں ضرورت نہیں۔

اپریل سنہ ۱۹۴۱ء

Marfat.com

مقالات

حضرت امام حسین علیہ السلام نے شہادت کیوں قبول کی

از

جناب آنریبل سید حسین امام صاحب ممبر کونسل آف اسٹیٹ، پٹنہ، گیا

"یہ تقریر آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے ۹ر فروری ۱۹۳۱ء کو نشر کی گئی، اور باضابطہ اجازت ذیل میں شائع کی جاتی ہے۔" "مدیر"

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت ایک ایسا سانحۂ عظیم ہے کہ تیرہ سو برس گذرنے کے بعد بھی آج تک لاکھوں انسان اس حادثے پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ حضرت امامؑ نے شہادت کیوں قبول فرمائی۔ اس کا جواب صرف مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ دنیا کے لئے سبق آموز ہے۔ اس کے صحیح جواب کے تلاش کرنے میں دو صورتیں سامنے آتی ہیں۔ یا تو شہادت نتیجہ تھی جاہ طلبی کی جنگ کا۔ یا ایک قربانی تھی قوم اور اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کی۔

اگر یہ جنگ سلطنت کے حاصل کرنے کے لئے کی گئی ہوتی تو اس کے لئے چند ابتدائی باتوں کا پایا جانا ضروری تھا۔ مثلاً سب سے پہلے آپ اپنے عزیزوں اور قرابت والوں سے مشورہ لیتے اور ان کے کہنے پر چلتے۔ اپنے دوستوں اور مددگاروں کو اکٹھا کیا ہوتا، اسلام کے مرکز میں لوگوں کو اپنا ہمنوا اور طرفدار بنایا ہوتا۔ اپنی خلافت کا اعلان کیا ہوتا۔ مختلف اسلامی ملکوں سے اپنے ماننے والوں اور جاں نثاروں کی فوج اکٹھا کی ہوتی۔ جب یہ سب باتیں جمع ہو جاتیں تو یزید کے خلاف قدم اٹھاتے۔ مگر واقعات یہ بتاتے ہیں کہ ان ضروری چیزوں میں سے آپ نے کسی کو بھی مہیا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے خلاف مشیروں نے جنگ چھیڑنے سے منع کیا اور رفیقوں نے ساتھ دینے سے انکار کیا۔ آپ نے شہادت کے وقت تک کبھی بھی اپنی خلافت کا اعلان نہیں کیا اور فوج کے بجائے بچوں اور عورتوں کو اپنے ہمراہ لے گئے۔

کیا عقل سلیم اس بات کو ماننے کے لئے تیار ہو سکتی ہے کہ اس بے سروسامانی کے ساتھ اسقدر رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کامیابی کی امید لئے ہوئے کوئی سلطنت کا طالب کر سکتا ہے۔ یہ بھی سوچئے حضرت امامؑ نوجوان نہ تھے کہ کمال اندیشی نہ ہوتی۔ سن شریف پچپن برس کا تھا، زمانہ کی نیرنگی اور اس کے اونچ نیچ کو جانتے تھے۔ اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ اقدام بغیر سوچے سمجھے نہ کیا گیا تھا۔

Marfat.com

یہ سمجھنے کی بات ہے کہ حضرت علیؓ کی شہادت کو انیس سال گذر چکے تھے، اس عرصہ میں سلطنت کے حاصل کرنے کی آپ نے کبھی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ خاموشی کے گوشہ میں مدینہ میں زندگی کے دن گذارتے رہے۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ اتنے سال گذرنے کے بعد آپ یکایک لڑائی کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کے سمجھنے کے لئے حضرت علیؓ کی شہادت سے حضرت امام حسینؓ کی شہادت پانے تک کے حالات پر ایک سرسری نظر ڈالنی ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۳۵ھ سے سنہ ۶۰ھ تک اسلامی سلطنت ایک خاص دور سے گذری ہے، اس میں دو قسم کی طاقتیں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں، ایک طرف بنو ہاشم تھے یہ لوگ اسلامی حکومت کے ڈھانچے کو اسلامی جمہوریت کی بنیاد پر چاہتے تھے دوسری طرف بنو امیہ تھے جو اسلام کے جمہوری نظام حکومت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی شہنشاہیت کے قائم کرنے کی فکر میں تھے۔ ابتدا میں حضرت علیؓ پہلی جماعت کے امام تھے۔ اگر اس جماعت کو اس زمانے کی پوری اسلامی دنیا میں غلبہ حاصل ہو جاتا تو اسلامی جمہوریت کا صحیح نظام مضبوط بنیادوں پر قائم رہتا۔ لیکن دوسری جماعت کے رہبر امیر معاویہ کو شام میں اقتدار حاصل تھا۔ وہ اپنی طاقت کے بھروسے پر حضرت امیر علیہ السلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اپنی سیاسی تدبیروں سے اپنی حکومت قائم کر لی۔ اور آہستہ آہستہ شام کی سلطنت کو دنیائے اسلام کی واحد سلطنت بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

جبتک اسلامی خلافت کا مرکز عرب میں رہا اس وقت تک اسلامیت چھائی ہوئی تھی، مدنی اخوت اور اسلامی مساوات کی جگہ شامی فرق مراتب نے لے لی۔ اسلامی جمہوریت کو بنی امیہ کی شخصی حکومت نے ملیامیٹ کر دیا۔ تبلیغ اور جہاد کی جگہ عیش پرستی اور تن آسانی نے لے لی۔ عربی سادگی گم ہوئی۔ اور عجمی تکلفات بھر گئے۔ یہ سب خرابیاں آئیں مگر مذہب کا نام پھر بھی باقی رہا، چوری چھپے اسلام کے احکام کی خلاف ورزی ہوتی تھی کھلم کھلا خلاف ورزی کی جرأت نہ تھی، یہ اس لئے تھا کہ اگرچہ امیر معاویہ مہاجرین میں نہ تھے، پھر بھی حضرت رسول کریمؐ کی صحبت سے بہت کچھ حاصل کر چکے تھے، اس لئے وہ صفات اور برگزیدگی جو صحابہ کرام میں پائی جاتی تھی اس کا پرتو کچھ نہ کچھ امیر معاویہ میں موجود تھا، اس لئے حضرت امام علیہ السلام نے امیر معاویہ کے دور سلطنت میں کسی قسم کا اقدام نہیں کیا۔

امیر معاویہ شروع ہی سے اس کے خواہشمند تھے کہ سلطنت کو اپنے خاندان میں رکھیں اور اس نیت سے عربی قبیلوں کے سرداروں کو اپنے آس پاس جمع کرتے رہے۔ مخالفوں کو داد و دہش سے ملاتے رہے، اس کے ساتھ وہ اپنے آئندہ منصوبہ کو کبھی زبان پر نہیں لائے۔ کیونکہ اس وقت تک جمہور مسلمان موروثی سلطنت کے تخیل کو بھی برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھے، یہانتک کہ جب امام حسنؑ نے وفات پائی تو انھوں نے خواص کی مجمع میں اپنے لڑکے یزید کو اپنا ولیعہد بنانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور آہستہ آہستہ ان کے اس ارادہ کی شہرت ہوتی گئی، یہاں پر یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ ابتک کسی خلیفہ یا امیر نے اپنا ولیعہد اپنے خاندان میں سے کسی کو نہیں چنا تھا، خلیفہ اول عام انتخاب سے چنے گئے تھے، پھر خلیفہ اول نے اپنے خاندان کے مشہور و معروف لوگوں کو چھوڑ کر اپنی جگہ حضرت عمرؓ کو نامزد کیا، اس کے بعد خلیفہ دوم نے اپنے مشہور و معروف لڑکے حضرت عبداللہ کو ان چھ لوگوں میں بھی جگہ نہ دی جن میں انھوں نے خلافت کو محدود کر دیا تھا، اس لئے امیر معاویہ کی یہ خواہش اسلام کی جمہوری سلطنت کے بالکل مخالف تھی، چنانچہ جب وہ ولیعہد کے مسئلے کو طے کرنے کو مدینہ تشریف لائے اور بڑے بڑے صحابیوں کو مشورہ کے لئے بلایا اس موقع پر جن بزرگوں نے مخالفت کی ان میں سب سے زیادہ پرجوش مخالفت حضرت امام حسینؑ کی تھی چنانچہ آپ نے امیر معاویہ کو مخاطب کرکے فرمایا:-

"یزید...... ایک معلوم شخص ہے، تم اس کی یہ حالت کیوں نہیں بیان کرتے کہ وہ کتوں کی لڑائیوں، کبوتروں کی بازیوں، گانیوالی لونڈیوں کے گانوں، اور طرح طرح کھیل کود کے تماشوں میں لگا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم اپنے ارادے سے باز آجاؤ۔ ورنہ مجھے حیرت ہوگی کہ کیوں تم اس مخلوق کا بھاری بوجھ اپنے سر لیکر اللہ تعالیٰ سے ملنا چاہتے ہو۔ خدا کی قسم

Marfat.com

تم نے ظلم کا بازار نفسانیت اور باطل سے بھر دیا ...... جبکہ تمہارے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابی موجود ہیں جن کی صحبت اور قرابت اور جن کا دین اور مذہب خالص اور اعتماد کے قابل ہے۔ تو ایسے لوگوں کو چھوڑ کر تم ایک شخص کو کیوں سامنے لاتے ہو جس میں یہ خوبیاں موجود نہیں ہیں۔ بلکہ وہ حد سے گذرا ہوا اور فتنہ میں پڑا ہوا ہے۔

کیا تم یہی چاہتے ہو کہ لوگوں کو فتنہ میں ڈال دو۔"

امام حسین کی اس تقریر سے پوری طرح معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے یزید کی ذاتی نااہلیت نہ ہوتی تب بھی اس وقت صحابیوں میں سے اس سے زیادہ اہل موجود تھے، جو اپنی ذاتی قابلیت کے باعث یزید پر ترجیح پانے کے مستحق تھے۔ اس لئے وہ یزید کو بڑے بڑے صحابیوں کی موجودگی میں اس عہدہ کے لائق نہیں سمجھتے تھے اور ان کی مخالفت کے اسباب خالص مذہبی، اخلاقی، اور سیاسی تھے۔ یعنی وہ اس لئے مخالف نہ تھے کہ وہ خود اس کے خواہاں تھے۔ بلکہ اس لئے مخالف تھے کہ یزید اس کا اہل نہ تھا، لیکن اس کے باوجود امیر معاویہ نے یزید کی ولیعہدی کا عام اعلان کر دیا۔ اور یہ بھی مشہور کر دیا کہ حضرت امام حسینؑ نے بھی بیعت کر لی ہے، لیکن امام علیہ السلام نے اس کی تردید کی اور یزید کی ولیعہدی پر اتفاق حاصل کرنے میں امیر معاویہ کو کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ اور وہ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

امیر معاویہ کی وفات کے بعد امام حسین علیہ السلام کے سامنے دو راہیں تھیں۔ یا تو وہ خود خلیفہ قبول کر کے انسانیت اخلاق اور نسل انسانی کی اجتماعی زندگی سے علیحدہ ہو کر اپنی زندگی گذار دیتے، یا دنیا کو یہ سبق سکھاتے کہ انتہائی بے سروسامانی کے باوجود ظلم کے خلاف کھڑا ہو جانا انسانیت کی بہترین خدمت ہے، چاہے اس راہ میں اپنی پیاری جان بھی اپنی جان کے پیدا کرنے والے کے سپرد کیوں نہ کر دینی پڑے، مگر باطل کے آگے جھک جانا اخلاق اور انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ اسلام روم و ایران کی بادشاہتوں کو مٹا چکا تھا، اور دنیا کو عدل، انصاف، اور مساوات کا سبق سکھا چکا تھا۔ اس لئے اگر امیر معاویہ کی قائم کی ہوئی شخصی اور موروثی سلطنت کا بول بالا ہو گیا، اور اس کے خلاف حق کی آواز نہ اٹھائی گئی تو جمہوریت کا نام و نشان بھی اس دنیا سے اُٹھ جائے گا۔

یہی اصلی اسباب تھے جن کی بنا پر امام حسین علیہ السلام یزید کی خلافت کا اعلان ہوتے ہی اس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا اٹھنا صرف یزید کی مخالفت میں نہ تھا، بلکہ اس حملے کی مدافعت میں تھا جو بنو امیہ کی طرف سے اسلام کے قائم کئے ہوئے جمہوری تخیل پر ہوا تھا۔

آپ نے کربلا کے دردناک واقعات سنے ہیں، آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت امامؑ کو جن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے وہ ایک لمحہ میں دور ہو سکتی تھیں، بشرطیکہ آپ باطل کے سامنے جھک جاتے، اس کی اطاعت کا اقرار کر لیتے۔ دنیا میں بڑے بڑے سورما سپہ سالار گذرے ہیں، نپولین آخر زمانے کا سب سے بڑا فاتح سمجھا جاتا ہے، مگر اس کی زندگی سینٹ ہیلینا کے قید خانے میں گذری، یورپ کی موجودہ لڑائی میں بڑے بڑے ملکوں نے بیچارگی میں ہتھیار ڈال دیئے، حالانکہ ان کو نازی و فسطائی طاقتوں کی گمراہیوں کا یقین تھا، لیکن حضرت امام کی ایسی بلند اخلاقی کی مثال دنیا میں کوئی دوسری موجود نہیں ہے کہ انتہائی بیچارگی و بیکسی کے باوجود سپر نہ ڈالی، کیونکہ ان کے سپر ڈالنے کے معنی نسل انسانی کو ایک بہت بڑی تعلیم سے بے بہرہ چھوڑ دینے اور حق کے علم کو باطل کے آگے ہمیشہ کے لئے جھکا دینے کے تھے، اگرچہ شہادت کے واقعہ کے بعد یزید کی حکومت قائم ہوئی مگر یہ ماننا پڑیگا کہ اس کی حکومت سے جو بدترین نتیجے پیدا ہونے والے تھے ان کا سدباب اس واقعہ کے اخلاقی اثر سے ضرور ہوا، اسلامی دنیا نے اس کو اور اس کے ایسے اخلاق اور طرز حکومت رکھنے والے بادشاہوں کو غاصب اور ظالم سمجھا اور ان سے گلو خلاصی کو انسانیت کا فریضہ بنایا، اگر حضرت امام نے یزید کی اطاعت قبول کر لی ہوتی تو اس اخلاقی

Marfat.com

سبق سے انسانیت ہمیشہ کے لئے محروم رہتی، اس واقعہ سے ظلم کی حمایت سے باز رہنے، اس کے خلاف آواز اٹھانے اور ایثار و قربانی کا نمونہ پیش کرنے کا کبھی نہ بھولنے والا سبق حاصل ہوا، اور اسلامی جمہوریت کی روح جو شہنشاہیت اور موروثی سلطنت کی وجہ سے دبی جا رہی تھی، نئے سرے سے تازہ ہو گئی، اس لئے حضرت امامؑ نے شہادت کی راہ کو اختیار فرما کر حق کی حمایت کی ایسی مضبوط نیو ڈالدی جو قیامت تک ہلائے نہیں ہل سکتی، اسی فلسفہ کو خواجہ اجمیری نے کیا خوب فرمایا ہے:

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ — دین است حسینؑ و دین پناہ است حسینؑ
سر داد نہ داد دست در دست یزید — حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

۱ فروری سنہ ۱۹۴۱ء

Marfat.com

حضرت امام حسینؓ نے شہادت کیوں قبول کی؟

۷ر فروری ۱۹۴۱ء کو اسی موضوع پر آل انڈیا ریڈیو دہلی نے آنریبل سید حسین امام صاحب کی تقریر نشر کی تھی، ان ہی کا ایک جواب یہ بھی ہے۔ (ادارہ)

اس سوال کا جواب ایک طرف اس قدر آسان ہو گیا ہے کہ محض ایک شعر میں دیگر کمالِ سخن کی داد لیجا سکتی ہے۔ ؎

چو عہدِ شور و شیل آمد ادائے فرضِ عین آمد
بایں فالش حسینؓ آمد شہید نازِ ربانی

لیکن محض "شہید نازِ ربانی" کہہ دینے سے کام نہیں چلتا، دیکھنا یہ ہے کہ جہاں تک نفسِ شہادت کا تعلق ہے یہی ایک واحد مثال نہیں ہے۔ دنیا کی تاریخیں شہادت کے حادثوں کے بیان سے بھری پڑی ہیں۔ اگر یہ کہیئے کہ اس شہادت کی مظلومیت کی نظیر نہیں ہے اسلئے یہ سب شہادتوں سے بڑھی ہوئی ہے۔ تو اس میں شک نہیں ہے کہ آپ ایک حیثیت اسکی قائم کئے دیتے ہیں لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ خود آپکا دل اس سے مطمئن نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے مقابلے میں تو وہ جماعت بہتر ثابت ہوتی ہے۔ جو اس کو تقدس اور محض روحانیت کا اعلیٰ درجہ دیکر اپنا اطمینان کر لیتی ہے اور کہتی ہے کہ ؎

اے دل بگیر دامنِ سلطانِ اولیا
یعنی حسین ابنِ علیؓ جانِ اولیا

ذوقِ دگر بجامِ شہادت انزو فزود
شوقِ دگر ببادۂ عرفانِ اولیا

Marfat.com

اس نکتہ نگاہ کو سامنے رکھیے تو یہ سوال ہی نہیں اٹھتا کہ کیوں قبول کیا؟ اس لئے یہ سوال قائم کر لینے کے بعد سوائے اسکے کہ امام صاحبؑ کی اس عظیم الشان ایثار کو محض انسانی اور شخصی حیثیت سے غور کیا جائے اور اس سے معلوم کیا جائے کہ وہ کون سی وجہیں تھیں جو شہادت قبول ہی کر لینے پر مجبور کرتی تھیں۔ اسی کے ساتھ اس کو دیکھنا پڑیگا کہ وہ وجہیں اتنی زبردست تھیں بھی یا نہیں کہ انکی بنا پر اس حد تک مظلومیت گوارا کیجائے۔ کیا شہادت کے بغیر وہ ضرورتیں پوری نہیں ہو سکتی تھیں، جنہوں نے امام صاحبؑ کی اور انکے گنتی کے ساتھیوں کی جانیں لیں اور وہ بھی اس بیکسی اور بے بسی کے ساتھ کہ جس کے بیان پر آنکھیں خون برساتی ہیں اور دل ٹکڑے ٹکڑے ہوتا ہے۔

آپ نے اگر امام صاحبؑ کی زندگی پر غور کیا ہوا ہو گا تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ امام صاحبؑ نے ہوش سنبھالا تو کیا دیکھا کہ خلیفہ ثالث عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی پوری نیک نیتی کے باوجود مروانی فتنہ کے سیلاب کو روکنے سے عاجز رہے، اور آخر کار اپنے ظالموں کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ والیٔ شام نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خلیفہ ماننے سے انکار کر کے اپنی امارت کے استحکام کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ محض تین چار سال کی خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی کس طرح پریشانیوں اور خانہ جنگیوں میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد امام حسن علیہ السلام چھ مہینہ ہی میں مجبور کر دیئے گئے کہ بحق امیر شام اس خلافت سے باز رہ کر سکون حاصل کریں۔ ادھر تو یہ ہو رہا تھا، ادھر امیر معاویہ جمہوری آزاد حکومت کو ہمیشہ کیلئے توڑ کر اس کی جگہ استبدادی شخصی اور نسلی حکومت قائم کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہی چلے جاتے تھے۔ اولاً تو یہی بات امام صاحبؑ کے نزدیک اصولی اختلاف کی ایسی تھی جس کیلئے احتجاج اور جسکی مدافعت ناگزیر تھی۔ مگر جب امیر معاویہ کے بعد یزید خلیفہ بن بیٹھا، جو کسی حیثیت سے اس ذمہ داری کے عہدے کے لائق بھی نہ تھا تو پھر بات واقعی برداشت سے باہر ہو گئی۔ لیکن حکومت کے ذرائع وسیع ہوتے ہیں۔ اسکی جلال اور جبروت کے آگے بڑے بڑے مردوں کا پتہ پانی ہوتا ہے۔ وہ بھی امیر معاویہ کی قائم کردہ اور یزید جیسے غیر ذمہ دار شخص کی استبداد کے تحت، ظاہر ہے کہ حکومت کیسی اور کس طرح کی ہو گی۔ کسی خاص شخص کے نام لینے کی ضرورت نہیں۔ مگر اس میں تو کسی بحث کی گنجائش ہی نہیں کہ اُس وقت تین طرح کے لوگ تھے۔ اوّل وہ لوگ جن کو خود اپنی خلافت کے متعلق امیدیں تھیں۔ یہ محض حق کی حمایت پر لبیک کہنے کے بجائے موقع کو بہتر اور زیادہ امید افزا بنانے کیلئے ع در کمینم انتظارِ وقتِ فرصت می کنم۔ پر عمل رہنا پسند کرتے تھے۔ دوسرے وہ لوگ تھے جو امیر معاویہ کی پڑھائی ہوئی پٹی کی بنا پر شہنشاہیت ہی کو قوم و ملک کے وقار اور عزت کا اکیلا ذریعہ مان کر اس کیلئے بدل و جان کوشاں تھے۔ تیسرے وہ مطلب کے یار تھے جو اپنے حلوے مانڈے ہی سے غرض رکھتے تھے، انکی بلا سے امارت کے نام استبدادی حکومت رہے یا جمہوریت کے اصول پر نظم و نسق سلطنت ہو۔ ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے "پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند" کے مطابق ہوا خواہانِ یزید کا امام صاحبؑ سے بیعت کا حد سے بڑھا ہوا مطالبہ ہو رہا تھا۔ کیونکہ یہ لوگ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ امام صاحبؑ ہی کی اکیلی ذات باقی رہ گئی ہے۔ جس سے خطرہ عظیم اس بات کا ہے کہ ان کی ایک للکار پر ساری پریشان خیالی دور ہو کر فاتحینِ عالم پھر ایک ہی مرکز پر آجائیں گے اور سب خواب پریشان ختم ہو جائیں گے۔ وہ لوگ ہرگز اس کا وقت نہیں دینا چاہتے تھے کہ امام حسین علیہ السلام کو اس کا موقع بھی مل سکے کہ کوئی بڑی جماعت بنا سکیں۔ اس لئے والیٔ مدینہ کو طلب و تقاضۂ بیعت سے عاجز ہو کر

Marfat.com

امام صاحبؑ مکہ چلے گئے تھے، مگر وہاں اور توکچھ نہ ہوا البتہ امام صاحبؑ کو مدینہ کے شیروں کی رائے پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ کوفیوں نے انکی مشن میں پوری پوری امداد کا یقین دلانا شروع کیا۔ اسکی تحقیق کے لئے جن جان نثاروں کو آپ نے بھیجا تھا، انکے رپورٹ سے تصدیق بھی ہوگئی۔ ایسے ماحول میں آپ ہی غور فرمایئے کہ ایک اہم مقصد کو پورا کرنے کا متمنی انسان اگر دوڑ نہ پڑتا تو اور کیا کرتا؟ لیکن میرے کہنے کا یہ مطلب سمجھیئے کہ امام حسین علیہ السلام محض جذبات میں کھوئے ہوئے مصلحتوں سے آنکھیں بند کئے ہوئے کام کر رہے تھے۔ نہیں نہیں امام صاحبؑ بڑے ہوش گوش اور احتیاط سے کام لینے کے عادی تھے اور کیوں نہیں ہوتے؟ انکی مظلومیت کا آفتاب کربلا کی سرزمین پر نصف النہار کو ضرور پہنچا۔ مگر اسکا طلوع بہت پہلے سے ہوا تھا۔ ان کو قوتِ برداشت کا امتحان ایک سے زیادہ بار دینا پڑا تھا۔ بلکہ بار بار دینا پڑا تھا۔ اپنی ذات کیلئے وہ کچھ نہیں چاہتے تھے۔ وہ تو حُبِ جاہ، خود پسندی، استبداد، اور شخصی حکومت کے دھوکے میں آئی ہوئی انسانیت کو آزادی دلانے کی کوشش میں وہ سب کچھ کر گذرنے پر تلے ہوئے تھے، جو انسانی بس کے اندر تھا۔ امام صاحبؑ کے متعلق بجا طور پر اگر کہا جا سکتا ہے تو یہی کہ ؎

طالبِ راہ را ادب دادی — جان خود را دریں طلب دادی

شہادتِ امام حسینؑ کے مقاصد و مطالب کے ساتھ آج تک یہ ظلم جاری ہے کہ وہ تقدیس اور تکریم کی بلندیوں پر ضوفشاں مگر ناقابلِ شناخت ستارہ تو نظر آتا ہے۔ حالانکہ ضرورت تھی کہ نظامِ فلکی کے مہرِ خاور کی طرح اس کی کرنیں حیات بخش ہوتیں اور جمود و سکون خوابِ غفلت کو ختم کرنیکی طاقت رکھتیں، تاکہ جور و استبداد کے نیچے دبی ہوئی قوموں کو سبق ملتا۔ ؎

زیرِ خنجر بندھتی ہے نیت ادائے فرض کی — یہ نماز عاشقی ہے جو قضا ہوتی نہیں

خدا بھلا کرے دلی کی خاک کے پیوند ہونے والے غالبؔ کا کہ جس نے میرے مطالب کو پوری وضاحت کے ساتھ ادا کر دیا ہے ؎

بہت ہی پایہ گردِ رہِ حسینؑ بلند — بقدرِ فہم ہے گر کیمیا کہیں اسکو
نظارہ سوز ہے یاں تک ہر اک ذرۂ خاک — کہ لوگ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اسکو
ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے — اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اسکو

امام حسینؑ علیہ السلام کی روحانی عظمت کا معتقد ہو کر، انکی عدیم النظیر مظلومیت کی انتہا کا حس رکھنے کے بعد بھی میں یہی کہونگا کہ انکے مقاصد جیسے عظیم الشان اور ولولہ انگیز تھے۔ اور ان کا ایثار جتنا بڑھا ہوا تھا، اتنا سبق اس سے نہیں لیا گیا۔ اگر امام حسینؑ علیہ السلام کے قلب کو انکی حق پرستی گرمائے ہوئے نہ ہوتی تو کیا وہ وقتی مصلحت کی بنا پر یزید کی بیعت کر کے عیش و عشرتِ دنیاوی سے حصہ نہیں لے سکتے تھے؟ کیا ان پر جو کچھ کربلا میں گذری اس کا ایک شمہ بھر خطرہ ہو سکتا تھا؟ مگر نہیں جو کچھ انہوں نے کیا اُس کو حضرت خواجہ اجمیریؒ کی زبان سے سُنیئے۔ ؎

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ — دیں است حسینؑ دیں پناہ است حسینؑ
سر داد نہ داد دست در دستِ یزید — حقا کہ بنائے لا الٰہ است حسینؑ

Marfat.com

خلاصہ یہ کہ امام حسینؑ جس ماحول میں تھے اس کا یہی اقتضا تھا کہ وہ اس شہادت کو قبول فرما کر انسانیتِ عامہ پر اپنا احسان عظیم رکھ جاتے ۔

ہ

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

"حسین اللہ اللہ حسین اللہ اللہ"

شبیہ نبیؐ عین یمین اللہ اللہ — حسین اللہ اللہ حسین اللہ اللہ
جو مثنیٰ حسنینؑ نبیؐ نے کہا تو — علیؑ سیدہؑ والدین اللہ اللہ
حسنؑ کے قوی دونوں بازو انہیں سے — یہی سب کے تھے دل کے چین اللہ اللہ
کمربستہ میکالؑ و جبریلؑ حاضر — شہِ دینؑ کے یہ خادمین اللہ اللہ
ہوا جا کے سر کربلا کی زمیں پر — وہ میدان بدر و حنین اللہ اللہ
جہاں میں فقط حسرت و بیکسی تھی — یہی دونوں تھیں جانبین اللہ اللہ
جو بھوکے پیاسے کفن کو بھی ترسے — وہی تھے شہِ مشرقین اللہ اللہ
وہی ترسے دو چلو پانی کو یارب! — دو عالم کا جو زیب و زین اللہ اللہ
نہ کیوں خونِ دل میری آنکھوں سے ٹپکے — نجف کربلا، کاظمین اللہ اللہ
ضلالت، کا بس ایک نقطہ بہت ہے — اسی سے ہوا عین غین اللہ اللہ

بظاہر خموش اور اُس پر یہ عالم
حسن روئیں روئیں سے بین اللہ اللہ

جنوری ۱۹۶۳ء

Marfat.com

حضرت عمر ابن عبدالعزیز

(از جناب محمد طیب صاحب عثمانی ندوۃ العلماء لکھنؤ شبلی ہوسٹل)

خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کا دور حکومت شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں بڑے بڑے حکمران پیدا ہوئے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز بھی بنو امیہ کے خاندان سے تھے، لیکن ان کی خلافت نے خلافت راشدہ کی یاد تازہ کر دی۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے خلافت کا نقش کہن آنکھوں کے سامنے ابھر کر ہو گیا۔ انہوں نے اپنی حکومت کو عدل و انصاف کی بنیاد پر کھڑا کیا۔ یہاں پر آپ کے سامنے ان کی زندگی کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش کروں گا۔

عمر نام تھا ابو حفص کنیت والد کا نام عبدالعزیز آپ کے والد بنو امیہ کے ممتاز آدمیوں میں تھے اور ماں کا نام ام عاصم تھا، ماں کا سلسلہ نسب حضرت عمر ابن الخطاب سے ملتا ہے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز مدینہ میں پیدا ہوئے آپ کے والد نے تعلیم و تربیت کے لئے صالح بن کیسان کو مقرر کیا۔ صالح بن کیسان بہت اچھی طرح سے آپ کی تعلیمی اور اخلاقی نگہداشت کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے نماز میں تاخیر کی صالح بن کیسان نے اس کی وجہ پوچھی تو کہا کہ بال سنوارنے میں دیر ہو گئی۔ بولے کہ بالوں کے سنوارنے کو نماز پر ترجیح دیتے ہو؟ آپ کے والد عبدالعزیز کو جب خبر ہوئی تو انہوں نے فوراً ایک آدمی بھیجا جس نے پہلے آکر بال مونڈ دیے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا اور اس کے بعد شعر و شاعری قرآن و حدیث، فقہ میں بہت بڑی مہارت حاصل کی۔

ولید بن عبدالمالک کی حکومت میں مدینہ منورہ کے گورنر مقرر ہوئے۔ مدینہ کی گورنری کے زمانے میں عمر ابن عبدالعزیز نے مسجد نبوی کو بہت شاندار طریقہ سے نئے سرے سے تعمیر کرایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کے اطراف میں جن مقامات پر نماز ادا فرمائی تھی لوگوں نے تبرکاً وہاں پر معمولی مسجدیں بنا دی تھیں، حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے ان تمام جگہوں پر قیمتی پتھروں سے نہایت شاندار مسجدیں بنوائیں۔ ۹۳ھ میں آپ نے کسی وجہ سے گورنری سے استعفا دے دیا۔

ولید بن عبدالمالک کے بعد سلیمان بن عبدالمالک خلیفہ ہوا۔ ۹۹ھ میں سلیمان بن عبدالمالک بیمار ہوا۔ اور جب اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تو اس نے عمر ابن عبدالعزیز کو خلافت کے لئے منتخب کیا۔ عمر ابن عبدالعزیز جب خلیفہ ہوئے تو مسجد میں آئے اور منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیا جس کا خلاصہ یہ ہے۔

لوگو! مجھ پر خلافت کا بار بغیر اس کے کہ مجھ سے رائے لی جاتی یا میں اس کا خواستگار ہوتا۔ یا عام مسلمانوں سے مشورہ لیا جاتا، ڈال دیا گیا ہے میری بیعت کا جو طوق تمہاری گردنوں میں ہے میں اس کو خود نکال لیتا ہوں۔ اب جس کو پسند کرو اپنا

Marfat.com

خلیفہ مقرر کرو۔

اس خطبہ کو سن کر تمام لوگوں نے باآواز بلند کہا "ہم نے آپ کو اپنا خلیفہ منتخب کیا اور آپ کی خلافت پر راضی ہیں"۔ جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو انہوں نے ایک مفصل تقریر کی اور آخر میں یہ فرمایا۔ کہ

لوگو! جو شخص خدا کی اطاعت کرے اس کی اطاعت واجب ہے اور جو شخص اس کی نافرمانی کرے اس کی فرمانبرداری تم پر جائز نہیں ہے جب تک میں خدا کی اطاعت کروں، میری اطاعت کرو۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو میری فرمانبرداری تم پر جائز نہیں ہے۔

خلافت سنبھالتے ہی انہوں نے سب سے پہلے یہ کیا کہ خلفائے بنو امیہ نے رعایا کا جو مال ظلماً غصب کر لیا تھا سب کو واپس دلایا اس وجہ سے خاندان بنو امیہ ان کے مخالف ہو گئے۔ بنو امیہ کے جابرانہ حکومت کی وجہ سے ان کے عمال بھی رعایا پر ظلم کرنے کے عادی ہو گئے تھے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے اس قسم کے ظالم عمال کو خارج کر دیئے تاکہ عدل و انصاف کی سطح برابر ہو جائے۔ عمر ابن عبدالعزیز کے خلیفہ ہونے سے پہلے رعایا سے بغیر اجرت کے مزدور کا کام لیا جاتا تھا اسی قسم کی بہت سی ناانصافی رعایا کے ساتھ ہوتی تھی لیکن عمر ابن عبدالعزیز نے خلیفہ ہوتے ہی ان تمام مظالم کی طرف توجہ کی اور عدل و انصاف کی نظیر قائم کر دی۔

آپ کے اخلاق نہایت اچھے تھے جب کسی سے ملتے تو نہایت خندہ پیشانی سے ملتے معمولی سے معمولی آدمی سے بھی نہایت شیریں کلامی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، خلافت سے پہلے نہایت عمدہ کپڑے پہنتے، خوشبو لگاتے، راستے میں چلتے تو اکڑ کر چلتے، لیکن خلیفہ ہونے کے بعد تکبر و غرور عجز و انکساری سے بدل گیا، مدینہ کے گورنر تھے تو وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا مدینہ کے گورنر ہیں۔ لیکن خلیفہ ہونے کے بعد کسی نے یہ نہیں جانا کہ یہ خلیفہ ہیں۔

ایک خلیفہ کے لئے سب سے اہم چیز دیانت داری ہے، اور سب سے اہم امانت بیت المال کا خزانہ ہے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز نہایت امین تھے وہ رات کو خلافت کا کام بیت المال کی روشنی سے انجام دیتے لیکن جب اپنا کام کرتے تو اس روشنی کو اٹھوا دیتے اور اپنا چراغ منگوا کر کام کرتے۔ انہوں نے اپنے لئے یا اپنی اولاد کے لئے کبھی کوئی چیز بیت المال سے نہیں لیا۔ کپڑا نہایت سادہ اور معمولی پہنا کرتے تھے ان میں پیوند لگے رہتے تھے۔ غذا بھی بہت معمولی درجہ کی کھاتے تھے۔ ایک دن گھر سے باہر دیر میں آئے۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ کسی پر ناراض ہیں۔ لیکن انہوں نے بطور معذرت کہا کہ میں نے رات مسور اور چنے کی دال کھائی تھی اس لئے نفخ ہو گیا ہے۔ اسی قسم کے سیکڑوں واقعات آپ کے عجز و انکساری کے دلیل ہیں

اوپر گذر چکا ہے کہ بنو امیہ نے غاصبانہ طور پر مسلمانوں کی جائداد پر قبضہ کر لی تھیں ان کو حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے خلیفہ ہوتے ہی واپس کر دیا تھا جس سے ان کے تمام خاندان مخالف ہو گئے تھے۔ لیکن اس مخالفت نے ایک نہایت خطرناک سازش کی صورت اختیار کر لی۔ اور حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی اسی سازش کا نتیجہ تھا۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے بارہ لڑکے تھے لیکن مرنے کے بعد لڑکوں کے لئے کوئی ترکہ نہ چھوڑا جب موت کا وقت قریب آیا تو اپنے لڑکوں کو بلایا اور ان کو نصیحت فرمائی اے لڑکو! مجھ کو دو باتوں کا اختیار تھا ایک یہ کہ تم لوگ دولت مند ہو جاؤ اور میں جہنم میں داخل ہوں یا تم لوگ محتاج رہو اور

Marfat.com

میں جنت جاؤں لیکن یہ کہ تم لوگ محتاج رہو اور میں جنت میں جاؤں مجھ کو زیادہ عزیز ہے۔ خدا تم لوگوں کو محفوظ رکھے۔ اس کے بعد بیس دن تک بیمار رہے اور سنہ ۱۰۱ھ میں ۳۹ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ نے دو سال پانچ مہینے خلافت کی۔

جس طرح تاریک راتوں میں کبھی کبھی بجلی کی چمک دکھائی دیتی ہے اور جس طرح بے آب و گیاہ ریگستان میں کبھی کبھی نخلستان دکھائی دیتا ہے ٹھیک اسی طرح امت اسلمہ کی افراتفری اور بے عنوانیوں کے زمانے میں جب کہ باطل حق سے دست بگریباں ہوتا۔ بانت داری اور ایمانداری دنیا سے اٹھ چکی تھی یا اٹھی جا رہی تھی۔ امت مرحومہ نے ایک نئی کروٹ لی اور دنیا میں ایک ایسا شخص مرد بے باک حق کے لئے باطل کے ہر حربے سے مقابلہ کرنے والا پیدا ہوا۔ میری مراد اس خلیفہ بنو امیہ سے ہے جہاں ایک طرف یزید اور اس جیسے حق سے منہ موڑنے والے پیدا ہوئے تو دوسری طرف حضرت عمر ابن عبد العزیز دنیا کے لئے ایک نمونہ بن کر آئے۔

۱۰ فروری و مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

Marfat.com

افسانۂ محاضرات

عرب کی چند کنیزیں جنہوں نے نام پیدا کیا

خلیدہ مکیہ

خلیدہ مکیہ، ابن تماس کی کنیز تھی اور موسیقی کی ماہر جس مجلس میں گاتی حاضرین کو محو کر دیتی

ایک مرتبہ حضرت ہشام بن عروہ اس کی محفل میں شریک ہوئے۔ اور گانا سن کر کہا:

"خلیدہ! اپنے سینہ پر قل ہو اللہ اور معوذتین پڑھ لو کہیں نظر نہ لگ جائے!"

حضرت عثمانؓ کے پوتے کی محبت

زبیر بن شبہ کا بیان ہے کہ حضرت عثمانؓ کے پوتے محمد بن عبداللہ بن عمرو بن عثمان خلیدہ پر عاشق ہو گئے۔ جب اس کی فرقت میں بے قرار ہوئے تو اپنے آزاد کردہ غلام ابو عون کو اس کے پاس اپنا پیغام دے کر بھیجا۔

ابو عون نے دیکھا کہ خلیدہ بہت مہین کپڑے پہنے تھی جن سے ستر پوشی نہیں ہوتی۔ وہ ابو عون کو دیکھ کر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور معذرت کے ساتھ کہا:

"میں سمجھی تھی کہ میرے بے تکلفوں میں سے کوئی آیا ہوگا۔ اس لیے یہ کپڑے پہن کر تمہیں اندر بلوا لیا۔ تمہارے سامنے مجھے دوسرے قسم کے کپڑوں میں ہونا چاہیے۔ ٹھہرو میں ابھی کپڑے بدل کر آتی ہوں"

جب خلیدہ واپس آئی۔ تو ابو عون نے اس کو اپنے آقا کا پیغام یوں سنایا:

"مجھے میرے آقا نے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ میں تم کو ان کی طرف سے نکاح کا پیغام دوں۔ تم میرے آقا کی عزت و منزلت سے آگاہ ہو؟ میرے آقا وہ ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت حاصل ہے۔ جو خلیفۂ ثالث عثمان بن عفانؓ کے پوتے ہیں۔ جن کی امیر المومنین علی مرتضیٰ سے رشتہ داری ہے۔ اور جو موجودہ امیر المومنین کے چچا زاد بھائی ہیں۔ کیا تم ان کے نکاح کے پیغام کو قبول کرتی ہو؟"

خلیدہ نے اس پیغام کا معنی خیز جواب دیا۔ کہنے لگی تم نے اپنے آقا کا نسب حق بھر بیان کیا۔ اب میرا نسب بھی سن لو! میں ایک کافر کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ کفر کی حالت میں فروخت کیا گیا۔ زندگی بھر کافر رہا۔ اور غلامی کرتا رہا۔ اپنے آقا کے گھر سے بھاگ جانے کی اسے عادت تھی۔ وہ جب مرا تو اس کے پیروں میں بیڑیاں اور گلے میں طوق پڑا تھا!

Marfat.com

وہ میرا "عرفی باپ" تھا۔ میرے اصلی باپ کا حال صرف میری ماں ہی کو معلوم ہوگا۔ اس طرح میں حرام کاری کے نتیجہ میں آئی ہوں۔ میری ماں بھی آقا کے گھر سے بھاگ جاتی تھی۔ اور وہ بھی جب مری تو اپنے آقا کے گھر سے بھاگی ہوئی تھی! تم سے میں نے اپنی حقیقت بیان کر دی۔ اپنے آقا کو جا کر سنا دو۔ اگر اس کے بعد بھی وہ کھلے طور پر مجھ سے نکاح کرنے پر آمادہ ہوں، تو میں اُن کی بیوی ہوں۔ ورنہ وہ مجھ سے علانیہ ناجائز تعلقات قائم کریں۔ میں اس پر بھی راضی ہوں"

ابو عون نے جواب دیا "وہ حرام کاری کے قریب نہ جائیں گے!" عنیدہ نے کہا "پھر اُن کو فعل مباح یعنی علانیہ نکاح سے بھی شرمانا نہ چاہئے ——— لیکن اگر وہ مجھ سے خفیہ نکاح کرنا چاہتے ہوں! تو خدا کی قسم میں کبھی اس کے قریب نہ جاؤں گی۔ میں اس طریقہ کو گانے والیوں کے لیے عیب سمجھتی ہوں!"

ابو عون نے واپس جا کر اپنے آقا سے ساری گفتگو دہرائی، اُنہوں نے جوش میں کہا!

"بُرا ہو تیرا! کیا میں ایک گانے والی کو علانیہ اپنی بیوی بناؤں! جب کہ میرے نکاح میں طلحہؓ بن عبید اللہ جیسے شخص کی معزز لڑکی موجود ہے۔ نہیں، یہ کبھی ممکن نہیں!!"

ایک انوکھی آرزو

اس کے بعد اُنہوں نے ابو عون سے کہا "اس کے پاس پھر جاؤ۔ اب اُس سے صرف یہ کہہ دو کہ وہ کبھی کبھی میرے مکان کی طرف سے گزر جایا کرے تاکہ میں اُس کو ایک نظر دیکھ لیا کروں۔ شاید اسی سے تسکین ہوتی رہے!

ابو عون نے جا کر عنیدہ کو یہ پیغام سنایا۔ اس نے ہنس کر جواب دیا:

"ہاں، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ میں یہ کر سکتی ہوں۔ اُنہیں نگاہ شوق ڈال لینے سے منع نہیں کروں گی!"

(نہایۃ الارب ج ۵ ص ۶۱، ۶۲)

قلم صالحیہ

قلم، صالح بن عبد الوہاب کی کنیز تھی۔ اسی نسبت سے صالحیہ کہلائی۔ یہ بھی شہر مغنیات میں سے ہے اس نے فن موسیقی میں بیس راگ ایجاد کیے ہیں۔

خلیفہ واثق اور قلم صالحیہ

خلیفہ واثق کے سامنے محمد بن کناسہ کے چند شعر ایک خاص لحن میں گائے گئے۔ وہ لحن خلیفہ کو بہت پسند آیا! اس نے پوچھا "یہ کس کا لحن ہے؟" مغنی نے قلم صالحیہ کا نام بتایا۔ اس نے پھر پوچھا "یہ کون ہے؟" کہا گیا "یہ صالح بن عبد الوہاب کی کنیز ہے" پھر اس نے صالح کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا وہ بغداد ہی میں رہتا ہے۔

خلیفہ نے حاکم بغداد کو صالح اور اس کی کنیز کو دربار خلافت میں حاضر کرنے کا حکم دیا۔ اس نے ان دونوں کو دربار خلافت میں بھیج دیا۔

قلم نے دربار میں خلیفہ واثق کو اپنا گانا سنایا۔ یہ خلیفہ کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے کنیز کو خرید لینے کا ارادہ کیا۔ صالح سے اس کی قیمت دریافت کی۔ اس نے ایک لاکھ دینار اور صوبہ مصر کی ولایت کا مطالبہ کیا۔ یہ سن کر واثق بہت خفا ہوا اور اس کو دربار سے نکل جانے کا حکم دیا

اسی طرح خلیفہ واثق کے سامنے ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے مغنی زرزر نامی نے ایک نئے راگ میں گانا سنایا۔ اس نے گانے کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا یہ بھی قلم صالحیہ ہی کا راگ ہے۔ اس نے صالح اور قلم کو پھر بلوا بھیجا۔ دربار میں گانا ہوا اور واثق کو پسند آیا۔ محفل کے بعد اس نے صالح سے دریافت کیا!

"بتاؤ! تم اسے فروخت بھی کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟ اگر چاہتے ہو تو اس کی مناسب اور معقول قیمت بتاؤ۔"

صالح نے جواب دیا "امیر المومنین! اصل یہ ہے کہ میں اس کو جدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اگر حضور کو یہ اس قدر پسند ہے، تو نذر کرتا ہوں۔ میری طرف سے اس کی کوئی قیمت

کا مطالبہ نہیں ہے!

قلم خلیفہ واثق کے محل میں

خلیفہ واثق یہ جواب سُن کر بہت خوش ہوا۔ صالح کو پانچ ہزار دینار انعام دینے کا حکم دیا۔ اور قلم کو اپنے محل میں داخل کر لیا۔

اتفاق کی بات انعام کی وہ رقم بعض عمال نے ادھر ہی ادھر اڑا دی۔ اس کی خبر قلم صالحیہ کو ہوئی۔ اُس نے موقع پا کر خلیفہ واثق سے شکایت کی۔ واثق نے عمال کی سرزنش کی اور انعام کی رقم دوگنی کر کے دس ہزار دینار دینے کا حکم دیا۔

مقیم ہاشمیہ

مقیم بصرہ کی رہنے والی تھی۔ یہیں پیدا ہوئی۔ یہیں تعلیم و تربیت پائی۔ اور یہیں کے موسیقی کے اُستادوں سے گانا سیکھا۔

علی بن ہشام سے معاشقہ

خلیفہ مامون کا امیر قائد، علی بن ہشام مقیم پر عاشق ہوا۔ اور اس کو خرید لیا۔ علی بن ہشام بھی خوبصورت نوجوان تھا۔ مقیم کو بھی اس سے سچی محبت پیدا ہو گئی۔ اور دونوں کی زندگی لطف و مسرت سے گزرنے لگی۔ مقیم اسی نسبت سے ہاشمیہ کہلائی۔

علی بن ہشام کا قتل

خلیفہ مامون نے علی بن ہشام کو صوبہ آذربائیجان کا گورنر بنایا تھا۔ سوئے اتفاق سے وہ گورنری کے فرائض اچھی طرح انجام نہ دے سکا۔ دربارِ خلافت میں شکایتیں پہنچیں۔ خلیفہ نے اُسے معزول کر دیا۔ یہ علی بن ہشام کو ناگوار گزرا اس نے بغاوت کر دی، مگر گرفتار ہو گیا اور مامون نے اس کو ماہ جمادی الاولیٰ ۲۱۷ھ میں قتل کرا دیا

مقیم کا سوگ

مقیم کو علی کے قتل کا بڑا غم ہوا۔ اس نے اس کے سوگ میں اپنی ساری زندگی گزار دینے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ اسی کے مکان میں روپوش ہو کر بیٹھ گئی۔ کبھی باہر نہ نکلتی تھی۔ اگر کسی وقت نکلنے کی ضرورت پڑتی تو چہرے پر نقاب ڈال لیتی

مقیم کے سوگ منانے کی خبر مامون کے جانشین خلیفہ معتصم کو ہوئی علی بن ہشام اخانوادہ علویہ میں سے تھا۔ معتصم کا اس کے سوگ میں بیٹھنا ناگوار گزرا۔ اس کو دربار میں گانے کے لیے زبردستی بلوا بھیجا۔

جب وہ دربار میں حاضر ہوئی تو معتصم نے اس کو گانا سنانے کا حکم دیا۔ خلیفہ کے حکم سے سرتابی ممکن نہ تھی ناچار اس نے یہ گانا شروع کیا۔ وہ یہ اشعار گانے لگی!

ھل معین لبائی لعبارۃ او دھار؟

(کیا کوئی رونے میں میرا ساتھ آنسو یا خون سے دیگا؟)

وذاک شئی قلیل لسادتی النجار

(اگر میرے شریف آقاؤں کے غم میں یہ بھی بہت کم ہے)

خلیفہ معتصم نے روک کر کہا "ان شعروں کو چھوڑ دو کوئی دوسری چیز گاؤ"

اس پر مقیم نے یہ دوسرا قصیدہ شروع کیا

ذھبت عن الدنیا وقد ذھبت عنی....

(میں دنیا سے گیا گزرا اور دنیا مجھ سے......)

معتصم کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، جلدی سے اس نے پھر روکا اور کہا "اس کو بھی چھوڑ دو، کوئی دوسری چیز سناؤ"

اب مقیم نے اس شعر کو شروع کیا۔

اولئک قومی بعد عز و ثروۃ

تفانوا فالا تذرف العین اکمد

(وہ میری قوم ہے جو عزت و ثروت کے بعد فنا ہو گئی اگر آنکھیں اس پر نہ روئیں تو ان میں آشوب آجانا چاہیے)

اب معتصم پھوٹ کر رو دیا۔ اور بے بسی کے غصہ کے ساتھ کہا "خدا تجھے غارت کرے، ان معانی کا شعر نہ گا، کوئی دوسری چیز سنا"

اس پر مقیم نے یہ اشعار گانا شروع کیے۔

لاتا من الموت فی حل و فی حرم
ان المنایا یجبی کل انسان

(پناہ اور بے پناہی میں کہیں بھی موت سے بے خطر نہ ہو کیونکہ موت انسان کے دونوں پہلوؤں میں ہے)

اب معتصم کے ضبط سے باہر ہو گیا۔ اس نے چلا کر کہا خدا کی قسم میں خوب سمجھ رہا ہوں، تو ان شعار میں اپنے محبوب علی بن ہشام کا مرثیہ پڑھ رہی ہے۔ اگر ان شعروں سے تو نے مجھ کو مراد لیا ہوتا۔ تو میں تجھے ابھی قتل کرا دیتا۔ لیکن یہ جانتا ہوں کہ تو مجبور ہے۔ تو اس ہاشمی ہاشمی جو ان سے محبت کرتی تھی۔ اور اس کے سوگ میں زندگی گزار رہی ہے۔ بس یہاں سے فوراً نکل جا"

پھر خدام سے کہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو باہر نکال دیں۔

متیّم کے دل کی مراد بر آئی۔ اپنے محبوب آقا کے قاتوں کی مدح سے بچی۔ مگر ان کے دربار میں اپنے محبوب کا مرثیہ پڑھ آئی (رہنایۂ الادب)

دسمبر ۱۹۶۱ء

افسانۂ محاضرات

جمیلہ

قدیم عرب کی شہرۂ آفاق مغنیہ

از

سید ریاست علی ندوی

جمیلہ' عرب مغنیوں کی مسلّم استانی ہے۔ یہ کنیز تھی۔ اس کی شادی بنو حارث کے ایک آزاد کردہ غلام سے ہو گئی۔ شوہر سے اس کو بڑی محبت تھی۔

موسیقی کی تعلیم

مشہور عرب مغنی معبد کہتا ہے:-

"میں نے ایک مرتبہ جمیلہ سے اُس کے گانا سیکھنے کا واقعہ پوچھا تو کہنے لگی:-

"واللہ! مجھے دگانے کا الہام ہوا' نہ کسی نے مجھکو اس کی تعلیم دی۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ابو جعفر مغنی میرے پڑوس میں رہتا تھا۔ وہ اکثر اپنے گھر میں گاتا تھا اور میں اپنے گھر میں بیٹھی سنتی تھی۔ وہ عود بھی بجاتا تھا' مگر میں سمجھتی نہ تھی۔ سنتے سنتے میری زبان پر اُس کے گانے کے راگ چڑھ گئے اور میں بھی گنگنانے لگی۔ پھر انہی سروں کی طرح اپنی طبیعت سے چند نئے راگ میری زبان پر چڑھ گئے۔ اور میں کسی کسی وقت اُن راگوں میں گانے لگی۔ اتفاق سے ایک مرتبہ میرے آقا نے مجھے گاتے ہوئے سن لیا' دوسرے دن جب میں آہستہ آہستہ گا رہی تھی' وہ اچانک میرے قریب چلا آیا۔ اور مجھ سے کہا' جو کچھ تو مجھ سے چھپاتی ہے اُس کو میں نے جان لیا ہے! پھر اُس نے مجھے قسمیں دیں کہ اپنا گانا سناؤں۔ پہلے مجھے اُس کے سامنے گاتے ہوئے شرم آئی۔ جب اُس کا اصرار بڑھا تو میں نے ابی سلمیٰ کے دو شعر گا کر اُس کو سنائے۔ یہی میرا پہلا گانا تھا۔ اس کے بعد سارے جوار میں میرا گانا مشہور ہو گیا۔ لوگ دور دراز سے میرے پاس گانا سیکھنے کے لئے آنے لگے۔ اور میں لوگوں کو اپنے راگ سکھانے لگی۔ میرے راگ وہی نغمے جو تمہیں بھی میں نے سکھائے ہیں۔"

مختلف گویوں کے درمیان جمیلہ کا محاکمہ

جمیلہ کو قدرت کی طرف سے اُس زمانے کے تمام گانیوالوں پر برتری حاصل ہوئی۔ اس کے عہد کے سارے عرب مغنی اس کا احترام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مشہور عرب گویے ابن سریج' غریض' ابن مسجح' ابن محرز

Marfat.com

مدینہ منورہ آئے۔ ان لوگوں کا اجتماع مدینہ کے مشہور گویوں معبد اور ابن عائشہ کے ساتھ ہوا، اور آپس میں فن موسیقی پر گفتگو چھڑی پھر سب لوگ جمیلہ کے گھر آئے۔ اور اور جمیلہ کو حکم قرار دے کر ان میں سے ہر ایک نے اپنا گانا سنایا۔ جمیلہ نے اپنی رائے اس طرح دی کہ ہر ایک کے گانے کی اصل خصوصیت ظاہر ہو گئی۔ اور سب لوگوں نے اپنے اپنے متعلق اس کے فیصلہ کو خوشی سے قبول کیا۔ مورخین نے ان کے گانے اور ان پر جمیلہ کی رائیں مفصل درج کی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن جعفرؓ جمیلہ کے گھر پر

جمیلہ کا دستور تھا کہ اپنے گھر کے سوا کسی دوسری جگہ نہیں گاتی تھی۔ اور اس اصول کی پابندی کے لئے اس نے قسم کھا رکھی تھی۔ چنانچہ بڑے بڑے امراء اور حکام اسکے گھر ہی پر جاکر اس کا گانا سنتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالبؓ کو اس کا گانا سننے کا اشتیاق ہوا جمیلہ کو خبر ہوئی تو اس نے اپنی قسم توڑ کر ان کے مکان پر جاکر گانا سنانے کا قصد کیا۔ اور اپنی قسم کے توڑنے کا کفارہ ادا کر دینا چاہا۔ مگر حضرت عبداللہ نے جمیلہ کو اس ارادے سے باز رکھا اس کے مکان پر تشریف لاکر گانا سنا اور فرمایا:۔

"میں نے تم کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا"

جمیلہ کا سفر حج

زبیر ابن بکار اپنے چچا مصعب سے روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ جمیلہ حج کے لئے روانہ ہوئی۔ مدینہ کے معززوں، مغنیوں اور مطربوں کی بڑی تعداد اس کے ساتھ تھی۔ مدینہ کے معززین میں

ابن ابی عتیق، احوص، کثیر اور نصیب وغیرہ تھے۔ مغنیوں میں طویس، دلال، معبد، مالک بن ابی السمح، ابن عائشہ، نافع الخیر اور نافع بن طنبورہ تھے۔ اور گانے والی عورتوں میں فرہ، عزۃ المیلا، حبابہ، سلامۃ القس، خلیدہ، عقیلہ، شماسیہ، فرعہ، بلبلہ، لذۃ العیش، سعیدہ اور زرقا تھیں۔ ان کے علاوہ پچاس گانے والی کنیزیں خاص جمیلہ کے خرچ سے سفر کر رہی تھیں۔

مکہ معظمہ میں جمیلہ کا استقبال

جب حج کا یہ قافلہ مکہ معظمہ کے قریب پہنچا تو وہاں کے شرفاء اور مغنیوں نے مکہ سے باہر نکل کر اس کا استقبال کیا۔ ان میں سعید بن مسجع، ابن سریج، غریض، ابن محرز، عمر بن ابی ربیعہ اور حارث بن خالد مخزومی وغیرہم تھے۔ پھر مکہ میں داخل ہونے کے بعد ایک بڑا مجمع اس کی ملاقات کے لئے آیا۔

مکہ میں محفل منعقد کرنے کا منصوبہ

حج کے بعد باشندگان مکہ کی ایک جماعت جمیلہ کے پاس آئی۔ اور اس سے ایک مجلس منعقد کرنے کی اجازت چاہی۔ جمیلہ نے پوچھا:۔

"یہ مجلس گانے کے لئے ہوگی یا سماعِ حدیث کے لئے"؟

لوگوں نے جواب دیا "دونوں کے لئے"۔

جمیلہ نے جواب دیا:۔

"میں سنجیدگی اور کھیل کو ملانا نہیں چاہتی"۔

اس پر عمر بن ابی ربیعہ نے جوش سے مجمع میں پکار کر کہا:۔

"جس کو جمیلہ کا گانا سننے کا سچا شوق ہو وہ مدینہ کے سفر کے لئے تیار ہو جائے"!

چنانچہ جب جمیلہ حج سے فارغ ہو کر مکہ سے روانہ ہوئی تو ایک خلقت امنڈ کر اس کے ساتھ ہو گئی۔ یہ مجمع اس کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچا۔ مورخین کا بیان ہے کہ مدینہ میں ایسا مجمع کم دیکھنے میں آیا تھا۔

جب خلقت کا یہ اژدحام مدینہ پہنچا، تو مدینہ والوں نے اپنی روایتی مہمان نوازی کا ثبوت دیا۔ اپنے ان بھائیوں کے لئے اپنے مکانوں کے دروازے کھول دئے۔ جس کو جس خاندان نے بلایا تھا۔ وہ اس گھرانہ میں ٹھہر گیا۔

مدینہ منورہ میں گانے کی عظیم الشان محفل

دس دن گزرنے کے بعد گانے کی محفل منعقد ہوئی جلسہ کا آغاز جمیلہ کے گانے سے ہوا۔ اس نے عمر بن ابی ربیعہ کے ایک قصیدے کے آٹھ شعر گائے۔ گانے

Marfat.com

کے اثر کا یہ حال تھا کہ خود عمر بن ابی ربیعہ اس قدر رویا کہ آنسوؤں سے اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ اور کپڑے بھیگ گئے!

اس کے بعد جمیلہ، مغنیوں کو یکے بعد دیگرے نام بنام پکارتی گئی، اور ہر ایک اسٹیج پر آکر اپنے لحن میں اپنا گانا سناتا گیا۔ جمیلہ صدر نشیں کی حیثیت سے کبھی کبھی گانوں پر تنقید کرتی اور وہ تنقیدیں گویوں کو قبول ہوتیں۔

یہ محفل مسلسل تین دن تک برپا رہی۔ تقریباً پچاس مغنیوں اور مطربہ عورتوں نے اپنے اپنے فن کا کمال دکھایا۔ چند مغنیوں نے عود بجا کر سنائے۔ اور کچھ عورتوں نے ستار پر گانے سنائے۔

مورخین نے ان سب مغنیوں کے نام ان کے گائے ہوئے اشعار، مجمع پر ان کے اثر، جمیلہ کی تنقیدیں۔ اور بعض بعض موقعوں پر مجمع کے بعض افراد کی برجستہ رائیں پوری تفصیل سے لکھی ہیں۔ (نہایۃ الادب ج ۵ ص ۴۰ تا ۴۹)

ستمبر سنہ ۳۰ء

Marfat.com

افسانۂ محاضرات

سلامہ و حبابہ

دو عرب گانے والیاں جن کا اسلامی خلافت پر قبضہ تھا

از

سید ریاست علی ندوی

"سلامہ"

یزید بن عبدالملک حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بعد ۱۰۱ھ میں خلیفہ بنا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اموی سلطنت میں خلافت راشدہ کی مثال قائم کی تھی، مگر ان کا جانشیں یزید ان کے نقش قدم پر نہ چل سکا۔ تخت نشینی کے وقت یہ تیس پینتیس برس کا جوان تھا۔ اس کے دل میں عیش و نشاط کی آرزوئیں تھیں۔ خلیفہ ہوتے ہی کھل کھیلا۔

امویوں کے زمانہ میں عربوں میں موسیقی کا مذاق عام ہو گیا تھا۔ مشہور عرب گویّے اور گانے والیوں کے حالات تاریخ میں مذکور ہیں۔ یہ لوگ خلفاء کے درباروں اور امیروں کی مجلسوں کی رونق بڑھاتے۔ ان کی قدر کی جاتی۔ بڑے بڑے انعام پاتے۔ گانے والی کنیزیں بڑی قیمتوں پر فروخت ہوتیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں گانے والی عورتیں محل سے علیحدہ کر دی گئی تھیں، مگر یزید نے تخت خلافت پر بیٹھتے ہی عیش و طرب کی محفلیں پھر گرم کر دیں۔

یزید کو دو مشہور عرب گانے والیوں سلامہ اور حبابہ سے ولیعہدی کے زمانہ سے عشق تھا۔ تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد کہا کرتا تھا "میری آنکھیں تاج خلافت کو دیکھ کر اس وقت تک ٹھنڈی نہ ہوں گی، جب تک سلامہ و حبابہ جیسے دو نگین بھی اس میں نہ جڑ دیے جائیں۔"

سلامہ، مدینہ منورہ کی مشہور مطربہ تھی۔ یہ ایک کنیز کی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کو گانا سیکھنے کا شوق ہوا۔ مشہور عرب مغنیوں "معبد"، مالک بن ابی السمح، ابن عائشہ اور جمیلہ سے گانا سیکھا اور کمال پیدا کیا۔

سلامہ کا حسن اور گانا سارے عرب میں جلد مشہور

Marfat.com

ہو گیا۔ وہ، دور دور سے لوگ اس کا گانا سننے کے لئے آنے لگے۔ مشہور شعرائے عرب نے اُس کی تعریف میں قصیدے لکھے۔

سلامہ سے ایک زاہد پارسا کا عشق

عبدالرحمٰن بن ابی عمار، مکہ معظمہ کے ایک بڑے عابد و زاہد فقیہہ تھے۔ مدینہ میں اُن کا قیام تھا، اور یہاں کے علماء میں بلند مرتبہ سمجھے جاتے تھے۔ زہد و عبادت کی وجہ سے لوگ انہیں "القس" کہا کرتے تھے۔

ایک دن وہ سلامہ کے آقا کے مکان سے گذرے۔ اُس وقت سلامہ گا رہی تھی۔ اُن کے کانوں میں گانے کی آواز آئی اور بہت اچھی معلوم ہوئی۔ سننے کے لئے اُن کے قدم رک گئے۔ سلامہ کے مالک نے انکو کھڑا دیکھا تو گھر سے نکل آیا اور پوچھا کیا سلامہ کو دیکھنا اور گانا سننا چاہتے ہیں؟ انھوں نے انکار کیا۔ اُس نے کہا میں اُسے ایسی جگہ بٹھا دوں گا کہ دکھائی نہ دے گی اور آپ اس کا گانا سن سکیں۔ وہ اس پر آمادہ ہوگئے اور جی بھر کے گانا سنا۔ پھر ایک دن سلامہ کے آقا نے ان دونوں کا سامنا کرا دیا۔ نظریں ملتے ہی محبت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ بھی خوبصورت نوجوان تھے۔ اب اکثر ملاقاتیں ہوتیں اور یہ لطف و محبت سے گانا سنتے۔

لگاوٹ کی باتیں

ایک دن تنہائی کا موقع مل گیا۔ سلامہ نے لگاوٹ کی باتیں شروع کیں اور محبت کے برملا اظہار پر مجبور ہوئی۔

سلامہ ——— میں تم کو خدا کی قسم بہت چاہتی ہوں۔

ابن ابی العمار ——— واللہ الذی لا الٰہ الا ھو! میں بھی تمھیں دل و جان سے پیار کرتا ہوں!

سلامہ ——— تمہیں گلے لگا کر پیار کرنے کو بہت دل چاہتا ہے۔

ابن ابی عمار ——— واللہ میری بھی یہی آرزو ہے!

سلامہ ——— دل چاہتا ہے کہ تمہیں آغوش میں لے کر لیٹ جاؤں!

ابن ابی عمار ——— میں بھی یہی چاہتا ہوں!

سلامہ ——— پھر روک کیا ہے؟ اس وقت تنہائی ہے۔ گھر خالی ہے!

ابن ابی عمار ——— مجھے خدا کا یہ فرمان روک رہا ہے:

اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ!

(قیامت کے دن دوست باہم دشمن ہونگے۔ بجز اُن کے جو پرہیزگار ہیں) لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ قیامت کے دن میری تمہاری محبت عداوت پیدا کر دے۔

پھر ابن عمار اٹھ کر چلے گئے اور کبھی سلامہ سے نہیں ملے۔ اپنی پچھلی زاہدانہ زندگی اختیار کر لی۔ مگر ابن عمار اور سلامہ کی داستانِ عشق مدینہ کے بچہ بچہ کی زبان پر تھی۔ اور اس کی محبت کی یادگار آج تک یہ قائم ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی عمار کا لقب "القس" سلامہ کا بھی لقب قرار پا گیا ہے۔ آج تک "سلامۃ القس" کہلاتی ہے!

گانیوالیوں کو مدینہ سے جلاوطنی کا حکم

۹۲ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک نے عثمان بن حیان مُرّی کو مدینہ منورہ کا گورنر بنا کر بھیجا۔ وہ جب یہاں پہنچا تو شہر کے معززین نے آکر کہا: "آپ مدینہ کے والی ایسے زمانہ میں بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ جب یہاں برائیاں پھیل گئی ہیں۔ اگر آپ اس مقدس شہر کی اصلاح فرمانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے اس شہر کو غنا اور زنا کی نجاستوں سے پاک کریں۔"

عثمان بن حیان مدینہ کی یہ حالت سن کر سخت رنجیدہ ہوا۔ اُس نے ارادہ کر لیا کہ شہر سے یہ برائیاں دور کرکے رہیگا۔ چنانچہ اسی وقت منادی کرائی کہ تمام گانے والیاں شہر سے تین دن کے اندر نکل جائیں۔

ایک ندیم شہر نشین کی شاطرانہ چال

حاکم شہر کے اس حکم سے پیشہ ور طبقہ میں کھلبلی پڑ گئی۔ ان لوگوں نے دوڑ دھوپ شروع کی کہ کسی طرح جلاوطنی کا حکم منسوخ کرائیں۔ شہر کے معززین میں ایک شخص ابن

ابی عتیق تھا۔ یہ اگرچہ نیکوکاروں میں شمار کیا جاتا تھا، مگر در پردہ رندانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ سلامہ سے اس کے خاص تعلقات تھے۔ جس وقت جلاوطنی کا حکم نکلا، یہ مدینہ میں موجود نہ تھا۔ اس خبر کو سن کر بھاگا ہوا مدینہ واپس آیا اور سیدھا سلامہ کے گھر پہنچا۔ تین دن کی مہلت میں سے صرف ایک رات باقی رہ گئی تھی۔ سلامہ سے گفتگو کر کے اور اسے تسلی و تشفی دے کر وہ اسی وقت گورنر کے محل کو روانہ ہو گیا۔

گورنر کے سامنے اس نے گانے والیوں کے اخراج کے حکم کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی اور باتوں باتوں میں کہہ گیا۔

ابن ابی عتیق —— مجھے امید ہے کہ اگر کوئی کام اس سے بھی بہتر ہو تو آپ کو اس کے کرنے میں تامل نہ ہوگا۔

گورنر —— مگر میں نے تو یہ حکم آپ ہی کے ساتھیوں کے اشارے سے صادر کیا ہے۔

ابن ابی عتیق —— نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ اس حکم کے مناسب ہونے میں کیا شبہ ہے۔ البتہ کسی ایسی عورت کے متعلق کیا ارشاد ہوگا، جس کا پیشہ اگرچہ گانا بجانا رہا ہے، مگر اب وہ دل سے اس کو ناپسند کرتی ہے۔ توبہ کر کے روزہ نماز کی پابند ہو گئی ہے۔ نیکی کے کام انجام دیتی ہے؟ میں آپ کی خدمت میں ایک اسی طرح کی عورت کا پیام لایا ہوں۔ وہ عرض کرتی ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار سے علیحدہ نہ کیا جائے"!

گورنر —— میں آپ کی سفارش سے اس عورت کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دوں گا۔

ابن ابی عتیق —— لیکن آپ اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ڈالیں۔ ممکن ہے کل دوسرے لوگ آپ کی خدمت میں آ کر اس کے علاوہ کچھ بیان کریں۔ اس لئے مناسب ہے کہ میں اس عورت کو آپ کی خدمت میں بھیج دوں۔ آپ براہ راست اس سے گفتگو فرما لیں۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنی رائے پر قائم رہیں تو حکم صادر فرمائیں۔

گورنر —— "اچھی بات ہے"۔

سلامہ گورنر مدینہ کے محل میں

اس کے بعد ابن ابی عتیق، گورنر سے رخصت ہو کر سلامہ کے پاس آیا۔ اور گورنر سے اپنی گفتگو کا حال بتایا۔ چنانچہ سلامہ نے زاہدانہ لباس پہن کر ہاتھ میں تسبیح لی اور آنکھیں جھکائے، مسکین صورت بنائے گورنر کے سامنے پہونچی۔ ابن ابی عتیق نے تعارف کرایا۔ سلامہ نے گورنر سے بہت عالمانہ و عاقلانہ گفتگو کی۔

جب ابن ابی عتیق نے دیکھا کہ گورنر نہایت متاثر و خوش ہوا ہے تو سلامہ سے کہا "امیر کو کچھ قرآن سناؤ" سلامہ نے بڑی خوش الحانی سے چند آیتیں تلاوت کیں۔ پھر فرمائش کی "کچھ حدی خوانی کرو" سلامہ نے حدی کے چند شعر پڑھے۔ اس طرح ابن ابی عتیق سلامہ کو زینہ بہ زینہ لاتے ہوئے گانے پر اتار لایا۔ گورنر پہلے ہی راگ پر اس قدر بے خود ہو گیا کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر سلامہ کے پہلو میں آ بیٹھا۔ سلامہ دیر تک گاتی رہی اور گورنر مست ہو کر سنتا رہا۔ آخر میں ابن ابی عتیق نے آواز دی "سلامہ دل کھول کر گا، آج کی شب تیرا مدینہ میں آخری گانا ہے" لیکن گورنر نے فوراً جواب دیا:۔

"نہیں واللہ! ایسی چیز مدینے سے باہر نہیں کی جا سکتی!"

ابن ابی عتیق نے کہا "لیکن لوگ کیا کہیں گے کہ گورنر نے سلامہ کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دے دی، اور دوسروں کو نکال دیا"

گورنر نے جواب دیا "اچھا تو سب رہیں گے کوئی باہر نہ جا"

سلامہ خلیفہ کے محل میں

سلامہ مدینہ میں رہتی رہی۔ یزید بن عبدالملک کی نگاہ انتخاب اس پر پہلے ہی پڑ چکی تھی۔ جب خلیفہ بنا تو بیس ہزار درہم میں اس کو خرید لیا

جس وقت سلامہ مدینے سے دمشق جانے لگی تو اسے رخصت کرنے کے لئے بہت بڑا مجمع اکٹھا ہوا۔ اس نے رخصت کے چند موثر اشعار خود پڑھ کر گائے۔ لوگ اس قدر روئے کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ وہ خود بھی رخصت کے درد انگیز منظر سے بہت متاثر تھی۔ بادیدۂ پرنم

Marfat.com

روانہ ہوئی۔ لوگ دور تک مشایعت کے لئے آئے۔ دمشق پہنچ کر خلیفہ یزید کے محل میں داخل ہو گئی۔

حبابہ

حبابہ کا نام پہلے عالیہ تھا۔ یہ ایک گی خاندان کی خوبصورت کنیز تھی۔ آواز بہت شیریں اور گانا بہت اچھا جانتی تھی۔ عود بجانے میں کمال حاصل تھا۔

خلیفہ یزید بن عبدالملک ولیعہدی کے زمانہ میں اس پر بھی عاشق ہوا۔ یزید کی شادی دو معزز گھرانوں کی لڑکیوں سے ہونے والی تھی۔ چنانچہ وہ خلیفہ سلمان بن عبدالملک کے زمانہ میں شادی کرنے کے لئے مدینہ آیا۔ اور سعدہ بنت عبداللہ بن عمرو بن عثمان اور ربیحہ بنت عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب سے بیس بیس ہزار دینار پر اُس کا عقد ہوا۔ اُسی وقت اُس نے چار ہزار دینار میں عالیہ (حبابہ) کو خرید لیا۔ اس واقعہ کی خبر جب خلیفہ سلمان بن عبدالملک کو ہوئی تو سخت برہم ہوا۔ اس حرکت کو ہاشمی اور اموی خاندانوں کی توہین پر محمول کیا۔ یزید کو ڈانٹ کر خط لکھا۔ یزید نے مجبوراً کنیز اُس کے آقا کے پاس بھیج دی۔ اس کے بعد اس کو مصر یا افریقہ کے کسی شخص نے خرید لیا۔

یزید کو عالیہ کی جدائی کا بڑا غم ہوا مگر بے بس تھا۔ کچھ نہ کر سکا۔ تخت خلافت پر بیٹھنے کے بعد بھی اُسے خریدنے کی جرأت نہ پڑی کیونکہ اپنی دونوں بیویوں سُعدہ اور ربیحہ کے ملال کا اندیشہ تھا۔ مگر اس کی اس خواہش سے دونوں بیویاں اچھی طرح واقف تھیں۔ ایک مرتبہ سُعدہ نے کسی بات پر اس سے پوچھا "تمہاری کوئی خواہش ایسی بھی ہے جو پوری نہ ہوئی ہو؟"

یزید نے جواب دیا "ہاں! عالیہ کی آرزو باقی ہے" بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد سُعدہ نے پھر وہی سوال کیا۔ یزید نے پھر عالیہ کی آرزو ظاہر کی۔

سُعدہ نے کہا "اگر اُسے دیکھو گے تو پہچان لو گے؟" یہ کہہ کر اُس نے پردہ اُٹھایا۔

یزید حیرت سے منہ تکنے لگا کیونکہ عالیہ سامنے کھڑی تھی!

یزید بہت خوش ہوا اور کنیز کا نام بدل کر "حبابہ" رکھ دیا۔

سلامہ اور حبابہ کی باہمی رقابت

یزید کو اگرچہ سلامہ سے بھی محبت تھی۔ مگر حبابہ کی قدر زیادہ کرتا تھا۔ یہ بات سلامہ کو سخت ناگوار تھی خصوصاً اس لئے کہ یہ دونوں "جمیلہ" کی شاگرد تھیں اور جمیلہ نے گانے کی مشق کرانے کے لئے حبابہ کو سلامہ کے سپرد کر دیا تھا۔

ایک مرتبہ سلامہ نے حبابہ کو اپنے گانا سکھانے کا واقعہ یاد دلایا اور کہا کہ اس کا کچھ تو حق ہونا چاہئے۔ حبابہ نے اس کا اعتراف کیا اور وعدہ کیا کہ آئندہ اس کا کوئی قابل شکایت طرزِ عمل نہ ہو گا۔

ایک مرتبہ یزید کے سامنے یہ دونوں سوکنیں بیٹھی تھیں۔ یزید نے کہا "اس وقت تم دونوں میں سے جو کوئی میرے دل پسند گانا سنا سکے، اس کی ہر خواہش پوری کروں گا۔" پہلے سلامہ نے چند شعر گائے۔ مگر یزید کو پسند نہ آئے۔ پھر حبابہ نے اپنے چند شعر گائے۔ وہ یزید کو بہت پسند آئے۔ اُس نے کہا "جو چاہو مجھ سے طلب کرو" حبابہ نے کہا "مجھے سلامہ اور اُس کی تمام چیزیں دے دی جائیں"۔ یزید یہ خواہش سن کر سخت پریشان ہوا اور کہنے لگا کوئی دوسری چیز مانگو" حبابہ نے کہا "نہیں! میں سلامہ ہی کو لوں گی" یزید قول ہار چکا تھا ناچار سلامہ کو اُس کے حوالہ کر دیا۔

اس واقعہ سے سلامہ کے دل و جگر پاش پاش ہو گئے۔

یزید کو بھی بہت رنج ہوا۔ اُس نے حبابہ سے کہا کہ جس قیمت پر چاہتے، سلامہ کو اس کے ہاتھ فروخت کر دے۔ مگر حبابہ نے انکار کیا اور کہنے لگی :-

"آپ گواہ رہئے کہ سلامہ آزاد ہے۔ میں اُس کی مالک تھی اور میں نے اُسے آزاد کر دیا۔ اب میں آزاد سلامہ کے نکاح کا پیغام اپنے آقا کو دیتی ہوں!

یزید نے نکاح قبول کیا۔ اب سلامہ نکاحی بیوی بن گئی۔ اس طرح شریف دل کنیز حبابہ نے اپنی سوکن سلامہ کی برتری مستقل طور پر قبول کر لی۔

Marfat.com

حبابہ کی حیرت انگیز موت

حبابہ کی موت کا واقعہ بہت حسرت انگیز ہے - ابن اثیر اور نوی کا بیان:

خلیفہ یزید بن عبدالملک شام کے ایک گاؤں میں اترا - حبابہ ساتھ تھی - یزید مصاحبوں کے ساتھ بیٹھا تھا - کہنے لگا "لوگوں کا خیال ہے کہ کسی آدمی کا کوئی پورا دن خوشی میں نہیں گذر سکتا - دل کو کوئی رنج ضرور پہنچتا ہے - میں اس قول کو آزمانا چاہتا ہوں - دیکھو - کل طلوع آفتاب کے بعد سے مجکو کسی قسم کی کوئی خبر نہ سنائی جائے - اور نہ حکومت کا کوئی کاغذ پیش کیا جائے"!

چنانچہ دوسرے دن یزید صرف حبابہ کو ساتھ لے کر عیش و عشرت میں مصروف ہو گیا - خوشی کا یہ دن تیزی سے گذرنے لگا - شام کے وقت دونوں ٹہلتے ہوئے باغ میں نکل گئے - انگور کی بیلوں کے پاس سے گذرے - یزید نے انگور کا ایک دانہ توڑ کر حبابہ کے اوپر ہنسی سے پھینکا - وہ دانہ اس کے حلق میں جلکر اٹک گیا - اس سے اسکو اس قدر تکلیف ہوئی کہ انگور کا یہی دانہ اس کا جان لیوا بنا - اس کو زور کی ایک چھینک آئی اور آنکھیں پھٹ گئیں - چند ہی لمحوں میں تڑپ کر جان دے دی -

یزید حبابہ کی موت کا غم برداشت نہ کر سکا - دل و دماغ بے قابو ہو گئے - اس کی لاش کو تین دن روکے رکھا - لاش سے لپٹ لپٹ کر پیار کرتا - کبھی سونگھتا - کبھی زبان سے چاٹتا - جب لاش سڑنے لگی اور اس میں بدبو پیدا ہو گئی، تو مسلمہ بن عبدالملک وغیرہ نے سمجھا بجھا کر لاش دفن کرائی - جنازہ کے ساتھ یزید بھی گیا - نماز جنازہ مسلمہ نے پڑھائی - یزید بالکل خاموش رہا - جب مٹی دی جانے لگی تو قبر کو مخاطب کرکے دو شعر پڑھے -

دفن کے بعد گھر لوٹ آیا - سات دن تک باہر نہیں نکلا - ساتویں دن نکلا تو پھر وہی جنون سوار تھا - حکم دیا کہ قبر کھودی جائے - حکم کی تعمیل ہوئی - چہرہ بگڑ چکا تھا - دیکھتے ہی پیار کرنے کے لئے آگے بڑھا - مسلمہ نے پھر سمجھایا کہ چہرہ بگڑ چکا ہے اس کو دفن کر دو مگر اس نے کہا کہ "حبابہ آج سے زیادہ کبھی خوبصورت نہ تھی" لوگوں نے لاش پھر زبردستی دفن کر دی

یزید کے دل پر اس غم کا ایسا گہرا اثر پڑا کہ اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا - حبابہ کے مرنے کے پندرھویں یا چالیسویں دن اس نے بھی اس کی جدائی کے غم میں ۲۵ شعبان ۱۰۵ھ کو وفات پائی - (ابن اثیر حوادث ۱۰۵ھ)

جولائی [illegible]

مسلمان سلاطین و امراء کے اخلاق پر ایک نظر

(تاریخ اخلاق اسلام کا ایک باب)

از
مولانا عبدالسلام ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ

مسلمان سلاطین و امرا کا گروہ اخلاقی محاسن و معائب دونوں کا مجموعہ ہے، ان کے اخلاقی معائب یہ ہیں۔

(۱) سب سے پہلی چیز جو نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ عیش پرستی ہے۔ جس کی ابتداء دور بنو امیہ سے ہوئی اور عباسی دور میں اس نے بہت زیادہ ترقی کی اور اس کے بعد وہ سلاطین و امرا کا عام شعار بن گئی، کیونکہ یہ عیش پرستی ایرانی تمدن کا قدرتی نتیجہ تھی۔ اور یہ تمدن زمانہ مابعد میں بھی قائم رہا۔ چنانچہ ابن خلدون مقدمہ تاریخ میں لکھتا ہے کہ "ایرانی تمدن بنو امیہ اور بنو عباس میں منتقل ہوا اور بنو امیہ نے اندلس میں جو تمدن قائم کیا وہ سلاطین مغرب یعنی موحدین اور اس زمانے کے زناتہ میں منتقل ہوا اور بنو عباس کا تمدن درجہ بدرجہ پہلے دیلمیوں میں، پھر ترکوں میں، پھر سلجوقیوں میں، پھر مصر کے ترک مملوں میں اور عراقین کے تاتاریوں میں منتقل ہوتا رہا"[1] اس لئے خلفائے عباسیہ اور خلفائے بنو امیہ کے بعد جو سلاطین و امرا ہوئے انہوں نے بھی اس معاملے میں ان کی تقلید کی اور عیش پرستی کی تمام صورتیں قائم ہو گئیں۔ چنانچہ مستند تاریخوں اور تذکروں میں اس قسم کے جو دلچسپ واقعات مذکور ہیں۔ ہم ان کو اس موقع پر درج کرتے ہیں۔

معتضد باللہ جو اندلس کا فرمانروا تھا۔ عورتوں کا نہایت شیدائی تھا اور بہت سی عورتوں کے ساتھ جو مختلف قوموں سے تعلق رکھتی تھیں نکاح کیا تھا۔ ابن خلکان نے لکھا ہے۔

اس معاملے میں وہ جس حد تک پہنچ گیا تھا
اس کا کوئی ہمسر وہاں تک نہ پہنچ سکا[2]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۱۴۵ [2] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۲۸۔

Marfat.com

ابو طاہر محمد بن بقیہ عزالدولہ کا وزیر تھا۔ اور اس کے یہاں ہر مہینے میں ہزار من موم بتی صرف ہوتی تھی۔ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ جب موم بتی کا اسقدر خرچ تھا جس کی ضرورت کم پڑتی ہے، تو اور ضروری چیزوں کا خرچ کس قدر رہا ہوگا[1]

ملک اشرف مظفرالدین نہایت عیش پرست بادشاہ تھا۔ ایک دن بزم طرب میں کسی باجے کی آواز سنکر اسقدر مسرور ہوا کہ باجا بجانے والے سے کہا کہ "مجھ سے کوئی خواہش کرو" اوس نے کہا کہ "مجھے شہر خلاط عنایت فرمایئے"۔ اوس نے وہ شہر اوسکو دیدیا۔ اور وہ اوس شہر کے گورنر کے پاس آیا اور اوس شہر کے حوالہ کرنے کی درخواست کی، بالآخر اوس نے بہت سا مال دیکر اوس سے مصالحت کر لی۔

دمشق کے باہر اوس نے ایک محل تعمیر کردایا تھا جس میں عیش پرستی کے گوناگوں سامان جمع کئے تھے۔ اور اوس میں اسقدر فسق و فجور ہوتا تھا جو بیان میں نہیں آسکتا۔ لوگوں نے اوسکو سمجھایا کہ مسلمانوں کے ملک میں اس قسم کے مکان کا رہنا مناسب نہیں۔ اس لئے اوس نے اس کو گرا کر اوس جگہ ایک مسجد تعمیر کردادی جسکا نام لوگوں نے جامع التوبہ رکھا کہ یہ اوسکی توبہ کی ایک یادگار تھی[2]

ابو الفتوح بلکین بن زیری کے محل میں چار سو کنیزیں تھیں۔ یہاں تک کہ ایک دن اوسکو سترہ بچوں کے پیدا ہونے کی خوشخبری سنائی گئی[3]۔ شمس الدولہ توران شاہ سلطان صلاح الدین کا بھائی تھا۔ جس نے یمن کو فتح کیا تھا۔ اور وہاں اُس کا بڑا اقتدار قائم ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ اوس نے شام میں نشو و نما پائی تھی۔ جہاں عیش پرستی کے تمام سامان میسر تھے۔ اس لئے وہ یمن جیسے خشک اور بنجر ملک میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس غرض سے اوس نے سلطان صلاح الدین کو ایک خط لکھا اور شام میں واپس آنے کی اجازت طلب کی، لیکن سلطان صلاح الدین نے ایک قاصد کے ذریعہ سے اوسکو یہ پیغام دیا۔ کہ یمن نہایت زرخیز اور وسیع ملک ہے، اوس کا چھوڑنا مناسب نہیں۔ اوس نے اس پیغام کو سنا تو خزانچی سے ہزار درہم طلب کئے، اور مہتمم خانہ کو حکم دیا کہ اس سے بازار سے برف کا ایک ٹکڑا منگائے۔ اوس نے کہا "عجبا یمن میں برف کہاں؟"۔ بولا "تو کشمش کی ایک ٹوکری ہی خرید لی جائے" اوس نے کہا کہ یہ بھی یہاں نہیں مل سکتی" غرض وہ دمشق کے تمام میوہ جات کا نام لیتا جاتا تھا اور وہ تعجب سے کہتا تھا کہ یہ میوے یہاں کہاں مل سکتے ہیں؟۔ آخر میں اوس نے قاصد سے کہا کہ "آخر میں اس مال و دولت کو لیکر کیا کروں؟ جب میں اوس سے لطف اندوز ہی نہیں ہو سکتا مال بذات خود نہیں کھایا جاتا بلکہ اوس کا فائدہ صرف یہ ہے کہ انسان اوسکو اپنے اغراض و مقاصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ بنائے" قاصد نے صلاح الدین کو اس کی خبر دی تو اوس نے اوسکو دمشق میں واپس آنے کی اجازت دیدی[4]

وزیر ابوالحسن بن فرات کے گھر میں دو باورچی خانے تھے۔ ایک باورچی خانہ خاص جس میں اسقدر بکریوں اور جانوروں کا گوشت صرف ہوتا تھا کہ اون کا شمار نہیں ہو سکتا۔ دوسرا باورچی خانہ عام جس میں غلاموں اور دربانوں وغیرہ کا کھانا پکتا تھا۔ اور اوس میں روزانہ نوے بکریوں، تین دنبوں، دو سو مرغیوں، دو سو تیتروں اور دو سو چوزوں کا گوشت صرف ہوتا تھا۔ باورچی رات دن میدے کی روٹیاں پکایا کرتے تھے، بہت سے لوگ برابر مٹھائیاں تیار کیا کرتے تھے، برف کا پانی ہر شخص کو پلایا جاتا تھا۔

خدام صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے ہاتھ میں سکنجبین یا گلاب کا پیالہ، پانی کا کوزہ اور صاف ستھرے رومال لئے ہوئے گھوما کرتے تھے اور تمام لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے[5]۔ اسی وزیر کے یہاں روزانہ چند مخصوص لوگ کھانے پر بلائے جاتے تھے۔ اور جب سے پہلے ہر ایک کے سامنے ایک ایک طبق رکھا جاتا تھا جس میں اوس وقت کے تمام بہترین میوے ہوتے تھے۔ پھر بیچ میں اسی قسم کا ایک بڑا طبق رکھا جاتا تھا۔ اور ہر طبق میں ایک چھری اور اوس کے ساتھ شیشے کا ایک طشت ہوتا تھا۔ لوگ چھری سے میوے کاٹ کاٹ کر کھاتے جاتے تھے۔ اور چھلکوں کو شیشے کے طشت میں پھینکتے جاتے تھے۔ جب اس سے فارغ ہوجاتے تھے تو طبق اُٹھائے جاتے تھے۔ اور ہاتھ دھونے کے لئے طشت اور لوٹے لائے جاتے تھے۔ اس کے بعد خوان میں کھانا لایا جاتا تھا۔ جو عمدہ کپڑوں اور سرپوشوں سے ڈھکا رہتا تھا۔ اسکے

---

[1] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۳۱۴ [2] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۱۴۱ [3] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۹۳ [4] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۹۹ - ۱۰۰-
[5] کتاب الوزراء للصابی صفحہ ۱۹۵-

نیچے دسترخوان ہوتا تھا اور اوس کے گرد ہاتھ پونچھنے کے لئے رومال رکھے رہتے تھے۔ خوان رکھا جاتا تھا تو سرپوش وغیرہ اٹھائے جاتے تھے اور لوگ کھانا کھانا شروع کرتے تھے۔ اور ابوالحسن بن فرات اون کے ساتھ دلچسپ باتیں کرتا رہتا تھا۔ اس طرح مختلف قسم کے کھانوں کے رکھنے اور اٹھانے میں دو گھنٹے سے زائد صرف ہو جاتے تھے[1]

مختلف قسم کے جانوروں، درندوں اور پرندوں کا پالنا بھی اسی عیش پرستی کے سلسلے میں داخل ہے۔ جس کی ابتدا یزید بن معاویہ نے کی اور بعد کو دوسرے سلاطین وامرا نے اس کی تقلید کی۔

ان جانوروں اور پرندوں کے پالنے کا مقصد

(۱) ایک مقصد تو شکار ہوتا تھا، اور یزید نے اس غرض سے جو کتے پال رکھے تھے، اون کو سونے کے کنگن پہناتا تھا۔ اور سنہرے کام کی جھولیں اوڑھاتا تھا۔ اور ہر کتے کی خدمت کیلئے ایک ایک خادم مقرر کیا تھا۔

(۲) دوسرا مقصد ان جانوروں کا باہم لڑانا اور اون کا تماشا دیکھنا تھا۔

اس کے علاوہ مختلف قسم کے عجیب وغریب جانوروں کا جمع کرنا اور اُن کے طبائع اور اخلاق وعادات اور حرکات وسکنات کا مشاہدہ کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ تھا۔ اس غرض سے سلاطین وامرا کا یہ دلچسپ مشغلہ ہو گیا۔ اور اس میں یزید بن معاویہ، سلطان مسعود بن سلجوقی، خلیفہ ناصر اموی، خمارویہ ابن طولون، وزیر جعفر بن فضل بن فرات، خلیفہ عزیز باللہ۔ اکبر اور جہانگیر نے خاص ناموری حاصل کی۔ اور ان کے جمع کرنے اور پرورش کرنے میں بیدریغ روپیہ صرف کیا۔ لیکن ان کے متعلق تاریخوں میں جو دلچسپ واقعات مذکور ہیں۔ ہم ان کو بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ ایک اخلاقی مسئلہ تھا جو مختلف اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل اصلاح تھا۔

(۱) ایک تو یہ کہ جانوروں کے ساتھ یہ ایک بیرحمی ہے۔ جو شرعاً جائز نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن التحريش بين البهائم[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم جانوروں کے لڑانے کی ممانعت فرمائی۔

اور شارح حدیث نے لکھا ہے کہ اس ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس سے بلاضرورت جانوروں کو جسمانی تکلیف پہونچتی اور خلیفہ مہتدی باللہ نے اسی نقطۂ نظر سے جب دور عباسیہ کی عیاشانہ زندگی کی اصلاح کرنی چاہی تو تمام لڑانے والے جانوروں کو قتل کرا دیا۔

(۲) یہ لہو ولعب کی ایک قسم ہے جس کی حدیث میں ممانعت ہے۔

ان رسول الله صلى الله عليه وسلم راى رجلا يتبع حمامة فقال شيطان يتبع شيطانة[3]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ ایک کبوتر کا پیچھا کر رہا ہے تو فرمایا کہ شیطان چڑیل کا پیچھا کر رہا ہے۔

(۳) جانوروں اور پرندوں کے لڑانے اور اوڑانے پر بازی لگائی جاتی جو قمار بازی ہے۔ اور صحابہ نے اس قسم کی بازی لگانے سے لوگوں کو روکا ہے[4]۔ ان مفاسد کے علاوہ پرندوں کا پالنا شرعاً جائز ہے۔ اور صحابہ عام طور پر پنجروں میں چڑیوں کو پلتے تھے[5]۔

عیش پرستی کی اور بھی بہت سی صورتیں تھیں جن میں سلاطین وامرا کا گروہ مبتلا تھا۔ ہم نے بطور نمونہ ومثال کے صرف چند واقعات درج کئے ہیں۔ ورنہ ہر دور میں مسلمان سلاطین وامراء کے حالات میں ان کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ لیکن ان میں کچھ لوگ ایسے بھی گذرے ہیں جنہوں نے سخت زاہدانہ زندگی بسر کی۔ اور مسلمانوں پر نہایت شدید اخلاقی اثر ڈالا ہے۔ چنانچہ اس حیثیت سے اسلام کی اخلاقی تاریخ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز اور خلیفہ مہتدی باللہ کا نام نہایت روشن ہے۔ اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد نام ملتے ہیں۔ مثلاً ابوالعباس احمد بن ہارون رشید سبتی کے حال میں ابن خلکان نے لکھا ہے کہ وہ نہایت صالح آدمی تھا۔ اپنے باپ ہی کی زندگی میں دنیا کو چھوڑ دیا تھا۔ اور دنیوی امور میں کسی چیز سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ حالانکہ وہ صاحب مقدرت تھا اور اوس کا باپ

---

[1] کتاب الوزراء للصابی صفحہ ۲۴۴ ۔ [2] ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی التحریش بین البہائم [3] ابوداؤد کتاب الادب باب فی اللعب بالحمام ۔ [4] ادب المفرد باب قمار الدیک وقمار الحمام [5] ادب المفرد الطیر فی القفص ۔

Marfat.com

دنیا کا خلیفہ تھا۔ اوس کو سبتی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ سبت یعنی سنیچر کے دن اپنے ہاتھ سے کچھ کما لیا کرتا تھا۔ اور اُسی کو ہفتے بھر صرف کرتا تھا۔[۱ھ]

ابو یعقوب یوسف بن تاشفین جو ملثمین کا بادشاہ تھا نہایت معتدل اور سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک بار وہ اشبیلیہ میں خلیفہ کا مہمان ہوا۔ جس کے محلات نہایت شاندار تھے، اور اُن میں کھانے، پینے، پہننے اور بچھانے کے گوناگوں سامان مہیا کئے گئے تھے۔ معتمد نے اوس کو اپنی محلوں میں سے ایک محل میں ٹھہرایا اور شاہانہ طریقے سے اوسکی مہمانداری کی۔ ابن تاشفین کے رفقا نے یہ ساز و سامان دیکھے تو اُس کو بھڑکایا کہ وہ بھی اسی طریقے سے زندگی بسر کرے۔ کیونکہ سلطنت کا فائدہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ عیش و طرب کے ساتھ زندگی بسر کی جائے۔ جیسا کہ معتمد اور اوس کے رفقا بسر کر رہے ہیں۔ لیکن اُس نے سختی کے ساتھ ان لوگوں کو سرزنش کی اور کہا کہ معتمد کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقبوضہ ملک کو ہاتھ سے کھو دیگا۔ کیونکہ جس مال سے وہ اس قسم کی عیاشانہ و مسرفانہ زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ لوگوں سے منصفانہ طریقہ پر نہ لیا گیا ہوگا۔ بلکہ اوس نے ظالمانہ طریقوں پر لیا ہوگا۔ وہ ان لغویات میں خرچ کیا ہوگا۔ اور جو شخص صرف پیٹ پالنے میں مصروف رہتا ہے۔ وہ ملک و رعایا کی حفاظت کیا کرے گا۔ پھر اُس نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ہمیشہ عیش پرستی میں مشغول رہتا ہے اور کوئی وقت اُس کا اس سے خالی نہیں جاتا۔ اُس کے اعوان و انصار کو اس قسم کے سامان عیش میسر نہیں۔ اوس نے کہا۔ تو پھر وہ لوگ اوس سے راضی کیونکر رہتے ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ ہاں راضی نہیں رہتے۔ یہ سنکر یوسف بن تاشفین نے گردن جھکا لی[۲ھ]

فرمانروایان ہندوستان میں سلطان ناصر الدین محمود اور عالمگیر زہد و تقشف میں نہایت شہرت رکھتے ہیں چنانچہ فرشتہ ناصر الدین کے حالات میں لکھتا ہے۔

> او بادشاہے بود شجاع و متعبد و کریم اکثر نفقہ لخاصۂ خود از وجہ کتابت مصحف مجید ساختہ روزگار خود می گزرانید و اموال بادشاہی را در نفقہ خود اصلا صرف نمی نمود۔

ایک بار ایک امیر نے سلطان کے لکھے ہوئے قرآن کو زیادہ قیمت پر خریدا، سلطان کو اطلاع ملی تو اس کو ناپسند کیا اور حکم دیا کہ اسکے بعد میرے لکھے ہوئے قرآن کو مخفی طور پر معمولی قیمت پر فروخت کیا جائے۔

منکوحہ بی بی کے علاوہ سلطان کے گھر میں کوئی لونڈی یا خادمہ نہ تھی۔ اس لئے بی بی ہی کو سلطان کا کھانا پکانا پڑتا تھا۔ جس سے اُس کو تکلیف ہوتی تھی، اُس نے سلطان سے اس کی شکایت کی اور کہا کہ اگر ایک لونڈی خرید دیجئے تو کوئی ہرج نہیں سلطان نے جواب دیا کہ بیت المال سے روپیہ لیکر لونڈی خرید دوں، صبر کرو کہ خدا تم کو آخرت میں جزائے خیر دے۔ ان کے علاوہ اس قسم کے تو بہت سے فرمانروا گذرے ہیں جنہوں نے اگرچہ اس قدر زہد و تقشف نہیں اختیار کیا ہے: تاہم نہایت معتدل اور باوقار اخلاقی اور مذہبی زندگی بسر کی ہے۔

(۲) دوسری قابل اعتراض چیز امراء و سلاطین کے مظالم ہیں۔ لیکن ان مظالم کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) ایک تو وہ جو سیاسی اسباب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً جنگ و بغاوت قیام سلطنت میں مزاحمت سازش وغیرہ لیکن یہ مظالم صرف مخالفوں اور دشمنوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور اس سلسلے میں فرمانروایان اسلام نے اگرچہ باپ، بھائی بیٹے، عزیز و اقارب تک کو تہ تیغ کر دیا ہے۔ تاہم اُن کی تاویل کی جا سکتی ہے۔ اور سیاسی وجوہ سے اُن کا جواز ثابت کیا جا سکتا ہے۔

(۲) دوسرے وہ جو عام مجرموں اور عام سزاؤں سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً کسی جرم پر کسی کے ہاتھ، پاؤں کٹوا دینا۔ ہاتھی کے پاؤں کے نیچے کچلوا دینا۔ پہاڑ کی چوٹی سے گرا دینا وغیرہ وغیرہ، اگرچہ ان سزاؤں کا عام رواج نہ تھا تاہم ہمارے سلاطین و امرا نے مختلف موقعوں پر اس قسم کی سزائیں دی ہیں۔ اور اُنہوں نے اسلام کی اخلاقی تاریخ کے صفحات پر قساوت و سنگدلی کا نہایت بدنما داغ لگا دیا

[۱ھ] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۵۳۔ [۲ھ] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۳۶۸۔

Marfat.com

ہے۔ ہم اس موقع پر اس قسم کی وحشیانہ سزاؤں کی چند مثالیں درج کرتے ہیں۔

سب سے پہلے اس قسم کی وحشیانہ سزاؤں کی ابتدا ابن الزیات نے کی جو خلیفہ معتصم کا وزیر تھا۔ اُس نے مجرموں کو سزا دینے کیلئے لوہے کا ایک تنور بنوایا تھا جس کے گرد لوہے کی تیز سلاخیں لگی ہوئی تھیں، مجرم اُس میں بند کر دیے جاتے تھے۔ اور جب کوئی مجرم اُس میں سزا کی تکلیف سے بیقرار ہو کر حرکت کرتا تھا تو یہ سلاخیں اُسکے جسم میں چبھ جاتی تھیں اور وہ اس سے اور زیادہ اذیت محسوس کرتا تھا۔ اس حالت میں اگر کوئی مجرم رحم کی درخواست کرتا تو اوسکو یہ جواب ملتا کہ "رحم ایک فطری کمزوری ہے" لیکن اُس کو اس وحشیانہ سزا کی سزا دنیا ہی میں مل گئی۔ چنانچہ خلیفہ متوکل نے جب اُس کو گرفتار کیا تو اسی تنور میں بند کر دیا۔ اُس نے کہا کہ "اے امیر المومنین مجھ پر رحم فرمائیے" لیکن اوس نے طنزاً وہی جواب دیا جو وہ اپنے مجرموں کو دیا کرتا تھا۔ یعنی یہ کہ "رحم ایک فطری کمزوری ہے" اس موقع پر اوسکے غلام نے ایک عجیب اخلاقی نکتہ بیان کیا، یعنی جب وہ تنور میں بند کیا گیا تو اوس کے غلام نے کہا کہ "آپ کا یہ انجام ہوا اور اسوقت آپ کا کوئی مداح نہیں ہے"۔ اوس نے کہا۔ "آخر برامکہ کے احسان نے ادن کو کیا فائدہ پہونچایا؟" بولا یہی کہ اسوقت آپ اُن کا ذکر رہے ہیں۔ اوس نے کہا "سچ کہتے ہو"[۱]

نصیر الدولہ ابو الطاہر محمد بن بقیہ عز الدولہ بختیار بن معز الدولہ کا وزیر تھا اور عز الدولہ اور اوس کے چچا زاد بھائی عضد الدولہ میں عداوت تھی، اسلئے عز الدولہ کی خوشامد سے محمد بن بقیہ عضد الدولہ کے متعلق ایسی باتیں کیا کرتا تھا جو اوس کو ناگوار گذرتی تھیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اوس نے دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ کروا دی۔ اور اس جنگ میں عز الدولہ نے شکست کھائی اور اس شکست کا سبب محمد بن بقیہ قرار پایا۔ اس جرم میں عز الدولہ نے اوس کی آنکھوں میں سلائی پھیروا کر عضد الدولہ کے پاس بھجوا دیا۔ عضد الدولہ نے تمام شہر میں پہلے اوس کی تشہیر کرائی۔ پھر اوس کو ہاتھی کے پاؤں کے نیچے ڈلوا دیا۔ اوسکے بعد اوس کو سولی پر چڑھا دیا۔[۲]

ابن السکیت ایک ادیب تھا جو متوکل کے بچوں کو تعلیم دیتا تھا۔ وہ تفضیلیہ تھا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو تمام خلفاء پر ترجیح دیتا تھا۔ ایک دن وہ متوکل کی خدمت میں حاضر تھا کہ اسی حالت میں متوکل کے دونوں لڑکے معتز اور موید آئے۔ متوکل نے اوس سے کہا کہ تم کو میرے یہ دونوں بچے محبوب ہیں یا حسن و حسین؟ ابن سکیت نے اوس کے دونوں بچوں کی تنقیص کی اور امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کے فضائل بیان کئے، اسپر متوکل نے ترکوں کو حکم دیا اور وہ سب اوس کے پیٹ پر چڑھ بیٹھے، یہانتک کہ وہ گھر پہونچکر دوسرے دن مر گیا۔[۳] ایک روایت میں ہے کہ اوس نے گدی سے اوس کی زبان نکلوا لی۔[۴]

امیر شمس المعالی ابو الحسن قابوس اگرچہ نہایت خوبیوں کا بادشاہ تھا۔ لیکن اسکے ساتھ نہایت ظالم اور سنگدل بھی تھا ابن خلکان نے اوس کے حال میں لکھا ہے۔

یقابل زلۃ القدم باراقۃ الدم لا تذکر العفو عند الغضب۔ | معمولی لغزشوں پر قتل کی سزا دیتا تھا۔ اور غصے کے وقت عفو و درگذر کا نام بھی نہ لیتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اوس کی ظلم و قساوت سے تمام فوج باغی ہو گئی اور اوس کو ایک قلعہ میں قید کر دیا جس میں وہ مر گیا۔[۵]

لیکن اسکے ساتھ بہت سے سلاطین و امراء نے عفو و درگذر اور حلم و بردباری کی بھی نہایت روشن مثالیں قائم کی ہیں چنانچہ مہدی جب خلیفہ ہوا تو تمام قیدیوں کے رہا کرنے کا عام حکم دیدیا۔[۶] مہدی کے دور خلافت سے پہلے خراج کے وصول کرنے میں نہایت سختیاں کی جاتی تھیں۔ مہدی خلیفہ ہوا تو اوس نے محمد بن مسلم سے اس معاملے میں مشورہ کیا۔ اور اوس نے یہ مشورہ دیا کہ اہل خراج مسلمانوں کے قرضدار ہیں، اور ادن کے ساتھ وہی برتاؤ کرنا چاہیے۔ جو قرضداروں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مہدی نے اس مشورے کو قبول کیا اور تمام

---

[۱] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۵۷۔ [۲] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۴۳۔ [۳] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۳۰۹۔
[۴] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۳۱۱ [۵] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۲۶۔ [۶] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۱۸۰

Marfat.com

عمال کے پاس تحریری حکم بھیجا کہ اہل خراج کو جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ نہ دیجائیں۔[۱]

یحییٰ بن خالد اسقدر حلیم و بردبار تھا کہ اپنے غلاموں کو تادیباً بھی کسی قسم کی سزا نہیں دیتا تھا۔ اوس سے لوگوں نے کہا کہ آپ اپنے غلاموں کی تادیب کیوں نہیں کرتے؟ تو جواب دیا کہ ہم نے اون کو اپنی ذات کا امین بنا رکھا ہے۔ اگر ہم اون کو خوفزدہ کرتے رہینگے تو ہم کو اون پر اعتماد نہ رہے گا۔[۲] اوس نے یہ عہد کر لیا تھا کہ برائی کے بدلے میں کسیکے ساتھ برائی نہ کریگا۔ اور اوس نے اس عہد کو پورا کیا۔[۳]

نصر الدولہ ابو نصر احمد بن مروان نے اپنے پورے عہد سلطنت میں ایک شخص کے سوا کسی کو سزا نہیں دی۔[۴]

ابو الہول حمیری نے فضل بن یحییٰ بن خالد برمکی کی ہجو لکھی تھی، اوس کے بعد اوس کی خدمت میں آیا کہ اوس کی فیاضیوں سے فائدہ اوٹھائے، لیکن فضل نے کہا کہ "تم کس منہ سے میرے پاس آئے ہو؟" اوس نے کہا کہ "اوسی منہ سے جس سے خدا کے پاس جاؤں گا" حالانکہ میں تم سے زیادہ خدا کا گنہگار ہوں۔ فضل ہنس پڑا اور اوس کو صلہ دیا۔[۵]

نظام الملک اور تاج الملک ابو الغنائم میں باہم دشمنی تھی۔ اس لئے ابو الغنائم نے ابن ہباریہ کو اسپر آمادہ کیا کہ وہ اگر نظام الملک کی ہجو لکھے تو اوس کو انعام ملے گا۔ ابن ہباریہ چونکہ نظام الملک کا ممنون احسان تھا۔ اس لئے پہلے تو انکار کیا۔ لیکن بالآخر مجبوراً اوسکو ہجو لکھنی پڑی۔ نظام الملک نے یہ ہجو سنی تو اوس سے نہ صرف درگذر کیا بلکہ اپنے احسانات میں اضافہ کر دیا۔ ابن خلکان نے اس واقعہ کے نقل کرنے کے بعد لکھا ہے۔

فکانت هذه معدودة من مكارم اخلاق نظام الملك وسعته[۶]

یہ واقعہ نظام الملک کے مکارم اخلاق اور اوس کے علم کی وسعت میں شمار کیا جاتا ہے۔

وزیر ابو الحسن بن فرات نہایت حلیم و بردبار تھا۔ اوس کی عام عادت یہ تھی کہ جب کوئی ملازم غلطی کرتا تو اوس کو کسی قسم کی سرزنش نہ کرتا بلکہ خود اوس سے اوس غلطی کی اصلاح کرواتا۔ اگر اوس کا کوئی دوسرا رفیق طعنہ زن ہوتا تو اوسکو سرزنش کرتا اوس غلطی کو معمولی چیز سمجھتا اور اوس کا عذر قبول کرتا۔ ایک بار فراش نے جلدی میں شمع کا گل تراشا جس سے ایک چنگاری اوڑ کر وزیر ابو الحسن کے پاس پہونچی خادم نے اوس کو سزا دینی چاہی لیکن وزیر نے اوس کو ڈانٹا اور کہا کہ "تمہارے خیال میں کیا غریب نے مجھکو بالقصد جلانا چاہا؟ یہ جو کچھ ہوا غلطی سے ہوا۔ تم اپنی جگہ واپس آؤ"۔[۷]

ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے اگرچہ بعض موقعوں پر وحشیانہ سزائیں دی ہیں۔ تاہم جہانگیر نے اسمیں اسقدر اصلاح کر دی کہ اس کو صرف بادشاہوں تک محدود رکھا اور دوسرے امراء و عمال کو اس کی ممانعت کر دی۔ چنانچہ امرائے سرحد کے نام چند چیزوں کی ممانعت کے متعلق جو فرمان روانہ کیا اون میں ایک چیز یہ تھی۔

در سیاستہا گوش و بینی نہ برند[۸]

(۳) ایک اور بد اخلاقی جو سلاطین و امراء کے درباروں سے خاص تعلق رکھتی ہے۔ چغلخوری، غمازی، سازش اور جوڑ توڑ ہے، اور اوس کی بدولت ایشیائی سلطنتوں میں سینکڑوں انقلابات ہوتے رہے ہیں۔ سینکڑوں لوگ بڑے بڑے عہدوں سے معزول ہوئے ہیں اور سینکڑوں لوگوں کی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ اگرچہ یہ بد اخلاقی بذات خود امراء و سلاطین کی ذات سے تعلق نہیں رکھتی، تاہم اون کی بے پروائیوں اور بے احتیاطیوں سے بہت کچھ اس کی اشاعت ہوئی ہے۔ اس لئے وہ بھی بالواسطہ اوس کے خطرناک نتائج کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمارے سلاطین و امراء میں بہت سے لوگ ایسے بھی گذرے ہیں، جنہوں نے اس بد اخلاقی کا

---

[۱] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۱۶۲-۱۶۳۔ [۲] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۲۴۴۔ [۳] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۲۴۸۔ [۴] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۵۷۔ [۵] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۰۹۔ [۶] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۱۵۔ [۷] کتاب الوزراء للصابی صفحہ ۱۴۵ [۸] تزک جہانگیری مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۰۱

Marfat.com

سد باب کیا ہے۔ اور لوگوں کو اس بداخلاقی کے مرتکب ہونے سے روکا ہے۔ مثلاً عبدالعزیز بن مروان جب دمشق کا والی ہوا تو وہ نہایت کمسن تھا۔ اس لئے اہل دمشق نے اوس کی سادہ لوحی اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اوٹھانا چاہا اور ایک آدمی نے اوس سے کہا کہ "میرا ایک پڑوسی ہے، جو آپ کا نافرمان اور باغی ہے۔" اس کے علاوہ اوس کے اور بھی بہت سے عیوب بیان کئے، عبدالعزیز نے یہ سنکر کہا کہ "نہ تم نے خدا کا ڈر کیا۔ نہ اپنے امیر کی عزت کی، نہ حق ہمسائگی کا لحاظ رکھا، اگر تم چاہو تو ہم اس معاملے میں غور کریں، اگر تم سچے نکلوگے تو اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ پہونچے گا۔ اگر جھوٹے نکلوگے تو ہم تمہیں سزا دیں گے۔ اور اگر درگذر چاہتے ہو تو ہم تم سے درگذر کرینگے۔ اوس نے کہا تو مجھ سے درگذر ہی فرمائیے۔[1]

فضل بن یحییٰ چغلخوروں سے سخت بغض رکھتا تھا۔ اور اوس کے پاس جب کوئی چغلخور آتا تو کہتا کہ "اگر تم نے ہم سے سچی بات کہی ہے تو ہم تم سے بغض رکھیں گے۔ اگر جھوٹ بات کہی ہے تو ہم تم کو سزا دیں گے۔ اور اگر ہم سے درگذر کرنے کی درخواست کروگے تو ہم تم سے درگذر کرینگے۔" ایک بار اوس کو اطلاع دی گئی کہ ایک افسر بہت سا سرکاری مال خرد برد کر گیا ہے اوس نے اوس کے جواب میں لکھا کہ "چغلخوری کا قبول کرنا چغلخوری سے بدتر ہے۔ کیونکہ چغلخوری صرف بتا دیتی ہے۔ اور اوس کا قبول کرنا اوس کی اجازت دیتا ہے۔ اور جو شخص ایسی چیز کو قبول کرتا ہے جس کی خدا نے ممانعت کی ہے۔ وہ اوس سے دور پڑ جاتا ہے۔ اور اس قابل ہے کہ اس کی بات نہ مانی جائے۔[2]

(۳)

خلیفہ مقتدر باللہ کا وزیر علی بن محمد بن الفرات بھی چغلخوروں سے سخت بغض رکھتا تھا۔ اور جب اُس کے پاس اس قسم کی کوئی عرضی آتی تھی تو اُس کا دربان دروازے پر کھڑا ہو کر پکارتا تھا۔ کہ فلاں چغلخور کہاں ہے؟ اس طرح وہ سب کے سامنے ذلیل ہوتا تھا۔ اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے زمانے میں چغلخوری کا بالکل سد باب ہوگیا، ابن خلکان نے اس واقعہ کو ان الفاظ میں لکھا ہے۔

ومن فضائله التي لم يسبق اليها انه كان اذا رفعت اليه قصة فيها سعاية خرج من عنده غلام ينادي ابن فلان بن فلان الساعي فلما عرف الناس ذلك من عادته امتنعوا عن السعاية باحد۔[3]

اور اُس کے اُن فضائل میں سے جس کی نظیر اُس سے پہلے قائم نہیں ہوئی۔ ایک یہ ہے کہ جب اُس کی خدمت میں کوئی ایسی عرضی پیش ہوتی جس میں کسی کی شکایت ہوتی تو اُس کے پاس سے ایک غلام نکل کر کہتا کہ فلاں ابن فلاں چغلخور کہاں ہے؟ لوگوں کو جب اُس کی اس عادت کا علم ہوا تو کسی کی چغلخوری کرنے سے باز رہنے لگے۔

بہاء الدولہ کے وزیر فخر الملک کی خدمت میں ایک بڈھے شخص نے یہ درخواست دی کہ فلاں شخص قتل کا مستحق ہے فخر الملک نے اس درخواست کو پڑھکر اُس کی پشت پر لکھ دیا کہ "چغلخوری گو صحیح ہو لیکن وہ بُری چیز ہے۔ اگر تم نے یہ درخواست خیرخواہی کی نیت سے دی ہے۔ تو اس میں فائدہ سے زیادہ تمہارا نقصان ہے۔ اگر تم بڈھے نہ ہوتے تو ہم تمکو وہی سزا دیتے جکا تم نے مشورہ دیا ہے۔"[4]

ان معائب کے مقابل میں ہمارے امراء و سلاطین میں جو محاسن اخلاق پائے جاتے تھے اُن میں سب سے نمایاں چیز اُن کی فیاضیاں ہیں۔

جن کا ایک حصہ علم کی ترقی، اشاعت و تعلیم اور علماء و فضلاء کی قدردانی سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس قسم کی فیاضیوں کی ابتداء خلفائے بنو امیہ ہی کے زمانے سے ہوئی اور اسلامی حکومت کے اخیر دور تک قائم رہی چنانچہ ابن خلکان نے حماد راویہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ایام عرب، اشعار و اخبار عرب، اور انساب و لغات عرب کا بہت بڑا ماہر تھا۔ اور خلفائے بنو امیہ اُس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اور اُس کی ملاقات کو چاہتے تھے۔ اس لئے وہ ان کے یہاں آتا تھا۔ اور مالی فائدہ اوٹھاتا تھا۔ اور وہ لوگ ایام عرب اور علوم عرب سے

---

[1] فخری صفحہ ۵۸ [2] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۲۹۰ [3] فخری صفحہ ۵۸ و ابن خلکان جلد اول صفحہ ۳۷۲ [4] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۶۵

Marfat.com

کے متعلق اُس سے دریافت کرتے تھے، ایک بار ولید بن یزید اموی نے اُس سے پوچھا کہ تم کو راویہ کیوں کہتے ہیں؟ اُس نے کہا اسلئے کہ آپ جس شاعر کو جانتے ہیں یا اُس کا نام سنا ہے میں اُس کے اشعار کی روایت کرتا ہوں، پھر ان سے زیادہ اُن شعراء کے اشعار کی روایت کرتا ہوں جن کو نہ آپ جانتے، نہ اُس کا نام سنا ہے، اس کے علاوہ قدیم و جدید اشعار میں سے جو شعر پڑھا جائے، میں قدیم و جدید میں امتیاز کر دونگا۔ ولید نے کہا کہ تم کو کسقدر اشعار یاد ہیں؟ اُس نے کہا بکثرت، میں حروف تہجی میں سے ہر حرف پر سَو بڑے بڑے قصیدے پڑھ سکتا ہوں. جاہلیت کے قطعات اور وہ اسلام کے اشعار اس سے الگ ہیں۔ ولید نے اُس سے امتحاناً قصائد پڑھوائے تو اُس نے اسقدر قصیدے سنائے کہ ولید گھبرا گیا۔ اور ایک متدین شخص کو قصائد سننے کیلئے مقرر کر دیا۔ اُس نے اُس کو دو ہزار نو سَو قصیدے جاہلیت کے سنائے۔ تو اُس نے ولید کو اس کی خبر دی اور اس نے اُس کو ایک لاکھ درہم کا صلہ دیا۔ ایک بار ہشام بن عبد الملک نے بھی اُس کو بڑے اہتمام سے بلوا کر پوچھا کہ یہ شعر ؎

ودعوا بالصبوح یوماً فجاءت

کس کا ہے؟ حماد نے شاعر کا نام بتایا اور اس قصیدے کے متعدد اشعار سنا دئے۔ ہشام نے بہت دنوں تک اُس کو نہایت جاہ و اعزاز کے ساتھ مہمان رکھا اور ایک لاکھ درہم کا صلہ دیا۔[1]

لیکن اس قسم کی فیاضیاں بھی اخلاقی آمیزش سے بالکل خالی نہیں ہوتی تھیں۔ چنانچہ امرائے بنو امیہ میں خالد بن عبد اللہ قسری نہایت فصیح و بلیغ اور فیاض طبع امیر تھا، ایک دن وہ شعراء کے قصائد سننے کے لئے بیٹھا تو اُن شعراء میں ایک شاعر ایسا تھا جس نے اُس کی مدح میں صرف دو شعر لکھے تھے، لیکن جب اُس نے اور شعراء کے لمبے چوڑے قصائد سنے تو اُس کو اپنے دو شعر نہایت حقیر معلوم ہوئے اور وہ خاموش رہا جب تمام شعراء چلے گئے تو خالد نے کہا کہ تمہیں کیا ضرورت ہے؟ اُس نے کہا کہ میں نے آپ کی مدح لکھی تھی لیکن جب اور شعراء کا کلام سنا تو مجھکو اپنے اشعار حقیر نظر آئے خالد نے وہ شعر سُنے پوچھا کہ تمہیں کیا ضرورت ہے؟ اُس نے کہا کہ میرے اوپر قرض کا بار ہے، اُس نے اُسکے قرض کے ادا کرنے کا حکم دیا، اور خود اُسیقدر رقم اس کو بھی دی۔[2]

اس قسم کی فیاضیاں بعض موقعوں پر نہایت مناسب طریقہ سے نکتہ سنجی کے ساتھ کی جاتی تھیں، مثلاً ایک بار فضل بن ربیع یا ہارون رشید نے اصمعی سے کہا کہ تم نے گھوڑوں کے متعلق جو کتاب لکھی ہے اُس کی کتنی جلدیں ہیں؟ اصمعی نے کہا کہ صرف ایک جلد۔ ابو عبیدہ سے بھی یہی سوال کیا تو اُس نے کہا کہ "پچاس جلد" اب حکم دیا کہ اس گھوڑے کے ایک ایک عضو کو پکڑ کر بتاؤ کہ عربی میں اُس کا نام کیا ہے؟ ابو عبیدہ نے کہا کہ "میں مویشیوں کا ڈاکٹر نہیں ہوں. میں نے اہل عرب سے جو کچھ سنا ہے۔ اُس کو لکھ دیا ہے۔ لیکن اصمعی کو یہ حکم ہوا تو اُس نے گھوڑے کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور اس کے ایک ایک عضو کا نام لیکر اُس پر ہاتھ رکھتا گیا اور اہل عرب نے ہر عضو کے متعلق جو اشعار کہے تھے، اُن کو سناتا گیا، جب فارغ ہوا تو وہ گھوڑا اُس کو صلے میں ملا۔ اصمعی کا بیان ہے کہ جب میں ابو عبیدہ کو چڑانا چاہتا تھا تو اُسی گھوڑے پر سوار ہو کر اُس کے یہاں جاتا تھا۔

خلفائے بنو امیہ میں سلیمان بن عبد الملک کھانے پینے کا اسقدر دلدادہ تھا کہ جب اُس کے سامنے بکریوں کے بھنے ہوئے بچے تنور سے نکال کر گرم گرم رکھے جاتے تھے تو وہ ان کی کلیجی کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔ لیکن چونکہ وہ نہایت گرم ہوتے تھے، اس نے ہاتھ کے جلنے کے خوف سے اُس میں آستین لپیٹ لیتا تھا۔ اور ان کے پیٹ کے اندر سے اُن کی کلیجیاں نکال کر کھا جاتا تھا۔ ایک بار اصمعی نے ہارون رشید کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا تو اُس نے کہا کہ "تم بنو امیہ کے حالات سے کسقدر واقف ہو۔ ایک بار میرے سامنے بنو امیہ کے ملبوسات پیش کئے گئے تو مجھے چند یمنی زریں کپڑے نظر آئے۔ جن کی آستینوں میں چکنائی لگی ہوئی تھی، اب تمہارے بتانے سے مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ اس کے بعد اس نے سلیمان بن عبد الملک کے کپڑے منگوائے تو اُن میں اس قسم کے داغ دھبے نمایاں نظر آئے اور اُن میں سے ایک جوڑا اصمعی کو دیا جس کو اصمعی کبھی کبھی پہنکر نکلتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ یہ سلیمان بن عبد الملک کا جبہ ہے جس کو ہارون رشید

---

[1] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۶۴ - ۱۶۵　[2] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۱۶۹

Marfat.com

نے مجھے پہنایا ہے[1]۔

سب سے زیادہ ان فیاضیوں کے مستحق طلبہ تھے اور ہمارے امراء و سلاطین ہر ممکن طریقہ سے ان کی اعانت کرتے تھے۔ وزیر ابوالحسن بن الفرات متفرق صلوں کے علاوہ شعراء کو سالانہ ۲۰ ہزار درہم دیا کرتا تھا۔ اُس کی وزارت کے آخر زمانے میں اُس کی توجہ طلبائے حدیث کی طرف مبذول ہوئی اور اُس نے کہا کہ یہ لوگ اپنے اوپر تنگی کر کے ایک حقیر رقم بچاتے ہیں اور اُس سے کاغذ اور روشنائی خریدتے ہیں۔ لیکن مجھکو اُن کی اعانت کا زیادہ حق ہے۔ چنانچہ اُن کے لئے بھی ۲۰ ہزار درہم خزانے سے مقرر کر دیے[2]۔ وہ پانچ ہزار اہل علم، اہل دین، خاندانی لوگوں اور محتاجوں کو وظیفہ دیتا تھا جس کی تعداد زیادہ تر سو دینار ماہوار اور کم از کم پانچ درہم ماہوار ہوتی تھی[3]۔

ابن جبیر نے اپنی سیاحت کے زمانے میں اس قسم کی فیاضیوں کے بکثرت مظاہر دیکھے تھے، اور اُن سے بہت متاثر ہوا تھا۔ سلطان نورالدین نے دمشق میں طلبہ کی اعانت و امداد کا جو سامان کیا تھا اُن کے متعلق اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ "قرآن مجید پڑھنے والے طلبہ جو اس شہر میں رہتے تھے سلطان نے ان کے لئے بہت سے مکانات وقف کئے تھے، اس شہر میں مسافروں کے آرام و آسائش کا سامان اس قدر ہے کہ اُن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ بالخصوص حفاظ قرآن اور طلبہ کے لئے جن کی حالت اس شہر میں عجیب ہے۔ اگرچہ تمام مشرقی شہروں کی یہی حالت ہے۔ لیکن اس شہر میں اس کا زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور سامان بہت زیادہ میسر آتے ہیں۔ ہمارے مغرب کی جو جماعت کامیابی کی خواستگار ہے۔ اُس کو چاہیے کہ ان شہروں میں طلب علم کیلئے سفر کرے، اُس کو اعانت کے بکثرت سامان ملیں گے، جن میں سب سے پہلی چیز معاش کی طرف سے بے فکری ہے، اور یہی چیز سب سے زیادہ مدد و معاون ہے[4]۔

اسکندریہ کے حالات میں لکھتا ہے کہ "اس شہر کے اُن مناقب و مفاخر میں جو درحقیقت اُس کے بادشاہ کی طرف منسوب ہیں وہ مدارس اور معابد ہیں جو طلبہ اور عبادت گزاروں کے لئے بنائے گئے ہیں یہ لوگ دور دور مقامات سے یہاں آتے ہیں، اور ہر ایک کو رہنے کے لئے ایک مکان، جس فن کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، اُس کے لئے مدرس، اور ضروریات کے لئے وظیفہ مل جاتا ہے۔ سلطان کی توجہ ان پردیسیوں کی طرف اس قدر ہے کہ اُن کے لئے بہت سے حمام متعین کر دئے ہیں کہ جب ضرورت ہو اُن میں جا کر غسل کریں اُن میں جو لوگ بیمار پڑیں اُن کے لئے ایک شفاخانہ قائم کر دیا ہے، اور اُن کی خبرگیری کے لئے بہت سے اطباء مقرر کر دئے ہیں، اور اُن کی ماتحتی میں بہت سے ملازم ہیں جو اُن کی تجویز کے مطابق اُن کی علاج اور غذا کا سامان کرتے ہیں۔ جو مریض اس شفاخانے میں جانا پسند نہیں کرتے اُن کے لئے کچھ لوگ مقرر ہیں، جو گھر پر جا کر اُن کو دیکھتے ہیں، اور اطباء سے آکر اُن کی حالت بیان کرتے ہیں تاکہ وہ اُن کا علاج کریں[5]۔

اسلامی ممالک میں تعلیم و تعلم کا دار و مدار انہی شاہانہ فیاضیوں پر تھا اور وہ اسلامی حکومت کے آخر دور تک قائم رہیں چنانچہ مولوی غلام علی آزاد ماثر الکرام میں لکھتے ہیں۔

"اگرچہ جمیع صوبجات ہندیہ وجود حاملان علوم تفاخر دارند اما صوبہ اودھ و الہ آباد خصوصیتے دارد کہ بہ ہیچ صوبہ نتواں یافت چہ تمام صوبہ اودھ و اکثر صوبہ الہ آباد بہ فاصلہ پنج کروہ و نہایت دہ کروہ تخمیناً آبادی شرفاء و نجباست کہ از سلاطین و حکام وظائف و زمین مدد معاش داشتہ اند و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ اند و مدرساں عصر در ہر جا ابواب علم بر روئے دانش پژوہاں کشادہ و صلائے اطلبوا العلم در دادہ و طلبہ علم خیل خیل از شہرے بہ شہرے میروند و ہر جا موافقت وقت بہم داد بہ تحصیل مشغول می شوند و صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبہ علم را نگاہ میدارند و خدمت ایں جماعہ را سعادت عظمیٰ می دانند۔

اسلامی ممالک میں تعلیم و تعلم کی تمام تر ترقیاں انہی فیاضیوں کی مرہون منت ہیں، اور انہی کی بدولت اسلامی ممالک میں اس کثرت سے

---

[1] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۲۸۸ ـ ۲۸۹ [2] کتاب الوزراء للصابی صفحہ ۲۰۱، ۲۰۲ [3] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۳۰۲،
[4] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۲۸۵ ، [5] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۴۲ ـ

Marfat.com

مدرسے اور کتب خانے قائم ہوئے کہ اگر اُن کی تفصیل کی جائے، تو ایک اور مستقل کتاب لکھنی ہوگی اور ہم اپنے موضوع سے دور پڑ جائیں گے۔ اس لئے ان مدرسوں اور کتب خانوں کے ضمن میں جو لوگ ہمارے سلاطین و امراء کی فیاضیوں کی داستانیں سننا چاہتے ہیں اُن کو حضرۃ الاستاذ علامہ شبلی مرحوم کے مضمون اسلامی مدارس اور اسلامی کتب خانے کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

ان علمی فیاضیوں کے ساتھ ہمارے سلاطین و امراء کی فیاضیاں زیادہ تر اخلاقی حیثیت رکھتی ہیں اور اُن کا تعلق صرف اُن لوگوں سے ہوتا تھا۔ جو درحقیقت اعانت و امداد کے مستحق ہوتے تھے۔ اس قسم کی فیاضیوں کا سلسلہ خلافت بنو امیہ ہی کے زمانے سے قائم ہوا اور اسلامی سلطنت کے دور آخر تک قائم رہا، چنانچہ اسلام میں سب سے پہلے ولید بن عبدالملک نے شفاخانہ قائم کیا۔ اور اُس میں تنخواہ دار اطباء مقرر کئے، اُسی نے ایک مہمان خانہ قائم کیا اور اندھوں جذامیوں اور ضعفاء و نقراء کے وظائف جاری کئے اور یتیموں کی تعلیم کے لئے معلم اور اپاہجوں کی خدمت کے لئے خدام مقرر کئے[1]۔ ولید بن یزید بن عبدالملک نے بھی شام کے اپاہجوں اور اندھوں کے وظائف مقرر کئے اور اُن کو کپڑے دئے[2]۔

عباسی دور میں خلیفہ ابوجعفر منصور نے اندھوں، یتیموں اور بیوہ عورتوں کی پرورش اور کفالت کا خاص انتظام کیا۔ اور اس کے لئے ایک خاص عامل مقرر کیا جو ان کے ناموں کو درج رجسٹر کرتا تھا[3]، ہارون رشید کے زمانے میں یحیٰی بن خالد نے بھی یتیموں کی تعلیم کے لئے بہت سے مکاتب قائم کئے[4]، اس کے بعد یہ ایک عام روش قائم ہوگئی، اور اکثر سلاطین و امراء اس قسم کے کار خیر میں حصہ لینے لگے، ابومنصور تاشمار بن عبداللہ الزینی نے صدقہ کی روٹیوں کے لئے بہت سی جائدادیں وقف کر رکھی تھیں اور یتیموں کی تعلیم کیلئے ایک مکتب قائم کیا تھا، اور ان کی تمام ضروریات کی کفالت کرتا تھا[5]، شاہان سلجوقیہ میں محمد بن ملک شاہ اس قسم کی فیاضی میں سب سے زیادہ شہرت رکھتا ہے، ابن خلکان اس کے حالات میں لکھتا ہے کہ وہ نہایت پاکیزہ خصلت تھا، اور فقراء و یتامیٰ کے ساتھ خاص طور پر سلوک کرتا تھا[6]۔

اس سلسلے میں مظفرالدین شاہ اربل کا نام خاص طور پر روشن نظر آتا ہے۔ ابن خلکان اس کے حالات میں لکھتا ہے کہ اُس کی فیاضیوں کے واقعات اسقدر عجیب و غریب ہیں کہ اور کسی کی نسبت اس قسم کے واقعات سننے میں نہیں آئے، صدقہ سے زیادہ دنیا میں اُس کو کوئی چیز محبوب نہ تھی، وہ روزانہ محتاجوں کو شہر کے مختلف مقامات پر بہ کثرت روٹیاں تقسیم کرتا تھا، جہاں ان لوگوں کا ہجوم ہو جاتا تھا، اور دن کے ابتدائی حصے میں وہ اُن پر تقسیم کر دی جاتی تھیں، جب سواری سے اترتا تھا تو اُس کے محل کے پاس بہت سے لوگ جمع ہو جاتے تھے، اور وہ اُن کو بلا کر ہر ایک کو موسم کے مطابق جاڑے اور گرمی کے کپڑے اور ان کپڑوں کے ساتھ کم و بیش دو تین اشرفیاں دیتا تھا، اُس نے اپاہجوں اور اندھوں کے لئے چار خانقاہیں تعمیر کروائی تھیں، اور اُن کو ان لوگوں سے معمور دیا تھا۔ اور ان کی روزانہ ضروریات کے تمام سامان مہیا کر دئے تھے، وہ ہر دو شنبہ اور جمعرات کی شام کو خود ان کے پاس آتا تھا، اور ہر ایک کے حجرے میں جا کر اُس کو کچھ دیتا تھا، اور اُس کے حالات پوچھتا تھا، اسطرح اول سے آخر تک تمام حجروں کا چکر لگاتا تھا۔ اور ان سے ہنسی مذاق کرتا تھا اور ہر ایک کے دل کو تسکین دیتا تھا، اُس نے ایک بیوہ خانہ، ایک یتیم خانہ اور ایک مکان اُن حرامی بچوں کیلئے تعمیر کیا تھا، جو راستوں میں پڑے ہوئے ملتے تھے، اور ان کیلئے بہت سی دودھ پلانے والی عورتیں مقرر کی تھیں، اور جب اس قسم کے بچے اُن کے پاس لائے جاتے تھے تو وہ اُن کو دودھ پلاتی تھیں۔ اُس نے ان سب کی روزانہ ضروریات کے لئے وظائف مقرر کر دئے تھے، ہر وقت اُن کے پاس جاتا تھا، اُن کے حالات دریافت کرتا تھا، اور وظائف مقررہ کے علاوہ اُن کو بہت کچھ دیتا تھا، اسی طرح وہ شفاخانے میں بھی جاتا تھا، اور ہر مریض کے پاس ٹھہر کر دریافت کرتا تھا کہ اُس نے رات کیونکر بسر کی؟ اُس کی حالت

---

[1] مقریزی جلد ۴ صفحہ ۵۸، [2] تاریخ الخلفاء مطبوعہ مصر صفحہ ۲۲۴، [3] مختصر الاول صفحہ ۲۰۳، [4] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۳۴۹، [5] کتاب الوزراء للجہشیاری صفحہ ۲۱۲، [6] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۴۲۷، [7] ابن خلدون جلد ۲ صفحہ ۲۰۰۔

Marfat.com

کیا ہے؟ اور اُس کو کس چیز کی خواہش ہے؟ اُس نے ایک مہمان خانہ عام بھی بنوایا تھا جس میں ہر قسم کے مسافر آ کر ٹھہرتے تھے، اور اُن کو صبح و شام کا کھانا ملتا تھا اور جب ان میں سے کوئی شخص جانا چاہتا تھا، تو اُس کو حسب حیثیت زادِ راہ ملتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ سال میں دو بار اپنے امینوں کی ایک جماعت کو بہت سا مال دیکر بلادِ ساحل کی طرف بھیجتا تھا کہ اُس کے ذریعہ سے مسلمان قیدیوں کو کفار کے ہاتھ سے رہائی دلائیں، یہ قیدی جب رہا ہو کر اُس کے پاس آتے تھے تو ہر ایک کو کچھ مال اور دیتا تھا، اور اگر وہ اُس تک نہیں آسکتے تھے تو خود یہ امین اُس کی ہدایت کے مطابق اُس کو دیدیتے تھے۔ وہ ہر سال حاجیوں کیلئے ایک سبیل قائم کرتا تھا، اور اُس کے ساتھ وہ تمام سامان کر دیتا تھا جس کی مسافروں کو راستے میں ضرورت پڑتی ہے، اس کے ساتھ ایک امین بھی رہتا تھا، جو اپنے ساتھ پانچ چھ ہزار اشرفیاں رکھتا تھا، اور مکہ و مدینہ میں اہل حاجت اور ارباب روایت پر تقسیم کرتا تھا، مکہ میں اُس کی بہت سی عمدہ یادگاریں ہیں جن میں بعض اب تک باقی ہیں[1]

وزیر جمال الدین اصفہانی اسقدر فیاض تھا کہ جواد کے لقب سے مشہور ہوگیا تھا، اُس کی فیاضیاں نہایت ہمہ گیر تھیں، ہر سال مکہ اور مدینہ کے محتاجوں اور مجاوروں کی اعانت کے لئے مال اور کپڑے بھیجا کرتا تھا، ایک مستقل محکمہ قائم کیا تھا، جو صرف اُن لوگوں سے متعلق تھا جن کو وظائف دیے جاتے تھے، یا طالب اعانت کے لئے آتے تھے، ایک بار موصل میں قحط پڑا تو اُس نے لوگوں کی اعانت و ہمدردی میں اپنا کل مال صرف کر دیا، اور اُس کے پاس کچھ نہیں رہا[2]

ہمارے سلاطین و امرا کی یہ فیاضیاں مختلف صورتوں میں دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھیں اور ہمارے سیاحوں نے جابجا اُن کے مؤثر مناظر دیکھے ہیں، چنانچہ ابن جبیر جس نے چھٹی صدی ہجری میں سفر کیا تھا اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ "یہ خواتین جس سال خود حج کو نہیں جاتیں معتبر اشخاص کے ساتھ پانی لے جانے والے اونٹ بھیجتی ہیں کہ مسافروں کو مشہور مقامات اور عرفات اور مسجد حرام میں رات دن پانی پلائیں۔۔۔۔۔۔۔ ان اونٹوں پر بیٹھ کر ایک منادی بلند آواز سے کہتا ہے کہ سبیل کا پانی، اس آواز کو سنکر تہیدست لوگ اپنے مشکیزوں اور لوٹوں کو لیکر دوڑتے ہیں۔ اور اُن میں پانی بھر لیتے ہیں، اسی سلسلے میں منادی رکھتا ہے کہ خدا اُس خاتون کو جو ایک ایسے بادشاہ کی بیٹی ہے جس کے یہ اوصاف ہیں۔ زندہ رکھے تاکہ اُس کے نام اور اُس کے نیک کام کا اعلان ہو جائے اور لوگ اُسکے لئے دعا کریں[3]" زبیدہ خاتون نے اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر اس کا انتظام کیا تھا، اور بغداد سے مکہ تک راستہ میں نہایت کثرت سے کنوئیں، اور حوض تیار کرائے تھے، ابن جبیر لکھتا ہے کہ "یہ حوض، یہ تالاب، یہ کنوئیں اور یہ منزلیں جنکا سلسلہ بغداد سے مکہ تک پھیلا ہوا ہے۔ ابوجعفر منصور کی پوتی اور ہارون رشید کی بی بی زبیدہ کی یادگاریں ہیں، جو عمر بھر ان میں مصروف رہی اور اس راستے میں رفاہ عام کی ایسی یادگاریں چھوڑیں جنکا فائدہ اُس کے مرنے کے دن سے آج تک ہر سال خدا کے وفد (حجاج) کو پہونچتا رہتا ہے۔ اور اگر اُس کی یہ نیک یادگاریں نہ ہوتیں تو یہ راستے بند ہو جاتے[4]"

سب سے زیادہ قابل رحم حالت اُن مسلمان قیدیوں کی تھی جو کفار کے ہاتھ میں گرفتار ہو جاتے تھے، اس لئے ہمارے سلاطین و امرا اُن کی رہائی میں اپنی دولت بیدریغ صرف کرتے تھے، چنانچہ ہم سلطان مظفرالدین صاحب اربل کے متعلق ابھی لکھ آئے ہیں کہ وہ سالانہ اپنی دولت کا ایک حصہ اس کار خیر میں صرف کیا کرتا تھا، اُس کے علاوہ اور بھی بہت سے سلاطین و امرا، بلکہ عام مسلمان بھی اس کار خیر میں حصہ لیتے تھے، چنانچہ جنگ صلیبی کے بعد جب ابن جبیر شام کے شہروں سے گذرا ہے تو وہاں مسلمان قیدیوں کی دردناک حالت دیکھی ہے۔ اور اس سلسلے میں ان فیاضیوں کا تذکرہ کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ "اُن مصائب میں جنکو ان شہروں میں ایک مسافر دیکھتا ہے مسلمان قیدی ہیں جو بیڑیاں پہنے ہوئے چلتے ہیں، اور غلاموں کی طرح سخت کاموں میں لگائے جاتے ہیں مسلمان قیدی عورتوں کی بھی یہی حالت ہے۔ کہ اُن کے پاؤں میں لوہے کے کڑے ہوتے ہیں، اور ان سب کی حالت کو دیکھکر سینہ پھٹا جاتا ہے، شام کے ان فرنگستانی شہروں میں مغربی قیدیوں پر خدا کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ ان شامی اطراف میں اور اُن کے علاوہ بھی

---

[1] ابن خلکان جلد اول صفحہ ۶۳۴ [2] ابن خلکان جلد دوم صفحہ ۷۳ [3] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۱۸۵، ۱۸۶ [4] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۲۰۸ –

Marfat.com

جو مسلمان مالی وصیت کرتا ہے، اس کو خاص طور پر مغربی قیدیوں کی رہائی کیلئے مخصوص کر دیتا ہے، کیونکہ وہ اپنے ملک سے دور پڑے ہوئے ہیں، اور خدا کے سوا اس کے علاوہ ان کی رہائی کی کوئی صورت نہیں، اس بنا پر ان اطراف کے مسلمان، خواتین اسلام اور دولتمند لوگ اس کار خیر میں اپنا مال صرف کرتے ہیں، سلطان نورالدین ایک مرض میں مبتلا ہوا تو یہ نذر مانی کہ مغربی قیدیوں کی رہائی میں بارہ ہزار دینار صرف کریگا، چنانچہ صحتیاب ہونے کے بعد اس نے یہ رقم ان کے فدیہ میں روانہ کی .... دمشق میں خدا نے اُن کی رہائی کے لئے وہاں کے دو دولت مند تاجروں کو کھڑا کر دیا جن میں ایک کا نام نصر بن قوام اور دوسرے کا ابوالدر یاقوت تھا، یہ دونوں خود اپنے مال سے مغربی قیدیوں کو رہائی دلواتے تھے، اور چونکہ یہ نہایت متدین تھے اور اس کار خیر میں شہرت رکھتے تھے، اس لئے جو لوگ اس غرض سے وصیت کرتے تھے، وہ بھی اپنے مال ان کے سپرد کر دیتے تھے، اس لئے جو مغربی قیدی رہائی پاتا تھا انہی دونوں کے ہاتھوں سے پاتا تھا۔[1]

اس کے بعد ابن بطوطہ نے دنیائے اسلام کا سفر کیا ہے اور مسلمان سلاطین و امراء کی فیاضیوں کے بہت سے چشم دید حالات لکھے ہیں، ایک موقع پر بہت سے امرائے مصر کے نام گنائے ہیں اور لکھا ہے کہ یہ لوگ نیک کاموں میں اور مسجدوں اور زاویوں کی تعمیر میں باہم مقابلہ کرتے ہیں، ایک امیر کے حال میں لکھا ہے کہ یتیموں پر اس نے بہت سے صدقات جاری کر رکھے ہیں، یعنی وہ اُن کو خوراک و پوشاک اور جو لوگ اُن کو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں اُن کی تنخواہ بھی دیتا ہے، ایک اور فیاض امیر کی نسبت لکھا ہے کہ اس کی یہ عادت ہے کہ شام کے وقت دریائے نیل کے کنارے اپنے محل کے سائبان میں ایک مجلس میں بیٹھتا ہے، اسی محل سے ملی ہوئی ایک مسجد ہے جب مغرب کا وقت آتا ہے تو اس میں نماز پڑھتا ہے، اور نماز پڑھکر پھر مجلس میں واپس آتا ہے، اور رات کا کھانا لایا جاتا ہے، اور اسوقت اس کے پاس کسی شخص کے آنے کی ممانعت نہیں ہوتی۔ ان میں جو شخص حاجت مند ہوتا ہے وہ اپنی حاجت کو بیان کرتا ہے، اور وہ اس کو پورا کر دیتا ہے، جو شخص صدقہ کا خواستگار ہوتا ہے، اُس کے لئے وہ اپنے ایک غلام کو حکم دیتا ہے کہ اسکو محل کے باہر لے جاؤ، وہاں اس کا خزانچی درہموں کی تھیلیاں لئے ہوئے موجود رہتا ہے، اور جو رقم اس کے لئے مقرر کر دی جاتی ہے اسکو دیتا ہے۔[2]

سفر حج کے سلسلے میں لکھتا ہے کہ اس قافلے میں مسافروں کے پانی پلانے کے لئے بہت سے اونٹ ہیں۔ اور بہت سے اونٹ صدقہ کا سامان اور ان لوگوں کے لئے جو بیمار ہو جاتے ہیں۔ دوائیں، شربت اور شکر لیکر چلتے ہیں، اور جب قافلہ اترتا ہے تو پیتل کی بڑی بڑی دیگچیوں میں جن کو دسوت کہتے ہیں کھانا پکایا جاتا ہے، اور مسافروں کو اور ان لوگوں کو جن کے پاس زاد راہ نہیں ہے کھلایا جاتا ہے، اس قافلے میں بہت سے اونٹ اُن لوگوں کی سواری کے لئے ہیں جو چلنے کی طاقت نہیں رکھتے اور یہ سب سلطان ابوسعید کے صدقات و مکارم کا فیض ہے۔[3]

ہمارے سلاطین و امراء کی یہ فیاضیاں اسلامی سلطنت کے دور آخر تک قائم رہیں، اور فرمانروایان ہندوستان نے اس قسم کے کارہائے خیر میں نمایاں حصہ لیا چنانچہ ابن بطوطہ ایک قحط کے ذکر میں لکھتا ہے کہ جب قحط کی سختیاں بہت زیادہ بڑھ گئیں تو سلطان (محمد تغلق) نے حکم دیا کہ تمام اہل دہلی کو ٦ مہینے کا خرچ دیدیا جائے، اس حکم کے بعد قاضی، منشی اور امراء گلیوں اور محلوں میں گھوم گھوم کر لوگوں کے نام لکھتے تھے۔ اور ہر ایک کو ٦ مہینے کا خرچ دیدیتے تھے۔[4]

فرمانروایان ہندوستان کی فیاضیوں کی مستقل یادگاریں تو شفاخانوں، مدرسوں، مسافرخانوں، لنگرخانوں اور خانقاہوں کی صورت میں قائم ہوئیں، لیکن ان کے علاوہ انہوں نے محتاجوں کی اعانت و امداد کے سینکڑوں طریقے اختیار کر رکھے تھے، مثلاً ملک الامراء فخرالدین کوتوال ہر سال ایک ہزار نادار لڑکیوں کی شادی کا سامان کرتے تھے،[5] فیروز شاہ تغلق نے نادار لڑکیوں نے

---

[1] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۳۰۷ - ۳۰۸ [2] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد اول صفحہ ۲۸، ۲۹ [3] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد اول صفحہ ۱۳۶ [4] سفرنامہ ابن بطوطہ جلد دوم ۸۹ [5] تاریخ فیروزشاہی جلد اول صفحہ ۱۱۷

Marfat.com

نکاح کے لئے ایک مستقل محکمہ قائم کیا تھا، چنانچہ اس محکمہ کے قائم ہو جانے کے بعد ہزاروں محتاج مسلمانوں اور بیوہ عورتوں نے اپنی اپنی لڑکیوں کے نام درج رجسٹر کرا لئے اور مالی امداد حاصل کی[1] وہ بوڑھوں، یتیموں، اندھوں، اپاہجوں، بیوہ عورتوں اور جسمانی عیوب رکھنے والوں کی بھی اعانت کرتا تھا[2]

شاہجہاں نادار لڑکیوں کے ساتھ غریب بیوہ عورتوں کے نکاح کا بھی سامان کرتا تھا، اور اُن کو زیور اور کپڑے دیتا تھا[3]

سلطان محمد شاہ بہمنی نے بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں یتیموں کی تعلیم کا خاص انتظام کیا تھا اور اندھوں کے مشاہرے مقرر کئے تھے[4] سکندر لودی نے فقراء و مستحقین کی اعانت کا ایک خاص نظام قائم کیا تھا، یعنی سال میں دو بار اُسکے سامنے تمام ملک کے فقراء و مستحقین کی فہرست پیش کی جاتی تھی اور وہ ہر شخص کی بہ نسبت و حیثیت کے مطابق اسکو ششماہی امداد دیا تھا، جاڑوں میں شال اور کپڑوں سے بھی اُنکی امداد کرتا تھا، اور روزانہ مختلف مقامات پر خام غلہ اور پکا ہوا کھانا تقسیم کرتا تھا[5]

(اکتوبر ۴۱ء)

---

١ تاریخ فیروز شاہی حصہ دوم صفحہ ۳۴۹ ٢ تاریخ فیروز شاہی جلد اول صفحہ ۵۶۱ ۳ عمل صالح جلد اول صفحہ ۲۴۹،
۴ فرشتہ جلد اول صفحہ ۳۰۲ ۵ فرشتہ جلد اول صفحہ ۱۸۶ ۔

Marfat.com

دورِ عباسیہ کا اخلاقی اثر علوم و فنون پر

از

مولٰینا عبدالسلام صاحب ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ،

اسلامی علوم و فنون پر مختلف مؤثرات نے اثر ڈالا ہے، اور ان تمام موثرات کی تفصیل اسلامی علوم و فنون کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے، لیکن ان موثرات مین اخلاق و معاشرت کے تغیرات بھی شامل ہیں، اس لئے اس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے ہم صرف ان اثرات کو بیان کرنا چاہتے ہیں، جو دور عباسی کے اخلاق و معاشرت نے اسلامی علوم و فنون پر ڈالے ہیں،

اسلامی اخلاق و معاشرت کے تغیرات کی ابتدا، اگرچہ دور بنو امیہ ہی میں ہو چکی تھی، لیکن اسلامی علوم و فنون کی تدوین و ترتیب کا اصلی زمانہ دور عباسیہ سے شروع ہوا، اس لئے دور بنی امیہ کے اخلاقی و معاشرتی تغیرات کا اثر اسلامی علوم و فنون پر بہت کم پڑا، غزلی شاعری البتہ ان تغیرات سے زیادہ متاثر ہوئی، اور اخطل اور عمر بن ربیعہ وغیرہ نے رندی اور ہوسناکی کے مضامین میں دور جاہلیت سے زیادہ بیباکی، رنگینی اور لطافت پیدا کی، لیکن شاعری کے علاوہ اور علوم و فنون اس دور کے اخلاق و معاشرت سے بہت کم متاثر ہوئے، اور اگر کچھ اثر پڑا بھی تو وہ اسقدر مبہم ہے، کہ اسکو مسلمانون کی اخلاقی تاریخ میں واضح طور پر نمایاں نہیں کیا جا سکتا، لیکن عباسیہ دور مین ایک طرف تو اخلاق و معاشرت میں اسقدر تغیرات پیدا ہو گئے، کہ اخلاقی حیثیت سے یہ دور گذشتہ زمانون سے بالکل مختلف ہو گیا، دوسری طرف اسلامی علوم و فنون کی تدوین و ترتیب کا آغاز اسی دور میں ہوا، اسلئے تمام اسلامی علوم و فنون ان اخلاقی تغیرات سے متاثر ہوئے اور ہم اس موقع پر انہی اثرات کی تفصیل کرنا چاہتے ہیں،

اس دور کے اخلاقی اور معاشرتی تغیرات کا سب سے زیادہ اثر شعرا پر پڑا، اور یہی اثر انکی شاعری سے نمایان ہوا، کیونکہ شعرا کا گروہ ہمیشہ سے ایک آزاد اور بے قید گروہ خیال کیا جاتا ہے، اس لئے عباسی دور مین جب عیش و

Marfat.com

طرب کی زیادہ گرم بازاری ہوئی تو شعرا کو خلفا و امرا کی بزم طرب میں شرکت کا زیادہ موقع ملا، اور وہ رندی اور ہوسناکی کے خیالات کی اشاعت کا بہت بڑا ذریعہ بن گئے، دور جاہلی میں اس قسم کے شعرا کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے، دور بنو امیہ میں ان کی تعداد میں کسی قدر اضافہ ہوا لیکن پھر بھی یہ تعداد محدود رہی؛ لیکن عباسی دور میں رندمزاج کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا، اور اس نے شعر و شاعری کو رندی اور ہوسناکی کا مجموعہ بنا دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ

۱۔ اس دور میں غزل گوئی کو بہت زیادہ ترقی ہوئی، اور بشار وغیرہ نے اس صنف کو بہت زیادہ لطیف اور رنگین بنا دیا، غزل کی یہ لطافت اور رنگینی اگرچہ خود اس دور کی اخلاقی اور معاشرتی لطافت اور رنگینی کا قدرتی نتیجہ تھی، لیکن اس نے لوگوں کو رندی اور ہوسناکی کی طرف اور بھی زیادہ مائل کیا اور فسق و فجور کی اشاعت کا بڑا ذریعہ بن گئی، بالخصوص عورتوں اور نوجوانوں کے اخلاق پر اس نے نہایت مضر اثر ڈالا، سوار بن عبد اللہ الاکبر اور مالک بن دینار کا قول ہے، کہ "اس شہر (بصرہ) کے لوگوں کو اس اندھے (بشار) کے اشعار سے زیادہ کوئی چیز فسق و فجور کی طرف مائل نہیں کرتی، واصل بن عطا کہتا تھا، کہ شیطان کا سب سے زیادہ فریب دہ اور گمراہ کن جال اس اندھے ملحد کے اشعار ہیں"،

بشار کے متعلق اس قسم کے چرچے بہت زیادہ پھیلے تو خلیفہ مہدی نے اس کو غزل گوئی سے روک دیا،[1]

۲۔ غزل صرف عورتوں کے عشق و محبت کے مضامین تک محدود نہیں رہی، بلکہ اس میں مردوں کے عشق و محبت کے مضامین بھی شامل ہو گئے، کیونکہ بنو امیہ کے دور تک امرد پرستی کا رواج نہیں ہوا تھا،[2] اس دور کی عاشقانہ شاعری صرف عورتوں کے عشق و محبت تک محدود رہی، لیکن عباسی دور میں عجمیوں کے اختلاط سے امرد پرستی کا رواج ہوا، اور لوگ عورتوں کے ساتھ امردوں کے عشق و محبت کا دم بھی بھرنے لگے امین نے ان کی طرف زیادہ میلان ظاہر کیا، اس لئے اس کے دور خلافت میں اس ذوق کو زیادہ ترقی ہوئی اور شعرا نے عورتوں کے ساتھ غزل میں امردوں کے حسن و جمال کا ذکر کرنا بھی شروع کیا، اور غزل گوئی کی اس نئی صنف میں حماد عجرد ابو نواس اور حسین بن ضحاک نے زیادہ نام پیدا کیا، ابو نواس کے دیوان میں اس قسم کے ہزاروں اشعار ہیں، جن کا نام اہل ادب نے "غزل مذکر" رکھا ہے، اور حسین بن ضحاک کے بہت سے اشعار آغانی نے اس کے حالات میں نقل کئے ہیں، جو امردوں سے تعلق رکھتے ہیں،

۳۔ شراب و کباب کے مضامین ہیں جو ابتدا ہی سے عاشقانہ شاعری کا ایک جزو ہو گئے تھے، اور دور جاہلیت اور دور بنو امیہ میں متعدد شعرا نے اس میں شہرت حاصل کی تھی، اور بھی زیادہ لطافت اور رنگینی پیدا ہوئی، اور ابو نواس نے ان مضامین کو ترقی دیکر خمریات کو ایک مستقل صنف بنا دیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ دور جاہلیت اور دور بنو امیہ کی عیاشانہ و متنعمانہ زندگی میں سادگی تھی، اس لئے اس صنف یعنی خمریات میں بھی سادگی قائم رہی، لیکن عباسی دور میں عجمیوں کے اثر سے عیش و طرب کی تمام چیزوں میں بہت زیادہ لطافت اور رنگینی پیدا ہو گئی، اور یہی لطافت و رنگینی ہے، جو ابو نواس کے شیشہ و ساغر سے جھلک رہی ہے، زمانہ جاہلیت میں طرفہ اور دور بنو امیہ میں اخطل بھی شراب

---

[1] آغانی جلد ۳ ص ۴۰ ، [2] آغانی جلد ۱۲ ص ۱۰۱ ،

Marfat.com

پیتے تھے، لیکن یہ دونون جام سفالین میں اور ابو نواس جام بلورین میں شراب پیتا ہے، اس لئے اس کے پیالے میں شراب کا رنگ زیادہ نمایان نظر آتا ہے؛

۴۔ ملحدانہ اور زندیقانہ خیالات عاشقانہ اور رندانہ شاعری کا جزو ہو گئے، اور شعرا ان خیالات کا اظہار نہایت بیباکی کے ساتھ کرنے لگے، اگرچہ بذات خود ان کو شاعری سے کوئی تعلق نہ تھا، بلکہ یہ ایک علمی اور مذہبی خیالات تھے، جن کا تعلق فلسفہ اور علم کلام سے تھا، لیکن جو شعرا رندانہ زندگی بسر کرتے تھے، اور لوگوں کو اپنے اشعار کے ذریعہ سے اس قسم کی زندگی بسر کرنے کی طرف مائل کرنا چاہتے تھے، ان کی راہ مین مذہب ایک بڑی روک تھا، اس لئے وہ مذہب پر بھی حملہ کرتے تھے، اور شراب نوشی کی حرمت دوزخ و جنت کی ترغیب و ترہیب اور حشر و نشر اور حساب و کتاب کے متعلق جو مذہبی عقائد و خیالات تھے، ان کی ہنسی اڑاتے تھے، لیکن بنوامیہ کے دور خلافت میں چونکہ ملحدانہ اور زندیقانہ خیالات عام طور پر نہیں پیدا ہوئے تھے، اس لئے اس دور کی عاشقانہ اور رندانہ شاعری ان مضامین سے آشنا نہیں ہونے پائی، لیکن اس دور مین جب فلسفہ و منطق، اور مزدکی اور مانوی عقائد کی اشاعت کی وجہ سے اس قسم کے خیالات عام طور پر پھیلے، تو رند مزاج شعرا نے ان کو سرمایۂ تغزل بنا لیا، اور ان کو نہایت بیباکی کے ساتھ ظاہر کرنے لگے، اگرچہ خود ان شعرا کے مذہبی عقائد میں کسی قسم کا ضعف نہ تھا، بلکہ انھون نے ان خیالات کو رندانہ مضامین مین زور و قوت پیدا کرنے کا صرف ذریعہ بنا لیا تھا، تاہم عوام مین وہ بھی ملحد و زندیق مشہور ہو گئے، اور رندی و سرمستی الحاد و زندقہ کا مرادف ہو گئی، عباسی دور مین جو لوگ ملحد و زندیق مشہور ہوئے، ان میں زیادہ تر تعداد اسی قسم کے لوگون کی ہے، مثلاً اس دور مین ابراہیم بن سیابہ ایک رند مزاج شاعر تھا، جس کے مذہبی عقائد اگرچہ خراب نہ تھے، تاہم وہ اپنی رندی اور اوباشی کی وجہ سے زندیق مشہور تھا، ایک بار لوگون نے اسکو اس اوباشی پر ملامت کی، تو اوس نے کہا کہ اگر میں خدا کے پاس گناہوں کی ذلت کے ساتھ جاؤن، اور وہ مجھ پر رحم کرے، تو یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے، کہ اپنے نیکیوں کے غرور سے اکڑتا ہوا اوس کے پاس جاؤن[1]، اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ اوسکو خدا اور جزا و سزا سے انکار نہ تھا، بلکہ صرف رندی اور اوباشی نے اوس کو ملحد و زندیق کے لقب سے مشہور کر دیا تھا،

اس دور کا ایک اور شاعر آدم بن عبد العزیز تھا، جو رندانہ زندگی بسر کرتا تھا، اور اس قسم کے ملحدانہ اور بے باکانہ اشعار کہتا تھا، خلیفہ مہدی نے اس پر اس کو سزا دینی چاہی، تو اوس نے کہا کہ بھلا کوئی قریشی بھی زندیق ہو سکتا ہے، یہ اشعار تو سرمستی کے حالات مین میری زبان سے بے ساختہ نکل پڑے ہیں، مین نے نہ کبھی خدا کا انکار کیا، اور نہ اوس کے متعلق شک کیا،

ایران کی عاشقانہ شاعری میں اس قسم کے رندانہ و ملحدانہ مضامین کا جو انبار نظر آتا ہے، وہ درحقیقت اسی دور کی عاشقانہ شاعری کا اثر ہے، اور خواجہ حافظ اور خیام اسی دور کی رندانہ زندگی کی ترجمانی کر رہے ہیں، خواجہ حافظ اور خیام کے کلام مین دنیوی زندگی کے لئے نقد اور اخروی زندگی کے لئے نسیہ کا جو لفظ بار بار آیا ہے، وہ بھی اسی دور کی پیداوار ہے، چنانچہ آدم بن عبد العزیز کہتا ہے کہ

---

[1] آغانی جلد ۱۱ ص ۷۰،۲۰ [2] آغانی جلد ۱۴ صفحہ ۵۸، ۵۹،

اسقنی واسق غصینا ۔۔۔۔ لا یتبع بالنقد دینا

مجھ کو اور غصینہ کو شراب پلا ۔۔۔۔ نقد کے بدلے ادھار کو نہ بیچ

لیکن اس عیاشانہ اور رندانہ زندگی کے مقابل میں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، اس دور میں ایک زاہدانہ اور متقشفانہ زندگی بھی موجود تھی، اسلئے

۵ - رندانہ شاعری کے مقابلہ میں زاہدانہ شاعری کی بھی ایک مستقل صنف پیدا ہوگئی، اور ابو العتاہیہ نے اس زندگی کی ترجمانی کی، اگرچہ ابو العتاہیہ کو اس قسم کے مضامین کا کافی سرمایہ خود اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں مل سکتا تھا، تاہم غالبًا اس پر مانوی فرقے کے لوگوں کا بھی اثر پڑا تھا، اور اس نے زاہدانہ شاعری کی بنیاد انہی کی زاہدانہ زندگی اور زاہدانہ تعلیمات پر رکھی تھی،

چنانچہ دور جدید کا ایک مصنف لکھتا ہے، کہ اس دور کی مذہبی شاعری میں جس کے علمبردار صالح بن عبد القدوس اور ابو العتاہیہ تھے، مثنوی مذہب کا میلان شامل تھا، تصوف پر جب ہم بحث کریں گے، تو دکھلائیں گے کہ زاہدانہ زندگی پر ایرانیوں کا کیا اثر پڑا، اس وقت صرف یہ کہہ سکتے ہیں، کہ اگر بشار کے اباحی میلان میں مزدکی عنصر شامل تھا، تو ابو العتاہیہ کے زاہدانہ میلان میں مانوی عنصر بھی داخل تھا[۱]، لیکن امراء اور شعراء و ادباء کا محدود گروہ جو عیاشانہ اور رندانہ زندگی بسر کرتا تھا، اس صنف شاعری کا قدردان نہ تھا، اس کو صرف زہاد، محدثین، فقہاء اور عوام میں جو زاہدانہ زندگی بسر کرتے تھے، مقبولیت حاصل تھی، اور وہی اس کے مخاطب تھے اسلئے انکا نمایاں اثر شاعری کی زبان پر پڑا، اور ابو العتاہیہ نے ان لوگوں کے فہم کے مطابق نہایت سہل و سادہ زبان اختیار کی، چنانچہ ایک بار ایک شاعر نے اس کو اپنے زاہدانہ اشعار سنائے، تو اس نے ان کو ناپسند کیا، اور کہا کہ شعر قدماء یا بشار اور ابن ہرمہ کے طرز پر کہنا چاہیئے، اگر اس پر قدرت حاصل نہ ہو، تو شاعر کو ایسے الفاظ لانے چاہئیں جو عام لوگوں کی سمجھ میں آسکیں، جیسا کہ میں کہتا ہوں، بالخصوص زاہدانہ اشعار کیونکہ زہد سلاطین رواۃ شعراور ان لوگوں کا شیوہ نہیں ہے، جو الفاظ غریبہ کی تلاش میں رہتے ہیں، بلکہ یہ زہاد محدثین فقہاء اہل ریا، اور عوام کا شیوہ ہے، اور وہ لوگ انہی چیزوں کو پسند کرتے ہیں، جس کو وہ سمجھ سکتے ہیں[۲]،

فارسی شاعری میں زہد و قناعت کے جو مضامین ہیں بالخصوص ابن یمین کی زاہدانہ شاعری اسی دور کی زاہدانہ شاعری کا پرتو ہے،

شاعری کے ساتھ دوسرے فنون لطیفہ پر بھی اس عیاشانہ زندگی کا اثر پڑا، اور رقص و سرود کا اثر اس قدر ترقی کر گیا، کہ ہر جگہ مغنی ہی مغنی نظر آنے لگے، اور لوگوں کے دلوں میں اس کا میلان اس قدر پیدا ہوا کہ ایک بار ایک مغنی نے دجلہ کے پل پر گانا شروع کیا، تو سننے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا، کہ راستے بند ہوگئے، اور پل کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہوگیا، اس لئے خلفاء بنو امیہ کے زمانہ میں معبد وغیرہ نے فن موسیقی کا جو انداز قائم کیا تھا، وہ بالکل بدل گیا، اور مختلف ملکوں کی جو کنیزیں عراق میں آئیں، وہ ساتھ ساتھ اپنے ملک کی موسیقی بھی لیتی آئیں، ان سب سے ملکر ایک جدید فن موسیقی پیدا ہوگیا،

---

۱ ضحی الاسلام جلد اول ص ۱۰۰، ۲ اغانی جلد ۳ صفحہ ۱۵۵،

Marfat.com

اور بہت سے لوگ اس کو قدیم فن موسیقی پر ترجیح دینے لگے،

ابن خلدون نے اسلام میں فن موسیقی کی تدریجی ترقی پر جو مضمون لکھا ہے، اس میں لکھتا ہے کہ

یہ فن بتدریج ترقی کرتے کرتے بنو عباس کے زمانے میں درجہ کمال کو پہونچ گیا، اور ناچنے کے لئے متعدد آلات ایجاد کئے گئے، جن میں ایک کا نام کرج تھا، یہ لکڑی کے چند زین سے کسے ہوئے گھوڑوں کی تصویریں تھیں، جو قباؤں کے کنارے لگی رہتی تھیں، اور ان کو عورتیں پہنکر گھوڑوں پر سواری کرنے کی نقل کرتی تھیں، اور ان کو ادھر ادھر حرکت دیتی تھیں، اس قسم کے اور بہت سے کھیل تھے، جو شادیوں تہواروں، اور عیش و طرب کی مجلسوں میں دکھائے جاتے تھے، بغداد اور عراق کے شہروں میں ان کی کثرت ہوئی، اور وہاں سے وہ دوسرے شہروں میں پھیل گئے۔[1]

ستمبر ۱۹۳۰ء

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۳۵۱،

"ہارون الرشید اور شارلیمین"

کیا ان میں کوئی سیاسی تعلق تھا؟

(از عبدالحلیم صاحب ناظم دربھنگوی، مولوی فاضل" مدیر محدث " دہلی)

تاریخ پڑھنے والوں بلکہ بعض تاریخی کتابوں میں عام ور پر مشہور ہے کہ عباسی خلیفہ ہارون الرشید اور شہنشاہ فرانس شارلیمین میں سیاسی روابط و تعلقات تھے، بلکہ ان میں اتنا اتحاد تھا کہ اکثر پیغامات محبت اور ہدایائے الفت بھی باہم بھیجے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون الرشید نے شاہ شارلیمین کو کنیسۃ القیامہ کی کنجیاں بھی سپرد کر دی تھیں اور اس کو بیت المقدس کی حفاظت کی اجازت بھی دیدی تھی۔ چنانچہ اسی رشیدی استحقاق کی وجہ سے شارلیمین نے اپنا لقب "حامی الاراضی المقدسہ" رکھ لیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ مختلف مزعومات ہیں جنہیں ان دونوں بادشاہوں میں تعلقات ثابت کرنے والے پیش کرتے ہیں۔

میں نے اس شہرت بے اصل کے لئے عربی زبان کی مرکزی تاریخیں طبری، ابن الاثیر، ابو الفدار، ابن خلدون ابن خلکان، مسعودی اور سیوطی کی بغور و خوض کی ورق گردانی کی لیکن مجھے ہارون الرشید اور شارلیمین میں کسی تعلق کا کوئی تذکرہ نہ ملا۔ اسی تتبع و تلاش میں اس کا ذکر صرف بعض متاخرین کی کتابوں میں میری نظر سے گذرا۔ جسے ان لوگوں نے یورپین تاریخوں سے غالباً نقل کیا ہے۔ پھر میں نے لاطینی تاریخوں کا مطالعہ شروع کیا۔ بالخصوص علامہ کلینکلوز (KlienClawsc) کی تاریخی بحثیں بغور پڑھیں جنکو علامہ موصوف نے دو لاطینی معتبر تاریخوں (LakidechalamagneL'Annal Layel) پر اعتماد کرتے ہوئے مرتب کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ہارون الرشید اور شارلیمین میں کسی قسم کا کوئی علاقہ نہ تھا۔ یہ تعلقات جو عالم اسلام کے اتنے بڑے خلیفہ کے ساتھ شارلیمین کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں وہ بالکل خرافات ہیں جنہیں سنہ عیسوی کی متوسط صدیوں کے راہبوں اور مورخین نے صرف شارلیمین کی عظمت و شان دکھانے کے لئے خود گڑھ لیا۔" علامہ موصوف نے اپنے اس دعویٰ کو متعدد قوی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ ان میں ایک دلیل تو یہی ہے کہ "وہ مذکورالصدر زبردست لاطینی تاریخ اس کا کوئی ذکر نہیں کرتی ہیں۔ اور درحقیقت بعض علمی طبقہ میں ہی دونوں بادشاہوں

Marfat.com

کے تعلقات کا تذکرہ ان دونوں لاطینی کتابوں کو اچھی طرح علمی حیثیت سے نہ سمجھنے کی وجہ سے پھیل گیا ہے۔ لاطینی کتاب (La vie de Charlemagne) نے شارلیمین اور بطریک القدس کے درمیان نو مرتبہ تحائف کے ارسال کا تذکرہ کیا ہے مگر اس سے یہ نتیجہ کیونکر نکالا جا سکتا ہے کہ ہارون و شارلیمین میں بھی اس قسم کے تعلقات تھے؟

میں سطور بالا کے مطالعہ کے بعد قرون وسطےٰ کی تاریخیں الٹنی شروع کیں تو مجھے معلوم ہوا کہ اس دور کے پچھلے مورخین نے بطریک القدس اور شارلیمین والی تاریخی حقیقت پر ہوا در ہوا قلعے تیار کر لئے۔ اور ہارون الرشید کے تعلقات کی داستانیں اختراع کر لیں۔

سب سے پہلے جس نے ہارون الرشید اور شارلیمین کے تعلقات کا تذکرہ کیا ہے وہ سینٹ گول (Saint Gall) ہے۔ اس شخص نے ان دونوں بادشاہوں کے درمیان، ہاتھی، توحیدی شیر اور دوسری قسم کے مشرقی ہدایا کے تبادلہ کا قصہ گھڑا اور وہ بھی اس زعم فاسد کی بنیاد ۸۲۵ء میں یعنی شارلیمین کی موت کے ایک سو گیارہ سال بعد رکھی۔ طرہ یہ کہ اس خیال کا ماخذ کتاب "حیات شارلیمین" (La vie de Charlemagne) مصنفہ اگنہارڈ کو قرار دیا۔ پھر طرفہ بر طرہ یہ کہ شارلیمین کو "حامی الاراضی المقدسہ" بھی بنا دیا ہے۔ ایک محقق کے نزدیک اس میں کوئی شک نہیں کہ گول نے اگنہارڈ کی تحریر کا مطلب نہیں سمجھا یا دانستہ اس کی طرف ایک ایسے خیال کی نسبت کر دی جس سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ گول کے بعد پادری ریشنو نے ایک کتاب لکھی جس میں گول کے مزعومات کو ذکر کرتے ہوئے ایک قصہ اور اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ وہ یہ کہ "کسی مشرقی امیر وکبیر نے یورپ کی طرف توجہ کرتے ہوئے صلیب مقدس کے کچھ ٹکڑے اور اس مبارک پیالہ کے ٹکڑے جس میں حضرت مسیح نے پانی پیا تھا بطور ہدیہ شارلیمین کو بھیجے۔ یہ اشیاء اس وجہ سے کہ شارلیمین اراضی مقدسہ کا محافظ تھا۔ لیکن شارلیمین کی جائے سکونت تک پہونچنے کے قبل ہی قاصد بوڑھا کریت میں مر گیا۔ اس کے بعد ایک دوسرا قاصد جو پہلے قاصد کے ساتھ تھا ان مقدس ٹکڑوں کو شارلیمین کے پاس لایا۔"

اس قصہ سازی سے پادری ریشنو کی غرض صرف ایک گرجا کو مشہور کرنا تھا جس میں بقول اس کے وہ مقدس ٹکڑے اس وقت تک (تا دم تحریر) موجود تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ عجیب و مضحکہ خیز بات تو پادری بزانے ۱۰۹۶ء میں تحریر کی: "انہوں نے یہ افسانہ نگاری کی کہ شارلیمین نے قبر مقدس کی زیارت کی۔ اور ہارون الرشید کو اراضی مقدسہ ہبہ کرتے ہوئے وہاں کا محافظ بھی ہارون کو بنا دیا۔" تعجب تو یہ ہے کہ ان اختراعی قصوں پر دو صدیاں بھی نہ گذری تھیں کہ یہ تاریخی حقائق بن گئیں جن پر کسی شک کا غبار بھی نہیں پڑ سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان دونوں بادشاہوں کے سلسلۂ تعلقات میں قرون وسطیٰ کے پرخود غلط مؤرخین نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھکر قارئین حیران و متعجب ہوں گے۔ کیونکہ یہ لوگ اس اختراعی تاریخ نگاری میں کچھ اس طرح پریشان و خبط ہیں کہ ایک تاریخ کا محقق ان کی حالت دیکھ کر ششدر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ آپ ملاحظہ کریں کہ سیبوان نے ۱۶۳۱ء میں یہ عبارت لکھی: "عرب و عجم کے شہنشاہ ہارون الرشید نے اراضی مقدسہ شارلیمین اعظم کو دے رکھے تھے۔" پھر دوسرے مورخ مزری نے ۱۶۷۹ء میں لکھا کہ "شارلیمین کی دوستی ہارون سے اتنی بڑھ گئی تھی کہ شارلیمین نے ہارون کو اراضی مقدسہ دیدئے۔" اس کے بعد ایک مورخ بربرتی نے مزری کی تائید کرتے ہوئے اتنا اور بڑھا دیا کہ "شارلیمین نے ہارون کو اراضی مقدسہ دیکر ان سے اپنی حفاظت کا بالکل قطع تعلق کر لیا۔" قارئین ان پریشان و متضاد اقوال سے صاف اندازہ لگا رہے ہوں گے کہ اس وقت کے مورخین صرف ایک دوسرے کے لکھے ہوئے پر بلا تحقیق اعتماد کر لیتے تھے۔ اور پھر اس پر اپنی طرف سے کچھ بڑھا دینے سے نہیں چوکتے تھے۔ ہمیں انتہائی افسوس ہے کہ قدیم و جدید اکثر تاریخیں اس قسم کے خرافات سے لبریز ہیں جن کو صحیح تاریخ کے دامن سے تحقیقی و علمی طور پر پاک کرنا ازبس ضروری ہے۔

Marfat.com

علامہ بریہاز (Brehier) نے علامہ کلینکلوز (Kleinclausz) کے تاریخی مقالات کے قبل اس مبحث سے متعلق بعض مقالات شائع کئے تھے جنہیں ہارون الرشید اور شارلیمین کے درمیان تعلقات ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن جب علامہ کلینکلوز کے محققانہ و مدلل مقالات شائع ہوئے تو علامہ بریہاز اپنی بے سود ہمت پر بہت خفیف ہوئے۔ اور رسالہ (ریویو ہسٹوریک Revue Historique) میں ایک طویل مضمون لکھ کر اپنے گذشتہ نظریہ کی خود تردید کر دی۔ ہم علامہ بریہاز کے پہلے مقالات کا خلاصہ صرف دو باتوں میں درج ذیل کر دیتے ہیں۔ جن پر علامہ موصوف نے اول اول کافی زور دیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے خود مراجعت کر لی ہے لیکن تاہم بھی ان امور کی ہمہ وقت پر کچھ نظر ڈالیں گے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

(۱) "اس زمانہ میں عیسائیوں کو مذہبی تکلیف کافی پہونچ رہی تھی۔ جس کی بنا پر یروشلم (بیت المقدس) کے بطریرک (بڑے پادری) نے شارلیمین سے دوستانہ تعلق جوڑا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شارلیمین اور ہارون میں عمدہ تعلق تھا اسی وجہ سے بطریرک نے بتوسط شارلیمین ہارون الرشید سے اپنی تکلیف دفع کرنی چاہی"

میں کہتا ہوں اس زمانہ میں عیسائیوں کو کوئی دینی تکلیف ہی نہ تھی۔ چنانچہ آج تمام کے تمام علماء تاریخ بعہد ہارون عیسائیوں کی دینی تکلیف کا انکار کرتے ہیں۔ یہاں پر وہ مشہور تاریخی خط بھی پیش نظر رہے جسکو تیودسیوس یروشلم کے بطریق نے سنہ ۸۶۹ء میں بھیجا تھا۔ اس خط میں بطریق موصوف نے مسلمانان عرب کے عدل و انصاف اور ہمہ گیر مساوات کی بے حد تعریف کی تھی۔

علامہ بریہاز پھر لکھتے ہیں:۔

(۲) "اندلس میں تمام بو زنطی اور اموی شارلیمین و ہارون الرشید کے دشمن تھے۔ اسی دشمنی کی وجہ سے ہارون الرشید اور شارلیمین میں باہم قرابت پیدا ہو چکی تھی۔

میں کہتا ہوں کیا ایک مورخ کے لئے جائز ہے کہ جن امور کا صحیح اور علمی طور پر ثبوت نہ بہم پہونچ سکے پھر بھی وہ اپنی طرف سے ان کا غلط اور بے بنیاد نتیجہ نکال لے؟ اس میں شک نہیں کہ مورخین ایسے علمی نتائج کو جو صحیح علمی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں نہایت وسعت نظر کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن وہ کسی ایسی تحقیق کو جو واہیات و خرافات اور پوچ دلائل پر مبنی ہوں ہرگز قبول نہیں کر سکتے۔ کیا تاریخ میں بھی "ایجاد بندہ اگرچہ گندہ" کو دخل ہے؟

اگرچہ آخری سطور میں ہم صاف عرض کئے دیتے ہیں کہ عربی زبان کی تمام اصولی تاریخیں خلیفہ ہارون اور شارلیمین کے درمیان کسی تعلق کا کچھ بھی نہیں ذکر کرتی ہیں۔ بجز حیات شارلیمین سے متعلق دو لاطینی تاریخیں (Annal Royal) اور (Vie de Charlemagne) شارلیمین اور یوروشلیمی بطریق کے درمیان نوعدد ہدیہ و پیام کا ذکر کرتی ہیں لیکن ہارون و شارلیمین کے درمیان کسی تعلق کا کوئی تذکرہ نہیں کرتیں۔ اب ہم صحیح اور علمی توجیہہ پیش کرتے ہیں کہ ہارون الرشید نے نہیں بلکہ بطریق ہی نے شارلیمین کو قبر مقدس عطا کر دی تھی۔ اور شارلیمین اراضی مقدسہ کا قطعاً محافظ نہیں تھا۔ اور کنجیوں ہاتھی اور اس قسم کے جن ہدایا کا ذکر مشہور ہے وہ محض خرافات ہیں جنکو قرون وسطیٰ کے مصنفین نے اپنی ذاتی اغراض یا شارلیمین کی خانہ ساز عظمت دکھانے کیلئے گڑھ لیا تھا۔ اور یہ وہ مصنفین ہیں کہ صحیح علمی طور پر مورخین کے نزدیک ان کا کوئی اعتبار نہیں:۔

"یہ میری مہینوں کی تحقیقی کوششوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے جو قارئین کے سامنے ہے۔ تاریخ کا ذوق رکھنے والے اہل قلم صاحبان کو چاہئے کہ اس کی تائید و تردید میں مقالات لکھ کر ہمیں اور ناظرین کو ممنون کریں تاکہ یہ مبحث اچھی طرح اور فیصلہ کن طور پر واضح ہو جائے۔

(ترجمہ از الہلال مصر)

مئی ۱۹۳۵ء

Marfat.com

"ہارون رشید اور شالمان"

کے

تعلقات پر مؤقر "الہلال" مصری کا خیال

تاریخ کی اکثر کتابوں اور بیشتر متعلمین تاریخ کی زبانوں سے سنا جاتا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید اور شالمان شاہ فرانس کے درمیان بہت ہی گہرے تعلقات تھے، اور اکثر تحفہ تحائف ایک دوسرے کو بھیجا کرتے تھے۔ اور دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی جاری رہتی تھی، حتیٰ کہ ہارون رشید نے کنیسۂ بیت المقدس کی کنجیاں بھی دیدی تھیں۔ اور چونکہ وہ بیت المقدس کی حمایت کے لئے ہمہ وقت تیار رہتا تھا اسلئے اسکو مقامات مقدسہ کا حامی کہنا زیادہ صحیح ہو سکتا ہے۔ نیز اسطرح کی بہت سی باتیں ہیں جو ان دونوں بادشاہوں کے روابط و ارتباط کے متعلق بیان کی جاتی ہیں۔

لیکن عربی تاریخوں کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نہ تو طبری نے اور نہ ابن اثیر اور ابو الفداء، ابن خلکان، ابن خلدون اور مسعودی و سیوطی نے ان دونوں بادشاہوں کے اتحاد و اتفاق کے افسانے بیان کئے ہیں اور نہ کسی اور متقدمین نے۔ البتہ متاخرین کی کتابوں میں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں، جو انگریزی تاریخوں سے ماخوذ ہیں۔ لیکن جب لاطینی تاریخ کی ورق گردانی کیجاتی ہے، تو لاطینی زبان کے ماہر کلینکلوز (Klienclause) کے خیالات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ "Annal Royal" اور حیات شارلمان (Lariede charlemagne) میں ہارون رشید اور شارلمان کا واقعہ نہیں بیان کیا گیا ہے۔ یہ صرف خرافات ہیں جنکو پادریوں اور پاپاؤں، نیز قرون وسطیٰ کے مورخوں نے شارلمان کی عزت افزائی کے لئے اختراع کیا ہے۔

لیکن جب میں "(Annal Royal)" اور حیات شارلمان (Lariede Charlamagne) کا مطالعہ کرتا ہوں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کتابوں میں ان دونوں کے تعلقات کا قطعاً ذکر نہیں ہے۔ جن لوگوں نے ان دونوں کے تعلقات اس سے ثابت کئے ہیں وہ صرف انکی غلط فہمی ہے اور انھوں نے صحیح طور پر محققانہ نگاہ اس عبارت پر نہیں ڈالی ہے کہ "بطریرک یورشلم اور شارلمان کے درمیان تحفہ ارمغان کا سلسلہ پایا جاتا ہے" غرضکہ اس تحریر سے بھی ان دونوں بادشاہوں کے تعلقات ثابت نہیں ہوتے ہیں۔

Marfat.com

لیکن سوئے فہم کی وجہ سے البتہ قرون وسطیٰ کے مورخوں نے اس افسانۂ باطل کو ایک اہم تاریخی واقعہ بنا دیا ہے۔ جس پر مابعد کے مورخوں نے بڑی بڑی ہوائی عمارتیں قائم کر دی ہیں۔

اور یہ بدعت سب سے پہلے جس نے جاری کی وہ "قدیس جول" (St Gaul) ہے۔ اسی نے تحفہ تحائف کے افسانے بیان کئے ہیں اور لکھا ہے کہ ہاتھی اور شیر اور مشرقی عجائبات ہارون رشید نے شارلمان کو بھیجے تھے، اور یہ اختراعات عجیب ۹۲۵ء مسیح یعنی شارلمان کی موت کے ۱۱۱ برس بعد ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ اور سب سے پہلے اسی کے (Laviede Charlamagne) کے مصنف "ایجن ہارڈ" (Eginhard) کے اقوال سے غلط فہمی ہوئی ہے جو سراسر اسکے قصور فہم کا نتیجہ ہے

اسکے بعد راہب رشنو نے قدیس جول کی تحریر پر اعتماد کرتے ہوئے ان خرافات میں اور بھی اضافہ کر دیا کہ یہی وہ پہلا شخص ہے امراء مشرق میں جس نے یورپ پر توجہ کی اور شارلمان کو صلیب کے مقدس ٹکڑے اور وہ جام مقدس جس میں جناب مسیح پانی پیا کرتے تھے تحفتاً بھیجا تھا لیکن پہلا قاصد جب جزیرہ کریٹ میں مر گیا تو دوسرے شخص کی معرفت ان ارمغان مودت کو شارلمان تک پہنچایا گیا۔

میرا جہاں تک خیال ہے کہ راہب رشنو کا اس سے یہ مقصد تھا کہ وہ گرجا شہرت و ہر دلعزیزی حاصل کر لے جس میں یہ تحائف رکھے گئے تھے۔

لیکن اس سے زیادہ جرأت راہب رشنو کی یہ ہے کہ سنہ ۹۶۵ء میں سابق سے زیادہ حیرت انگیز بات لکھ دی کہ شارلمان نے قبر مقدس کی زیارت کی اور اراضی مقدس ہارون رشید کو معاف کر کے اسکو ارض مقدس کا حامی قرار دیا۔ لیکن ان تمام افسانہ نگاریوں کو زیادہ عرصہ نہیں گذرنے پاتا ہے کہ اسپر سے پردہائے باطل اٹھ جاتے ہیں اور حقیقت اصل منکشف ہو جاتی ہے۔

میرے ان تمام بیانات سے قارئین اضطراب و پریشانیوں میں مبتلا ہو گئے ہونگے اور بے چین ہونگے یہ جاننے کے لئے کہ آخر پھر وہ کون سے اسباب تھے جنکی بنا پر قرون وسطیٰ کے مورخوں نے واقعات کی بڑی بڑی عمارتیں قائم کر دی ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ صرف انکی غلط کاریوں کا نتیجہ ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کے بیانات میں بیحد تضاد و اختلافات ہیں۔ اور اگر کسی نے وقتاً فوقتاً کسی کے بیان کی تصدیق بھی کی ہے تو بغیر حاشیہ و اضافہ کے اسکو لوگوں میں پیش نہیں کیا ہے، اور ظاہر ہے کہ جس واقعہ کے متعلق اسقدر اضطراب و الجھن ہو۔ کوئی کیونکر اسپر اعتماد و بھروسہ کر سکتا ہے اور کب انہیں میزان اعتقاد پر صحیح سمجھ سکتا ہے مثلاً سنہ ۸۲۹ء میں سیبون کا یہ کہنا کہ "ہارون رشید شاہ عجم تھا اور اس نے شارلمان کو اراضی مقدس عطا کیا تھا۔

اور سنہ ۱۶۷۹ء میں مزری کا یہ بیان کہ چونکہ شارلمان مذہبی غلو رکھتا تھا اسلئے ہارون رشید نے اسکو اراضی مقدس عطا کر دیا تھا۔"

لیکن پھر ربریق کا اسپر یہ اضافہ کہ "شارلمان نے ہارون رشید کو اراضی مقدس حفاظت و نگرانی کی غرض سے دیدیا تھا تاکہ پورے طور پر اسکی محافظت ہوتی رہے۔

پس کیا یہ اختلافات و زیادتیاں خود انکے اقوال و اعتقاد کو باطل ٹھہرانے کے لئے کافی نہیں ہیں، اور پھر کیا اسکو باور کرنے میں کسی کو شک و شبہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اور کیا میرا اسپر افسوس و تاسف کرنا اور یہ کہنا کہ اس واقعہ سے متعلق جتنی بھی جدید و قدیم تاریخیں ہیں وہ سب کی سب ان ہی قسم کی خرافات سے مملو ہیں

Marfat.com

جو یقیناً غور و فکر، تصحیح و ترتیب کی محتاج ہیں" غلط قرار دیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔

مگر چہ آج بھی ایسے لوگ دنیا میں موجود ہیں جو ان مجہول اور مشوش روایتوں پر اپنے دلائل و براہین کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔ اور اپنے ان ادعاء باطل سے صحیح واقعات کی تردید و مخالفت کرنا چاہتے ہیں، چنانچہ مسٹر "Brehier" نے بھی اپنے مقالہ میں کلنکلوز (Klinclausz) کے خیالات کی تردید کی اور ثابت کیا ہے کہ یقیناً ہارون رشید اور شارلمان میں تعلقات تھے، لیکن جب کلنکلوز کے مقالات شائع ہوئے اور اس نے اپنی تحقیقات اور تدقیقات کو پیش کیا تو "Brehier" نے اپنے نظریہ کے مطابق اسکی تردید کی اور ایک دوسرا مقالہ ریویو ہسٹری (Revue Historique) میں شائع کرایا جس کی تلخیص میں ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

(۱) اگرچہ اس زمانہ کے عیسائی بہت سخت اور متعصب ہوتے تھے لیکن پھر بھی ہارون رشید یوروشلم (بیت المقدس) کا بطریرک (مذہبی پیشوا) عیسائیوں ہی کو منتخب کیا کرتا تھا، اور یہی واقعات ہیں جن سے شارلمان اور ہارون رشید کے تعلقات بیّن طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں (اگرچہ آجکل کے علماء تاریخ عیسیوں کے تعصب سے انکار کرتے ہیں) مزید براں جب ہم بطریرک یوروشلم تودوسیوس کا وہ خط جو اس نے ۸۶۹ء میں لکھا تھا پڑھتے ہیں تو اس میں عربوں کے عدل و انصاف کی تعریف لکھی ہوئی پاتے ہیں۔

(۲) سارے بازنطینی اور اموئین جو سپین میں تھے وہ شارلمان اور ہارون رشید کے دشمن تھے۔ اور ان لوگوں کی یہ عداوت ان دونوں بادشاہوں کے باہمی تعلقات کی وجہ سے تھی۔

ہمیں حیرت و استعجاب ہے ان مورخین پر جو اپنے اس خیال میں اسقدر مستحکم و مستقل ہیں کہ بار بار کہا کرتے ہیں کہ ہمارے دلائل بہت قوی اور براہین زیادہ صحیح ہیں، لیکن کوئی ادھر تاکتا بھی نہیں کہ جس بنیاد پر وہ عمارت قائم کر رہے ہیں وہ کیسی ہے اور جن ماخذ پر یہ تمام تصریحات بیان کی جاتی ہیں وہ از روئے تنقید صحیح بھی ہیں یا نہیں؟

اسلئے میرا خیال یہ ہے کہ چونکہ عربی ماخذ میں کہیں بھی اسکا تذکرہ نہیں ہے اور وہ کتابیں جو لاطینی زبان کی ماخذ اصل قرار دی جاتی ہیں یعنی "Annai Royel" اور حیات شارلمان (Vie de Charlemagne) اور جمیع شارلمان اور بطریرک کے تحفہ تحائف کا تذکرہ ہے، اس سے ہارون رشید مراد نہیں ہے اور نہ ان کتابوں سے شارلمان کا "مالک ارض مقدس" ہونا ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ ہارون رشید اور شارلمان میں تعلقات تھے، غلط ہیں، نیز انکے علاوہ تحفہ تحائف کے جتنے واقعات ہیں خواہ وہ گھڑے ہو یا کنجی، شیر ہو یا ہاتھی، سب کے سب خرافات و اضافیات ہیں جنکو قرون وسطیٰ کے مصنفوں نے شارلمان کی تعظیم و تکریم ثابت کرنے کے لئے اختراع کر لئے ہیں۔ اور وہ کتابیں جن میں اس قسم کے تذکرے ہیں قطعاً قابل اسناد اور لائق وثوق نہیں ہیں۔

فخر عالم - بھاگلپور

جولائی ۱۹۳۲ء

جعفر برمکی

(از جناب نواب خواجہ عبدالمجید صاحب دہلوی)

برامکہ برمک کی اولاد۔ برمک آتشکدۂ نوبہار کا سادن[2] یعنی متولی تھا۔ نوبہار آذربائجان میں بر سرکوہ واقع کوہہائے شامخ[1] گرداگرد۔ سو برس کا کیا ذکر۔ صدیوں سے آگ روشن ہے۔ کہتے ہیں سو برس متواتر آگ جلتی رہے تو سمندر کیڑا پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر یوں ہی ہے تو معلوم نہیں یہاں کتنے سمندر پیدا ہو گئے ہونگے۔ اسکا ذکر بیکار اور طول سے خالی نہیں، پھر کبھی اس کی اصلیت پر روشنی ڈالونگا انشاء اللہ تعالیٰ۔

آتشکدہ میں معتقد روزانہ غول کے غول آتے ہیں۔ نورِ آتش سے آنکھیں پُرنور اور دل پُرسرور کئے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ مذہب میں شعبدہ بازی نہ ہو تو وہ مذہب ہی کیا۔ اپنی طرف کیوں راغب کرنے لگا۔ مندروں میں یہی ہو رہا ہے۔ کلیسا اور کنیسا بھی اس سے خالی نہیں۔ صنم کدہ، وثن کدہ، دیر اور یہ سارے جادوگر بنے ہوئے ہیں۔ کرشمہ سازی کے کارخانہ۔ کہیں حضرت مریم کسی خاص موقع پر مجسمہ میں سے باہر تشریف لے آتی ہیں۔ کہیں خاص دن اور خاص وقت پر مورتی بول اُٹھتی ہے۔ غرض ہر جگہ بچاری مخلوقِ خدا کو اُلو بنا رہے ہیں۔ یہ تو اسلام ہی کے دم قدم کی برکت ہے کہ نہ یہاں مسجد کے کسی کونے میں سے خدا بولے۔ نہ کسی مزار کے صاحب مزار سے باہر نکل آئیں۔ مذہب قبول کرو نہ کرو، مختار ہو۔ یہاں دغابازی اور فسوں سازی کا کام نہیں۔ سب حق ہے، اسکی طرف رغبت کرو تو بسم اللہ۔ نہیں تو تم جانو تمہارا کام۔

نوبہار کے سدنہ[2] نرالی شان کے عالم۔ خاندانی دستور و ساتیر کے حامل، جادوگری اور نیرنجات میں فرد۔ اپنی کرشمہ سازی سے آتشکدہ کی رونق بڑھاتے ہیں۔ روزی کے دروازے زرق سے کھولتے ہیں۔ ایسے خاندانوں کے دماغ پہلے ہی سے تیز ہوتے ہیں، اور کچھ ہو بھی جاتے ہیں۔ بُری بھلی ہر چیز میں تعلیم اور تربیت کو دخل ہے۔ اطاعت اور پیروی کرانے کا جذبہ انکی رگ و پے میں ساری ہوتا ہے۔ کاربراری کے لئے ہر حیلہ کو جائز تصور کرتے ہیں۔ ساری خدائی کو غلام بنانا اور مال و زر سمیٹنا انکا مدعا ہوتا ہے۔ جہاں جائیں گے اور جس حالت میں رہیں گے یہی داؤ کھیلیں گے۔ خواہ ملوک کی خدمت میں ہوں خواہ آتشکدہ کی۔ نہ عارف کی تخصیص ہے نہ عامی کی۔ نہ بادشاہ کی نہ گداگر کی۔ ان کو تو سب پر اپنا سکہ جمانا ہے اور بس۔ خصائل اور خصائص اکثر خاندانی ہوتے ہیں اور پشت در پشت چلتے ہیں۔

سرزمین ایران میں اسلام کا قدم آیا۔ عرب کے پے در پے فتوحات نے ایرانی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ کچھ بھاگ نکلے اور گجرات میں آن بسے۔ اپنے آبائی مذہب پر قائم رہے۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ سے ہندستان

---

[1] شامخ = ش - الف - م - خ = سر بلند

[2] سدنہ = س - د - ن - ہ = Priests جمع سادن بروزن عملہ جمع عامل۔

میں آتشکدہ روشن کئے۔ باقی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ معرکۂ کربلا اسی ملک کے قرب جوار میں رونما ہوا۔ ملک اثر پزیر ہوا۔ شہادت اور شہادت کے مظالم کے قصے زبان زد خاص و عام ہوئے۔ رستم اور اسفندیار کی داستانیں یہاں بچہ بچہ کو ازبر تھیں۔ تاریخی رنگ میں پیش کی جاتی تھیں۔ معرکۂ کربلا نے سب پر پانی پھیر دیا۔ شیفتہ اور فریفتہ ہو گئے۔ واقعہ حال کا چشم دید صحت میں شبہ نہیں۔ ہر مسلمان کو عترت رسول کے ساتھ عقیدت ہے۔ یہ اسکا ایمان ہے۔ جو منحرف ہوئے اُن پر دُنیا غالب تھی۔ ایرانی مسلمان تھے اور پکے مسلمان۔ کیسے اس جذبہ سے خالی رہ سکتے تھے۔ پھر یزید کے مظالم، اسکی بداعمالیاں، خاندانِ رسالت پناہ پر سختیاں، بے حرمتیاں، مدینۂ اطہر کی تباہی۔ مسجد نبوی کی بے حرمتی ایسے واقعات نہ تھے جن سے دل نہ ہل جاتے۔ اس پر طرہ یہ کہ ملک بھر میں علویوں کی دعوت کا سلسلہ۔ دُعات کی جگہہ جگہہ ریشہ دوانی۔ سارے ملک کو ہم خیال بنا لیا۔ سب علویوں کے جان نثار ہو گئے۔ یہی وجہہ تھی کہ بنی اُمیہ کا زوال ہوا اور بنی عباس بر سر اقتدار آ گئے۔ سارے ایرانی نے علویوں کی دعوت پر لبیک کہا۔ بنی عباس کے دھوکے سے غافل۔ دعوت بنی ہاشم کے نام پر ہے۔ یہی بیعت کا موضوع ہے۔ اسمیں علوی اور عباسی، دونوں شامل۔ جب کام تکمیل کو پہونچ گیا تو حقیقت بے نقاب ہوئی۔ اولاد علی کی جگہہ اولاد عباس تخت پر جا براجی۔ منصور کی دغا چل گئی۔ علویوں کو مات کھانی پڑی۔ جو حالت پہلے تھی وہی اب بھی رہی۔ ہنوز روز اول۔ پھر نئے سرے سے کام شروع کرو۔ جب جاکر کامیابی کا منھ دیکھنا۔ بنی فاطمہ کے عہد کا انتظار کرو۔ اب تو خلیفہ منصور کا برج ہے۔ یہی خاندانِ عباسیہ کا بانی ہے۔ ہارون اور مامون کے نام زبان زد خاص و عام ہیں۔ انکے افسانہ چار دانگ عالم میں گونج رہے ہیں۔ در اصل عباسیوں کی منزلت کا تاج منصور عباسی کے سر پر ہے۔ یہ تو پکی پکائی ہنڈیا پر آن بیٹھے ہیں۔ حکومت کا شباب تھا، مال و دولت کی کثرت۔ داد و دہش خوب ہوئی۔ نام روشن ہو گیا۔ منصور بیچارا سارا کرتا دھرتا پس منظر رہ گیا۔ اسمیں الف لیلہ کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ نہ یہ کتاب ہوتی، نہ ہارون الرشید منظر عام پر آتا۔ دوسرا جعفر اور عباسہ کا قصہ ہے، اس کا ذکر آگے آئیگا۔

پہلے ایرانیوں کے دلوں میں بغض بنی امیہ تھا۔ اب اسکی جگہہ بغض بنی عباس نے لی۔ غرض جہاں تھے وہیں رہے۔ خاندان برامکہ ایرانی الاصل، شیفتہ خانوادۂ علی مجبور، بر سر حکومت نہیں تو کیا کر سکتے ہیں۔ تاہم مدد میں کوتاہی نہیں کرتے۔ جتنا جس سے بن پڑا کیا۔ انجام کار ہوشیاری اور کارروائی کا بول بالا ہوا، بر سر اقتدار آ گئے۔ خلفا کے وزرا بنے، مال و دولت سمیٹا۔ ہر محکمہ پر قبضہ جمایا۔ اپنے ہم خیال اور ہم وطن اہل قلم اور اہل سیف متعین کئے۔ ساری سلطنت کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ خلیفہ کی جگہہ یہی راج کر رہے ہیں۔ مال و دولت بے پایاں، داد و دہش کی بھرمار۔ دُنیا بندۂ درم سب اسکے بندے۔ خلیفہ تک انکے اقتدار سے خائف۔ یہ دل و جان سے کوشاں کہ علوی سریر حکومت کو مزین کریں۔ ایک تو ان سے عقیدت، دوسرے انکی آڑ میں بیش سے بیشتر اقتدار حاصل کرنیکی آرزو۔ مطلب یہ کہ خلیفہ برائے بیعت رہے اور ہم سب کچھ۔

ہارون الرشید کو اطلاعیں مل رہی ہیں۔ انکے ہمہ گیر تسلط سے سہما ہوا ہے۔ برامکہ پر ہاتھ ڈالنا خلاف مصلحت، ملک میں فتنہ و فساد برپا ہونے کا اندیشہ۔ لیکن کب تک یہ حالت قایم رہ سکتی ہے۔ پانی سر سے گزرا جاتا ہے ایک طرف کنواں تو دوسری طرف کھائی۔ ہر روز انکی طاقت میں اضافہ اور خلیفہ کی طاقت میں انحطاط۔ علویوں کے ساتھ انکا ساز باز ساری خرابی کی جڑ۔ اور اعمال نظر انداز کئے جا سکتے ہیں، مگر یہ عمل موجب تخریب سلطنت و

Marfat.com

انہدام خاندان عباسیہ ہے، اس سے کیسے آنکھیں بند کیجا سکیں۔

کروڑہا روپیہ کی لاگت سے محل تعمیر ہوئے، پرخا نہیں۔ شعراء نے قصیدے لکھے ایسے کہ خلیفہ کو بھی وہ مدح نصیب نہیں۔ کیا مضائقہ۔ سواری کی شان و شوکت میں برتری نظر انداز کرنے کے قابل۔ یہ سب کچھ ہوا اور رشید کو خبر نہ ہوا۔ ——— آن کی تان اس واقعہ پر ٹوٹی، یحیی کو اُسکے سپرد کیا گیا۔ حبس میں رکھا جائے: کہیں نہ جانے پائے۔ یحیی علویوں کا سردار، سلطنت کا باغی۔ تمرد کی انتہا ملاحظہ ہو، اور علویوں کی بے باکانہ ہمدردی۔ جعفر نے اسکو بھگا دیا۔ یہ روپوش ہو گیا۔ ہارون الرشید کو پرچہ لگا۔ پہلے تو جعفر نے انکار کیا، جب خلیفہ نے اپنے سر کی قسم دی تو اقرار کیا۔ سمجھ گیا اطلاع ہو چکی ہے، اخفا بے سود ہے۔ آخر تھا تو حرفوں کا بنا ہوا۔ رشید کی عالی حوصلگی یا مصلحت بینی دیکھئے، یہ کہہ کر چپ ہو گیا خوب کیا۔ جب پیشگاہ خلافت سے واپس ہوا تو دور تک بری بری نظروں سے دیکھتا رہا۔ تاڑنے والے تاڑ گئے، حضور برہم ہو گئے ہیں، اب خیر نہیں۔ زوال کی گھڑی آنے لگی۔ سعایت[1] کے دروازہ کھل گئے۔ دشمنوں کی بن آئی۔ کبھی کبھی کے بغض نکالنے شروع کئے۔ وہی دکھتی رگ دبائی۔ علویوں کو برسر عہدہ لانا چاہتا ہے۔ اور اپنا اقتدار جمانا چاہتا ہے۔

اُدھر رشید کی ملکہ زبیدہ خاتون جعفر سے نالاں تھی، وہ اس فکر میں تھی کہ رشید کے بعد امین سریر آرائے خلافت ہو۔ مامون عمر میں بڑا، اکبر اولاد وارث تخت و تاج۔ فرق اتنا امین عرب کی سر برآوردہ خاتون زبیدہ کا لخت جگر۔ مامون ایسی بڑھیا ماں کا جایا نہیں۔ جعفر مامون کے پلے پر۔ دونوں بھائیوں میں ہارون الرشید کی موت پر جنگ ناگزیر۔ جعفر کی مدد فیصلہ کن۔ جعفر تو قتل ہو گیا، دونوں بھائیوں میں معرکہ آرائی ہوئی۔ امین ہارا اور مامون جیتا۔ زبیدہ نے سونے کی بیڑیاں سپہ سالار کے ساتھ کی تھیں، مامون کو پہنائی جائیں اور پابہ جولاں حاضر کیا جائے، بیکار گئیں۔ خبث باطن کے ثبوت میں تاریخ کے ورقوں پر ثبت ہیں۔ امین منصب خلافت کے شایان ہی نہ تھا، خود پسند خود بین۔ عیش و عشرت کا بندہ۔ لہو لعب اسکا دھندا، عقل سے بے بہرہ، اراذل کا ہم نشین ——— مامون کا نسب کچھ ہی ہو۔ شوخ، طرار، جری معاملہ فہم۔ غیروں کو اپنا بنا لینا اسکے بائیں ہاتھ کا داؤں۔ امین اپنوں کو بیزار کر دیتا تھا۔

جعفر اور اسکے سب بھائی اور اولاد قید ہوئے۔ پایان کار سپرد تیغ۔ سارے اسکے اہل کار اور ہوا خواہ معزول ہوئے۔ در بدر ہوئے۔ مگر عبداللہ برمکی کو رانج گیا۔ وجہ یہ کہ اس پر علویوں کی حامی ہونے کا الزام نہ تھا۔ جھوٹوں بھی کسی نے اس پر یہ تہمت نہ لگائی، اس امر کیلئے یہ ثبوت کافی ہے۔ علویوں کی پاسداری برامکہ کی تباہی کا باعث ہوئی۔

ہاں جعفر اور عباسہ کا قصہ تو رہ ہی گیا۔ اگر سچ بھی ہو تو کوئی تاریخی اہمیت نہیں رکھتا گو زبان زد خاص و عام ہے۔ افسانہ نویس جھوٹے سچے قصوں میں رنگ آمیزی کر کے مقبول عام بنا دیتے ہیں۔ افسانہ خود دلچسپ چیز ہے، اس میں تاریخ کا شائبہ بھی ہو تو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اگرچہ فن تاریخ اس سے مبرا ہے نفس تاریخ کے لئے نقصان دہ ہے۔ نتائج تاریخی میں غلطی واقع ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کبھی سلاطین

---

[1] سعایت: س۔ ع۔ الف۔ ی۔ ت۔ بد گوئی

کی کسرِ شان کا باعث ہوتا ہے۔ کبھی اُن کو اس مرتبۂ اخلاقی اور سیاسی پر پہنچا دیتا ہے جسکے وہ مستحق نہیں ہوتے۔ غرض افسانہ نویس تاریخ کی [illegible] کو خراب کر دیتے ہیں۔ اکثر عام اذہان اُس سے متاثر ہو کر اچھے یا بُرے خلاف واقعہ تصورات ملوک یا سبق اور واقعات یا سبق کی بابت باندھ لیتے ہیں، جو مفید کے بجائے مضر ہوتے ہیں۔ اور گمراہ کرتے ہیں۔ یہ بحث طویل، یہاں اسکا موقع نہیں۔

اس واقعہ سے تاریخی سبق یہ اخذ ہوتا ہے، ہمیشہ خود کام خواہ وہ کسی سلطنت میں ہوں لیکن مکر و تلبیس سے طاقت حاصل کرتے ہیں، سلطنت کا تختہ اُلٹ دینا چاہتے ہیں۔ اپنی طاقت کا غلط اندازہ لگاتے ہیں۔ اپنے زور میں آپ ہی آن رہتے ہیں۔ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار

جعفر برمکی کی اسلامی دنیا میں شہرت اُسکے دیے کی جوت ہے!

خواجہ محمد عبد المجید دہلوی

ستمبر ۱۹۲۳ء

Marfat.com

افسانۂ محاضرات

عریب مامونیہ

خلیفہ مامون رشید کی مشہور محبوبہ!

از

سید ریاست علی ندوی

عریب، خلیفہ مامون رشید کی مشہور محبوبہ تھی۔ اسی نسبت سے "مامونیہ" کہلائی۔

ابوالفرج اصفہانی لکھتا ہے:۔

"عریب، حسین مغنیہ تھی۔ بہترین اشعار کہتی تھی۔ بہترین خوشنویس تھی۔ حسن و جمال کی ملکہ تھی۔ اس کی گفتگو میں بڑی شیرینی اور نرمی تھی عود بہت اچھا بجانا جانتی تھی۔ موسیقی اور اس کے راگوں پر عبور رکھتی تھی اس کے ہم جنسوں میں حجاز کی چند گانے والیوں کے سوا کوئی اس کے رتبہ کو نہیں پہنچا۔ اور نہ خلفاء کی کنیزوں اور ان عورتوں میں، جن کی تربیت شاہی محلوں میں ہوئی کوئی اس کی ہمسری کو پہنچ سکی۔

عریب کون تھی؟

عریب کے خاندانی حالات حیرت انگیز ہیں۔ عریب، خلیفہ ہارون رشید کے مشہور وزیر، جعفر بن یحییٰ بن خالد برمکی کی لڑکی تھی۔ جب خلیفہ ہارون رشید نے برامکہ کے خاندان کو برباد کیا، تو یہ لڑکی چرا کر بیچ ڈالی گئی پھر زندگی کی مختلف منزلیں طے کرکے خلیفہ مامون کے محل میں پہنچی۔ اس اجمال کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

عریب کی ماں فاطمہ، ایک یتیم دوشیزہ تھی۔ جعفر بن یحییٰ برمکی کو اس سے محبت ہوگئی اور کچھ دنوں کے بعد اس سے شادی کرلی۔

جعفر کا باپ یحییٰ بن خالد سخت ناراض ہوا کہنے لگا۔

"تم نے ایک ایسی لڑکی سے شادی کی ہے، جس کے ماں باپ کا کوئی پتہ نہیں۔ ہزار لونڈیاں خرید لو، مگر اسے فوراً علٰحدہ کردو۔"

جعفر کو فاطمہ سے سچی محبت تھی۔ وہ نہ اسے جدا کرسکتا تھا نہ باپ کا حکم ٹال سکتا تھا۔ اس لئے اس نے فاطمہ کو ایک دوسرے محلہ میں ٹھہرا دیا جہاں چھپ چھپا کر جاتا رہا۔

عریب اسی محلہ میں سنہ ۱۸۱ھ میں پیدا ہوئی لیکن اس کی بدنصیبی سے ماں کا انتقال ہوگیا۔ اس لئے جعفر نے ایک عیسائی عورت کو اسکی دایہ مقرر کردیا۔

اس کے بعد سنہ ۱۸۷ھ میں خاندان برامکہ کی بربادی کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ ہارون رشید نے اپنے نامی وزیر جعفر بن یحییٰ کو

Marfat.com

قتل کرایا اور اس کے پورے خاندان کو تباہ و برباد کر دیا۔

اس ہنگامہ میں عریب پر بھی مصیبت آئی۔ اُس کی عمر صرف چھ سات سال کی تھی۔ عیسائی دایہ نے دولت کی لالچ میں اُس کو ایک بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ بردہ فروش نے اُسے مرّاکبی بن عبداللہ بن اسمٰعیل مراکبی کے ہاتھ بیچ دیا۔

مراکبی عریب کو بصرہ لے گیا۔ یہاں اس نے اس کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔ تحصیل علم کے بعد وہ ہر علم و فن میں یگانۂ روزگار بنی۔ خصوصاً علم نحو، شعر، ادب، موسیقی، اور خوشنویسی میں بڑا کمال پیدا کر لیا۔ شعر بھی کہنے لگی۔

عریب سے خلیفہ امین کا عشق

ہوتے ہوتے عریب کے حسن و جمال اور گانے کی شہرت قصر شاہی تک پہنچی۔ ہارون رشید کا لڑکا شاہزادہ محمد عریب پر فریفتہ ہو گیا۔ اس نے مراکبی سے اس کو خریدنا چاہا مگر مراکبی نے بیچنے سے انکار کر دیا۔

ہارون رشید کے انتقال کے بعد محمد امین کے لقب سے خلیفہ بنا تو ملک کے معززین و رؤسا، بیعت کے لئے دارالخلافہ آئے ان میں مراکبی بھی تھا۔ خلیفہ امین نے چوبدار کو ہدایت کر دی کہ جب مراکبی دست بوسی کا قصد کرے تو اس کو ہاتھ چومنے نہ دے۔ چنانچہ جب مراکبی امیرالمومنین کی دست بوسی کے لئے آگے بڑھا تو چوبدار نے اُسے روکنا چاہا۔ مگر اُس نے چوبدار کو زور سے دھکا دیکر ہٹایا اور بڑھکر ہاتھ چوم لئے اور کہا "تو مجھے امیرالمومنین کی دست بوسی سے روکتا ہے؟" اس گستاخی پر امین نے مراکبی کی گردن مارنے کا حکم دیا، لیکن پھر وزیروں اور مصاحبوں کی سفارش سے معاف کر دیا۔

اس کے بعد خلیفہ امین نے عریب کو دربار میں حاضر کرنے کا حکم دیا۔ اس نے دربار میں گانا سنایا۔ ہارون رشید کا بھائی، ابراہیم بن مہدی بھی موجود تھا، یہ موسیقی کا بہت ماہر تھا۔ خلیفہ امین نے عریب کے گانے کے متعلق اُس کی رائے پوچھی، تو اُس نے کہا۔

"اچھا گاتی ہے۔ اگر کچھ دنوں محل میں رہ جائے تو دربار کا رُعب دل سے دور ہو جائیگا۔ اس وقت اور زیادہ اچھا گائے گی"

امین نے عریب کو اپنے وزیر، فضل بن ربیع کے سپرد کیا کہ مراکبی سے اس کی قیمت طے کر کے خرید لی جائے۔ چنانچہ ایک لاکھ درہم قیمت ٹھہری، اس رقم کا کچھ حصہ اسی وقت ادا کر دیا گیا۔ اور عریب شاہی محل میں پہنچا دی گئی۔

کچھ دنوں کے بعد امین اور مامون میں خلافت کے لئے جنگ ہوئی۔ امین مارا گیا۔ مامون کی خلافت قائم ہو گئی۔

اس ہنگامہ میں مراکبی امین کے محل میں گھس گیا اور عریب کو زبردستی پکڑ کر اپنے گھر لے گیا۔ کیونکہ اب تک اس کی باقی قیمت ادا نہیں ہوئی تھی۔

عریب اور محمد بن حامد کی داستان عشق

اس اثنا میں عریب کو دربار کے ایک نوجوان مصاحب محمد بن حامد مزانی سے عشق پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ مراکبی کے یہاں سے بھاگ کر محمد بن حامد کے پاس چلی گئی۔ مراکبی نے اُسے واپس لانا چاہا، مگر وہ رضامند نہیں ہوئی اور نہ محمد بن حامد اس کو جدا کرنے پر تیار ہوا۔

آخر مراکبی نے مایوس ہو کر خلیفہ مامون کے دربار میں فریاد کی۔ مامون نے محمد بن حامد کو طلب کیا۔ حامد نے واقعے سے صاف انکار کر دیا اس پر مامون نے حکم دیا کہ اُسے ننگا کر کے اُس وقت تک کوڑے لگائے جائیں، جب تک عریب کو مراکبی کے حوالہ کر دینے کا وعدہ نہ کرے!

چنانچہ عام مجمع میں اُس کے کپڑے اُتارے گئے لیکن مارنے کے لئے جیسے ہی پہلا کوڑا اُٹھایا گیا، عریب نقاب الٹے ہوئے بھیڑ سے نکلی اور زور سے چلائی!

"اسے چھوڑ دو میں موجود ہوں۔ اگر میں کسی کی لونڈی ہوں تو بیچی جا سکتی ہوں۔ اگر شریف گھرانے کی ہوں، جیسا کہ میں سمجھتی ہوں، تو پھر مجھ پر کسی کا حق نہیں!"

عریب کا مقدمہ

مامون کو خبر پہنچائی گئی۔ اس نے حکم دیا کہ عریب کا مقدمہ قاضی قتیبہ بن زیاد کے پاس لے جایا جائے۔

مقدمہ پیش ہوا۔ عریب کی طرف سے خلیفہ امین کی ماں، زبیدہ بنت جعفر کی شہزادی شہادت گزری۔ زبیدہ نے بیان کیا۔

میرے لڑکے (یعنی خلیفہ امین) کے قتل کے بعد مجھ پر جو سب

زیادہ ظلم ہوا، وہ مراکبی کا ہے۔ وہ لڑائی کے ہنگامہ میں زبردستی محل میں گھس آیا۔ اور عریب کو پکڑ لے گیا!"

مراکبی نے جواب دیا کہ اس کی قیمت ادا نہیں ہوئی تھی اسلئے وہ اسکے لے جانے میں حق بجانب تھا۔

اس پر قاضی نے مراکبی سے عریب کے کنیز ہونے کا ثبوت مانگا۔ مگر اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ مراکبی بہت گھبرایا اور دربار میں آکر مامون سے عرض کرنے لگا۔

"مجھ سے ایسا ثبوت مانگا جاتا ہے جو آج تک کسی سے کسی کنیز یا غلام کی ملکیت کے لئے نہیں مانگا گیا۔"

خلیفہ مامون نے حکم دیا کہ اس مقدمہ کا مرافعہ قاضی محمد بن داقدی کی عدالت میں کیا جائے۔

قاضی محمد بن داقدی نے ساری روداد سنکر یہ فیصلہ کیا کہ عریب، مراکبی کو واپس نہ دی جائے۔ بلکہ فروخت کر دی جائے۔ اور یہ کہ قیمت مراکبی کو دی جائے۔ جو گویا اس کی فروخت کرنے کا معاوضہ ہوگا۔

عریب اور مامون

اب عریب کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔ مامون نے خود اس کے خریدنے کا قصد کیا۔ چنانچہ پچاس ہزار درہم اور ایک لاکھ دینار کی قیمتی یاقوت کی دو انگوٹھیاں، مراکبی کو معاوضہ دیا۔

عریب، مامون کے محل میں رہنے لگی۔ مامون کی دلچسپی اس سے روز بروز بڑھتی گئی۔ اور اس کے دل میں عریب کی بھی محبت پیدا ہو گئی۔

امیر المومنین، عریب کے قدموں پر

ایک مرتبہ لطف و محبت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کسی بات پر مامون اس قدر بے خود ہو گیا کہ جوش محبت میں عریب کے پاؤں چوم لئے۔

ایسا اعزاز آج تک کسی خلیفہ کی کنیز کو حاصل نہیں ہوا تھا۔

عریب کا دل فخر و غرور سے بھر گیا۔ مگر وہ بڑی ذہن رسا اور حاضر جواب تھی۔ اس نے مامون کے پاؤں چومتے ہی اس سے کہا۔

"امیر المومنین! خدا کی قسم اگر یہ پاؤں آپ کے مبارک لبوں سے مشرف نہ ہو گئے ہوتے تو ان کو میں ابھی کاٹ ڈالتی لیکن اب یہ عہد کرتی ہوں کہ جب تک زندہ رہوں گی، وضو کے سوا ان کو جب دھوؤں گی تو عرق گلاب ہی سے دھوؤں گی!"۔

عریب کی حاضر جوابیاں

عریب بڑی حاضر جواب تھی۔ ایک دفعہ مامون سے ان بن ہو گئی۔ چند روز ملاقات نہیں ہوئی۔ پھر جب سامنا ہوا تو مامون نے پوچھا "جدائی کا مزہ کیسا پایا؟"

عریب نے جواب دیا "جدائی کی تلخی نہ ہوتی تو وصل کی شیرینی نہ ملتی"۔ اسی طرح ایک مرتبہ عریب نے رنجیدہ ہو کر مامون سے ملنا چھوڑ دیا۔ چند روز کے بعد مامون قاضی احمد بن ابی داؤد کو ساتھ لے کر عریب کے پاس آیا اور قاضی کو مخاطب کرکے کہا "احمد! ذرا ان کے اور میرے معاملہ میں انصاف کرو"

عریب بول اٹھی "قاضی جی کو دخل در معقولات کی ضرورت نہیں ہے

نخلط الھجر بالوصال ولا
یدخل فی الصلح بیننا احد

(ہم ہجر کو وصال سے ملاتے ہیں۔ ہمارے بیچ میں کوئی نہ پڑے)۔

پرانے عشق پر عریب کی استواری

لیکن شاہی محل میں عریب کی اس زندگی سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ اس نے اپنے محبوب محمد بن حامد کو دل سے بھلا دیا تھا۔ اگرچہ وہ عدالت کے فیصلے سے بک گئی تھی اور مامون کے قبضہ میں آئی تھی۔ مگر مامون اس کے دل پر قبضہ نہ کر سکا تھا جو ہمیشہ کے لئے محمد بن حامد کا ہو چکا تھا۔ عریب اور محمد بن حامد کی ملاقات روزانہ ہو جاتی تھی۔ کیونکہ عیش و طرب نبیذ کی صحبتوں میں یہ دونوں ضرور موجود رہتے۔

ایک مرتبہ مامون مصاحبوں کے ساتھ دور صبوحی میں مشغول تھا۔ حسب معمول عریب اور محمد بن حامد بھی محفل میں شریک تھے۔ محمد نے نگاہ بچا کر عریب سے بوسہ کا اشارہ کیا۔ اشارہ کسی نے نہیں دیکھا۔ عریب تیزی کے ساتھ اپنے قالین پر سے اٹھی اور ساز اٹھا کر گانے لگے۔ گانا جس شعر سے شروع

Marfat.com

کیا وہ اصل میں ابن حامد کے اشارہ کے جواب میں تھا۔ مامون کی ذہانت ضرب المثل تھی۔ شعر سنتے ہی معاملہ کی تہ تک پہنچ گیا اور زور سے چلایا:۔

"بتاؤ کس نے عریب کو بوسہ کا اشارہ کیا تھا؟
اگر وہ خود اقرار نہیں کرے گا تو پتہ لگا کر اس
کی گردن اڑا دوں گا۔"

ساری محفل سناٹے میں آ گئی۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ابن حامد تھرتھراتا ہوا آگے بڑھا اور سر جھکا کر اس طرح اعتراف کیا "امیرالمومنین! اس خطاکار سے یہ قصور سرزد ہوا۔ اب رحم اور معافی کا طالب ہے!

مامون کا غصہ فرو ہو گیا۔ نگاہیں نیچی کر لیں قصور معاف کیا۔ اس واقعہ سے مامون کو پہلی مرتبہ علم ہوا کہ ان دونوں کی آتش محبت کی چنگاری ابھی تک دلوں میں دبی ہوئی موجود ہے اور یہ واقعہ تھا کہ دونوں چھپ چھپا کر کبھی کبھی ملاقاتیں کرتے تھے۔ اور مامون رشید ان دونوں کی بھی محبت کا پاس کر کے طرح دے جاتا تھا چنانچہ احمد بن حمدون نے عریب اور ابن حامد کے تعلقات اور مامون کے رویہ کا یہ عجیب چشم دید واقعہ بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

ایک مرتبہ مامون لشکر لیے رومیوں کے ملک میں پڑاؤ ڈالے تھا۔ ایک رات میں بھی امیرالمومنین کی مجلس میں بیٹھا تھا کہ انھوں نے مجھ سے فرمایا:۔

"تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر ابھی معتصم کے لشکر میں چلے جاؤ۔ میرا یہ خط دینا اور زبانی یہ پیغام سنانا۔"

میں فوراً روانہ ہو گیا۔ رات اندھیری تھی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ ہوا بھی بہت تیز تھی۔ ساتھ کی شمع بجھ گئی۔ اسی لئے میں نے گھوڑے کی رفتار سست کر دی۔ میں آہستہ آہستہ جا رہا تھا کہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں دور سے ایک گھوڑے کی ٹاپ کی آواز سنائی دی۔ بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ اتنے میں گھوڑا قریب آ گیا اور بجلی کی چمک میں سوار کا چہرہ دکھائی دیا۔ یہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ گھوڑے پر عریب سوار تھی۔ میں نے تعجب سے پوچھا "کون؟ عریب!"۔

اس نے جواب میں کہا "ہاں تم کون؟ حمدون ہو؟"

میں نے کہا "ہاں" اور پوچھا اس وقت تم کہاں سے آ رہی ہو؟"

اس نے جواب دیا "محمد بن حامد کے پاس سے"

میری زبان سے نکل گیا "اس وقت اس کے پاس کیا کرنے گئی تھیں۔!!

اس پر وہ بلند آواز میں تیزی سے کہنے لگی: "عجیب بات ہے! میں محمد بن حامد کے پاس سے آ رہی ہوں۔ خلیفہ کے خیمہ کے باہر ہوں اور اسی کے خیمہ میں لوٹ کر جا رہی ہوں اور تم پوچھتے ہو کہ محمد بن حامد کے پاس کیا کرنے گئی تھی: میں کیا بتاؤں تراویح پڑھنے گئی تھی یا قرآن تلاوت کرنے۔ یا ابن حامد کو فقہ کا سبق پڑھانے؟ احمق! ہم دونوں مل بیٹھے۔ ہنسے بولے۔ پھر خوب شراب پی۔ جی بھر کر گایا بجایا۔ لطف اٹھایا۔ اب میں خلیفہ کے پاس جا رہی ہوں۔ کہو سمجھ میں آ گیا؟"

ابن حمدون کہتا ہے:۔

"عریب کے اس جواب سے میں سخت شرمندہ ہو گیا۔ اور خاموشی سے اپنا گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ لیکن میں راستہ بھر پیچ و تاب کھاتا رہا۔ میرے دل سے عریب کی اس بیباک اور توہین آمیز گفتگو کا خیال دور نہیں ہوا۔ جی چاہا کہ سارا قصہ مامون کو سنا دوں مگر ہمت نہ پڑی۔ پھر مجھے یہ تدبیر سوجھی کہ نظم میں عریب پر چوٹ کروں اور مامون کو سناؤں: اگر مامون پوچھے گا تو اس کو سارا قصہ سنا دوں گا۔ چنانچہ اسی خیال سے میں نے اسی مطلب کے چند شعر مامون کے سامنے پڑھے۔ شعر سن کر مامون نے صرف اس قدر کہا "ذرا اپنی آواز دھیمی کر لو۔ کہیں عریب سن نہ لے۔ غضب ہو جائے گا۔ یہ سمجھے گی کہ ہم لوگ اسی کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں!

عریب کو قید تنہائی کی سزا

لیکن عریب اور محمد بن حامد کے تعلقات نے آگے

چل کر بڑی بدنما شکل اختیار کرلی۔ عریب اُس سے حاملہ ہوگئی اس حادثہ کی خبر جب مامون کو ہوئی تو اس کی نگاہ لطف و محبت قہر و غضب سے بدل گئی اور اس نے عریب کو اس سنگین جرم کی سخت سزا دینے کا فیصلہ کرلیا۔ چنانچہ عریب کو

موٹے اونی کپڑے پہنائے گئے اور تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر دی گئی۔

قید تنہائی میں پورا ایک مہینہ گزر گیا۔ کتیسویں دن وہ نکالی گئی تو ابن حامد ہی کا وظیفہ پڑھ رہی تھی! مامون کو سخت تعجب ہوا اس نے یقین کر لیا کہ محمد بن حامد کی یاد اس کے دل سے کسی طرح نکالی نہیں جا سکتی۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے بلند اخلاق کا ثبوت دیا اور صبر و ضبط کے ساتھ دونوں کی شادی کر دی۔ البتہ یہ شرط لگا دی کہ عریب بدستور دربار میں آکر گانا سناتی رہے گی۔

قسمت کا کھیل مامون کی فراخ دلی سے عاشق و معشوق مل گئے تھے مگر تقدیر ہنس رہی تھی۔

چند ہی روز کے بعد محمد بن حامد کا انتقال ہوگیا اور عریب پھر شاہی محل میں چلی آئی۔ مامون نے پچھلی خطائیں معاف کر کے اس کو گلے لگا لیا۔ اور جب تک زندہ رہا اس سے لطف و محبت کا برتاؤ کیا۔

مامون کے بعد بھی عریب شاہی محل سے وابستہ رہی اس نے مامون کے بعد تین خلیفہ معتصم، واثق اور معتمد کا زمانہ پایا۔ اور ان سب عباسی خلفا اور شاہزادوں میں عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی بلکہ شاہی خاندان کی سیاسیات میں بھی اثر و رسوخ رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے خلیفہ معتصم کے زمانہ میں مامون کے لڑکے عباس سے معتصم اور اس کے ولیعہد واثق کے قتل تک کی سازش کی اور اس کی تحریر پکڑی گئی۔ مگر کوئی اس کا بال بیکا نہ کر سکا۔ نویری اور اصفہانی لکھتے ہیں کہ صرف یہی واقعہ اس کے رسوخ و اثر کے اندازہ کے لئے کافی ہے۔ عریب نے ۹۶ سال کی عمر میں تقریباً ۲۲۶ھ میں وفات پائی۔

(کتاب الاغانی ابوالفرج اصفہانی و نہایۃ الادب فی فنون الادب۔ نویری)

اگست ۳۸ء

اسپین موجودہ خانہ جنگی سے پہلے

از

جناب معین الدین صاحب دردائی، بی اے آنرز (علیگ)

اسپین کی موجودہ سیاسی رفتار پر ساری دنیا کی نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ اسپین موجودہ انقلاب کے دروازہ پر کیونکر پہنچا، اس کا اندازہ ذیل کے مقالہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس میں اسپین کی موجودہ خانہ جنگی سے پہلے کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ خصوصاً ذیل کی دو کتابوں سے ماخوذ ہے

(۱) Spain In Revolt By Harry Gannes And Theodore Repard

(۲) Spanish Front by Carlos Prieto.

یہ دونوں کتابیں نومبر ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی ہیں۔ اور لندن کے دو مختلف مطبعوں سے شائع ہوئی ہیں۔ ان میں آخرالذکر کتاب ایک ہسپانوی مصنف کی ہے جس پر میں نے بہت زیادہ اعتماد کیا ہے۔

"معین الدین دردائی"

حکومت اسپین کی صدارت پر ۱۹۳۶ء میں سنر ازانا کے انتخاب سے نہ صرف اسکے طرفداروں بلکہ عام پبلک کے درمیان یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ اس کے منتخب ہونے سے مبادا ملک کے آئین و ضوابط کو نقصان پہنچے۔ کیونکہ یہ خوف پیدا ہو گیا کہ یہ وزارت ایک آزاد خیال جمہوریت پسند جماعت کی طرح انتہا پسند رائٹ پارٹی اور با اقتدار لفٹ پارٹی کے درمیان سیاسی توازن قائم نہ رکھ سکے گی۔ لیکن ساتھ ہی ازانا کی جگہ کسی اور ایسے دوسرے آدمی کا ملنا بھی جو اس مشکل گھڑی میں اپنی صلاحیت اور اقتدار سے کابینہ کو اپنے قابو میں رکھ سکے، مشکل تھا۔

دوسری کابینہ کا تقرر کچھ عرصہ کے لیے ملتوی کر کے وقتی طور پر وزیر خارجہ سنر بارسیا کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ اس کا جانشین قیصر قیروگا ہوا جس نے ۱۲ مئی کو ایک نئی ڈیموکریٹک جمہوری وزارت کا اعلان کیا۔

Marfat.com

۱۹ ارمئی کو نئے وزیر اعظم نے کورٹس کو مطلع کیا کہ موجودہ کابینہ جیسا کہ انتخاب سے پہلے اعلان کیا جا چکا ہے پوپلر فرنٹ (Papular Front) کے پروگرام پر عمل درآمد کرے گی۔ اس کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ مفاد عامہ سے متعلق جو کچھ بھی اس نے وعدہ کیا ہے اسکو جلد از جلد پورا کرے، اور خصوصیت کے ساتھ زراعتی اصلاح اور بیکاری کی طرف بہت زیادہ زور دے۔ اس نے حکومت کے تمام دشمنوں کو عبرتناک سزائیں سے ڈراتے ہوئے بہت ہی صاف لفظوں میں بیان کیا کہ فاسشٹ پسندوں کو موجودہ کابینہ کے ہر قانون کے سامنے سر اطاعت خم کرنا ہوگا۔

اسکے جواب میں مخالف پارٹی کے لیڈر جل روبل نے لفٹ پارٹی سے حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اس جماعت پر گورنمنٹ کو اعتماد نہیں کرنا چاہئے یہ صرف موقع اور محل کی منتظر ہے۔ جس وقت اسے موقع ملے گا یہ گورنمنٹ اور جمہوریت دونوں کا قلع قمع کرنے سے باز نہیں آئے گی

رائٹ پارٹی کے لیے یہ بہت نازک موقع تھا۔ اگر وہ خاموش رہتی ہے تو لفٹ پارٹی کی طاقت کا بڑھتا ہوا سیلاب اسے خس و خاشاک کی طرح بہا دیتا ہے اور اس وقت کھلم کھلا بولنا بھی خطرہ سے خالی نہیں تھا۔

رائٹ پارٹی کے سرگرم حامی شہنشاہیت پسند، زراعت پیشہ اور روایت پسند تھے۔ ان کے علاوہ کیلاوسوٹو کے پیرو اور فوجی ڈکٹیٹرشپ کے طرفدار بھی اپنی پوری طاقت سے اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ فوج میں ان لوگوں کا بہت کافی پروپگنڈا تھا۔ اور عام طور سے افسروں میں فاسشٹ اور شہنشاہیت پسندوں کی تعداد ۸۰ فی صدی سے کم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ سیاسی حیثیت سے یہ لوگ بہت زیادہ مشتبہ نگاہ سے دیکھے جاتے تھے لیکن پھر بھی رائٹ پارٹی کے لیڈر اس پر یقین رکھتے تھے کہ اگر معقول پروپگنڈا کر دیا جائے تو فوج نازک گھڑی میں اپنے افسروں کا ساتھ نہ چھوڑے گی اور ان کے حکم پر چلے گی۔ سنہ ۱۹۳۶ کے موسم بہار میں فاسشٹ پسندوں کی طرف سے بہت سے پمفلٹ شایع کیے گئے۔ فوج میں ان کی بہت زیادہ تشہیر ہوئی۔ افسروں میں خاص طور پر اس کی سب سے زیادہ اشاعت ہوئی۔ اور اسی پروپگنڈا کا نتیجہ بہت ہی ہولناک ثابت ہوا۔

مئی کے تیسرے ہفتہ میں افسروں کی ایک جماعت نے الکالا پہنچکر ہر قسم کے حکم کے ماننے سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں کو فوراً طلب کر کے کورٹ مارشل کیا گیا اور جو اس تحریک کے لیڈر تھے ان کے ساتھ اور بھی زیادہ سخت سلوک کیا گیا۔ جس بے رحمی اور بے جگری سے یہ فوجی بغاوت فرو کی گئی اس نے عوام کو نئے وزیر اعظم کے آیندہ رویہ سے اچھی طرح آگاہ کر دیا۔

رائٹ پارٹی کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس نے اب تک کسی ایک پروگرام پر عمل کرنے کا پورا تہیہ نہیں کیا تھا۔ اس کے برخلاف لفٹ پارٹی کے سامنے صرف ایک پروگرام تھا جس پر اسکی پارٹی کے تمام افراد اپنے تمام اختلاف و تفرقہ کو پس پشت ڈال کر متحدہ طور پر کام کرنے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔ مزدور اور کاشتکار طبقہ اپنی جہالت کی وجہ سے ابھی تک سیاست سے بالکل بے خبر تھا لیکن مصیبت اور ظلم

Marfat.com

سہتے سہتے آخر ش انہیں اتنی سمجھ ضرور آگئی تھی کہ وہ اپنے دوست دشمن میں اچھی طرح تمیز کر سکیں۔ وہ لوگ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ وہ زمیندار اور سرمایہ دار جو ان لوگوں کا خون چوس کر جیتے ہیں ان کے دوست کبھی بھی نہیں ہو سکتے۔ ان کی کمائی ہوئی دولت پر عیش کرنے والے ان کے دشمن ہیں اور دشمن ہی رہینگے،

اندلس، اکسٹرمدا، کاسٹائل وغیرہ میں کاشتکاروں نے بغیر کسی ہنگامے اور خون ریزی کے تمام اراضی پر قبضہ کر لیا۔ مزدوروں نے اس امید میں کہ کسانوں کی خوشحالی سے ان کی بھی خوشحالی ہوگی ان کا پورا ساتھ دیا۔ اس طرح مزدوروں اور کاشتکاروں کے اندر ایک خاص قسم کا اتحاد پیدا ہو گیا جس نے ان کو اور ان کی تحریک دونوں کو بہت زیادہ اہم بنا دیا۔ اسپین کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جس میں اسپین کی اتنی بڑی آبادی ایک سیاسی پروگرام پر متفق ہو گئی تھی۔

لفٹ پارٹی مختلف سیاسی جماعتوں کا مجموعہ تھی اس میں مزدور، انقلاب پسند، اشتراکیت پسند، اور سوشلسٹ سب ہی شامل تھے۔ مندرجۂ ذیل اعداد سے ہمیں لفٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس میں مختلف سیاسی جماعت کے کتنے کتنے افراد شامل ہیں:۔

انقلاب پسند	۱۵۱۰۰۰۰۰
اشتراکیت پسند	۱۰۲۰۰۰۰
سوشلسٹ	۶۰۰۰۰
مزدور پیشہ	۲۰۰۰۰۰۰
میزان کل	۳۶۶۲۰۰۰

۱۰ مئی کو ساراگوسا میں انارکو سنڈکلسٹ کانگریس نے سوشلسٹ جنرل لیبر یونین کے ساتھ ملکر ایک سیاسی انقلاب کرنے کی تجویز پیش کی اس تجویز میں موجودہ معاشرتی قوانین اور سیاسی طرز حکومت کو برباد کر دینا بھی داخل تھا۔ گرچہ اس کو جنرل لیبر یونین نے فوراً ہی منظور نہیں کیا لیکن اسپین کے لفٹ پارٹی کے ممتاز لیڈر لارگو کیبلرو (Largo Caballero.) نے اس تجویز کا بہت پرزور خیر مقدم کیا۔ اس نے صاف الفاظ میں بیان کیا کہ اگر تمام لفٹ تحریک متحد ہو جائے تو پھر کوئی منظم طاقت حتیٰ کہ سلطنت بھی ملکر اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

لفٹ پارٹی میں سب سے مرتب اور منظم جماعت کمیونسٹ کی تھی لفٹ پارٹی کے دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ اس کے مفاد کے لیے ایک زبردست انقلاب کا ہونا ضروری ہے۔ عجب اتفاق کہ اس وقت ملک کے ہر حصہ میں انقلابی خیالات بہت زوروں پر جاری اور ساری تھے۔ شعر و شاعری نثر و سرود اور گانے بجانے غرض ہر نغمہ سے: انقلاب کی لے سنائی دے رہی تھی اسپین کے چھاپہ خانے عام پبلک کے مطالبات کے مطابق کثرت کے ساتھ پرولٹرین (Proletarians) ادب شائع کرتے۔ عوام اسے ہاتھوں ہاتھ

Marfat.com

لیتے، پڑھتے اور پڑھکر آپس میں تبادلہ خیالات کرتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ عوام سیاست سے بہت اچھی طرح واقف ہو گئے۔

یہ عوام کے لیے بڑی مصیبت کا زمانہ تھا قریب قریب ملک کے ہر حصہ میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کی کشمکش جاری تھی اس کا نتیجہ لازمی طور پر اسٹرائک ہوتا اور کبھی کبھی بے روزگاری بھی۔ اس خلفشار سے ٹرامویے اور ریلوے تک متاثر ہو جاتیں۔

۱۶ جون کو سنیر جل روبل نے رائٹ مونش کی مدافعت کرتے ہوئے حکومت سے امن و امان قائم کرنے کا پرزور مطالبہ کیا۔ اس سلسلہ میں اس نے کورٹس کو بہت سی تازہ مالی اور جانی نقصانات سے آگاہ کرتے ہوئے انکی ایک طویل فہرست بھی شائع کی تھی جسکے رو سے ۱۶۰ گرجے مسمار، ۲۵۱ گرجے ضرر رسیدہ ۲۶۹۰ آدمی قتل اور ۱۲۸۷ زخمی ہوئے تھے۔ نقصان رسیدہ عمارتوں کی تعداد ۱۳۸۱ اسٹرائک کی تعداد ۱۱۳ اور جزوی اسٹرائک کی تعداد ۲۰۲ بتائی گئی تھی۔ ۱۴۳ اخبار کے دفتر بھی برباد کر دیئے گئے تھے اس طویل فہرست کے شائع کرنے کے بعد جل روبل نے بے خوف ہو کر کہا کہ یہ سب پاپولرز فرنٹ کی فتح کے بعد کا واقعہ ہے۔ اسلیے یقینی طور پر موجودہ گورنمنٹ دیانتداری سے ہرگز حکومت نہیں کر رہی ہے۔

جون ہی کے مہینہ میں اس افواہ سے کہ فاسسٹ جماعت موجودہ گورنمنٹ کا تختہ الٹ دینے کی تدبیر میں مشغول ہے میڈرڈ میں زبردست سنسنی پھیل گئی تھی۔ اسی اثنا میں اتفاق سے ایک فوجی افسر کی گرفتاری عمل میں آئی جس پر بھیس بدل کر سول گارڈ کے ممبروں میں شامل ہونے کی کوشش کرنے کا الزام عائد کیا گیا تھا اور اس تہ میں گویا موجودہ طرز حکومت کے خلاف شہنشاہیت پسندوں کی بغاوت مضمر تھی۔ اس واقعہ سے تھوڑے ہی عرصہ بعد پولس نے ایسی بہت سی وردیوں پر قبضہ کیا جو بھیس بدلنے کے کام میں لانے کے لیے سراگوسا سے میڈرڈ بھیجی گئی تھیں

مئی اور جون کے مہینہ میں بہت سے وہ تعلیمی ادارے جو گرجے کے زیر نگرانی تھے مستقل طور پر بند کر دیے گئے۔ اس رویہ کے خلاف بہت سے طالب العلم۔ ان کے والدین اور اساتذہ نے صدائے احتجاج بلند کی والدین آپس میں جو کچھ بھی سیاسی خیالات رکھتے ہوں لیکن قطعی تعلیم نہ دلانے سے اپنے بچوں کو مذہبی معلموں کے زیر نگرانی تعلیم دلانے کو بہتر سمجھتے تھے۔

جون کے مہینہ میں صوبہ گلیشیا کے مطالبہ کے بعد "اختیار خود انتظامی" دینے پر مباحثہ ہوا جس کا نتیجہ کسٹائل اور اندلس کو "اختیار خود انتظامی" بخشنے کی مطابقت میں نکلا۔ ویلینسیا میں بھی "اختیار خود انتظامی" کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔

اصلاحی پارٹی اور ڈموکریٹک جمہوری گورنمنٹ دونوں رائٹ پارٹی سے خطرہ محسوس کر رہی تھیں اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھ رہی تھیں کہ اگر ایسی نازک حالت میں انکا کوئی مددگار ہو سکتا ہے تو صرف لفٹ پارٹی ہے۔ پورا اسپین عجب سراسیمگی کے عالم میں مبتلا تھا۔ اسٹرائک، شورش، اور بدامنی نے باشندوں کو سخت پریشان کر رکھا تھا۔ شروع جولائی میں فاسسٹ جماعت کے اشتعال پر قریب قریب اسپین کے ہر حصہ میں خونریزی کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔

ہر شہر میں ایسوسی ایشن اور انجمن قائم ہونے لگیں ۱۲ جولائی کی شب کو شاک پولس کا ایک لفٹنٹ جوز کسٹلو نامی ایک فاسسٹ کے ساتھ سے قتل کیا گیا۔ اسی صبح کو کچھ آدمیوں کا ایک گروہ شاک پولس کی وردی میں رائٹ پارٹی کے ممتاز

Marfat.com

لیڈر سنر کلاو سوموخو کے مکان میں گھس گیا اور اسے بڑی سفاکی سے قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ نے رائٹ اور لفٹ پارٹی کو ایک دوسرے کے آمنے سامنے میدان میں لا کر کھڑا کر دیا۔ گورنمنٹ نے کورٹس بند کر کے کابینہ کی ایک غیر معمولی مجلس طلب کی جس میں رائٹ پارٹی کے مددگاروں اور طرفداروں کے خلاف بہت سی تجاویز پاس کی گئیں اور اسکے بعد ان لوگوں کی سینکڑوں گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ اور رائٹ اور لفٹ پارٹی کی خانہ جنگی اپنی انتہائی شدت کو پہنچ گئی۔

نومبر ۶۳ء

اسپین کا ایک نامور مسلمان حکمراں

خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر

سنہ ۳۰۰ھ / ۹۱۲ء — سنہ ۳۵۰ھ / ۹۶۱ء

(از جناب مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ)

اندلس میں اموی سلطنت پر ڈیڑھ سو برس گزر چکے تھے۔ عبد الرحمن الداخل (سنہ ۱۳۹ھ / ۷۵۶ء — سنہ ۱۷۲ھ / ۷۸۸ء) کا لگایا ہوا اموی سلطنت کا پودا، تناور ہونے کے بعد پھل پھول کر بوڑھا ہو چکا تھا۔ اسلامی اندلس کی ہمسایہ عیسائی حکومتیں اس تناور درخت کی بار آور شاخیں مختلف سمتوں سے کاٹ کاٹ کر علحدہ کر چکی تھیں۔ بڑے بڑے اہم شہر عیسائیوں کے قبضہ میں جا چکے تھے۔ اور باغیوں نے مضبوط قلعہ بندیاں کر لی تھیں۔ اندلس کے عربوں اور بربروں میں قبائلی عصبیت جڑ پکڑ چکی تھی۔ مختلف علاقوں کے مسلمان والیوں اور قبائلی سرداروں نے مختلف شہروں میں اپنی اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں اور بعضوں نے اپنا رشتہ خلافت عباسیہ یا فاطمیہ سے جوڑ لیا تھا۔ یا جوڑنے کا تہیہ کر لیا تھا گویا اسوقت اندلس کے اموی فرمانرواکی حکمرانی صرف دار السلطنت قرطبہ کے آس پاس باقی رہ گئی تھی۔

اندلس میں اموی سلطنت کی یہی سیاسی منزلت تھی کہ نوجوان اموی شہزادہ عبد الرحمن (ابو المطرف بن محمد بن عبد اللہ بن محمد بن عبد الرحمن، بن حکم ربضی بن ہشام بن عبد الرحمن الداخل) صرف ۲۲ سال کی عمر میں تخت سلطنت پر بیٹھا۔ اس نے حکومت کی باگ سنبھالتے ہی اس میں نئی جان ڈال دی۔

عبد الرحمن کا باپ، ولی عہد محمد، شاہی خاندان کی باہمی رقابت میں شاہی محل میں قتل کیا گیا تھا۔ اسوقت یہ نو مولود بچہ عبد الرحمن صرف ۲۱ روز کا تھا۔ اسکے شفیق دادا عبد اللہ (امیر اندلس ۲۷۵ھ — سنہ ۳۰۰ھ / ۹۱۲ء) کی گود میں اسکی تعلیم و تربیت ہوئی۔ دینی علوم عربی علم ادب کی اعلیٰ تعلیم دی گئی۔ ذہانت کے آثار بچپن ہی سے ہویدا تھے۔ امیر عبد اللہ نے اسکے مقتول باپ کی جگہ اس کو ولی عہد نامزد کیا۔ خداوند تعالیٰ نے اسکے چچاؤں کے دلوں کو بھی رحمت و شفقت سے بھر دیا۔ وہ لوگ بخوشی اسکے حق میں منصب امارت سے دستبردار ہو گئے۔ اور سنہ ۳۰۰ھ / ۹۱۲ء میں اسکے بوڑھے چچاؤں اور نوجوان بھائیوں نے خوشی خوشی تخت پر بٹھایا۔ اسوقت وہ ان کی امیدوں کا مرکز تھا۔ اسکی ذہانت۔ تدبر اور دور اندیشی سے وہ سمجھتے تھے کہ شاید یہ نوجوان امیر

Marfat.com

اندلس کی حکومت امویہ کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھال لے۔ اس نے بڑی دانائی و ہوشمندی سے حکومت کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مؤرخین کا اتفاق ہے کہ اسلامی اندلس میں اس سے زیادہ ہوشمند اور بیدار مغز فرمانروا کوئی دوسرا نہیں گذرا۔

عبدالرحمن نے اپنے پنجاہ سالہ دور حکومت میں جو سیاسی و عمرانی کارنامے انجام دیئے وہ حسب ذیل قرار پا سکتے ہیں:-

۱- اندلس کے خودسر مسلمان باغیوں کی سرکوبی اور سارے اسلامی اندلس پر غیر مشروط قبضہ۔

۲- اندلس کی عیسائی حکومتوں کی قلعہ بندیوں کو توڑنا اور انہیں زیر کر کے مطیع بنانا۔

۳- اموی سلطنت کی توسیع مغرب و افریقہ میں اور دولت فاطمیہ افریقیہ پر برتری حاصل کرنا۔

۴- اندلس میں اموی خلافت کا احیا۔

۵- یورپ کی ممتاز عیسائی حکومتوں سے سیاسی و تجارتی تعلقات کا قیام۔

۶- اندلس کی مدنیت کو معراج کمال پر پہنچانا۔

۱- مسلمان باغیوں کی سرکوبی اور سارے اسلامی اندلس پر قبضہ

باغی علاقوں پر عبدالرحمن کی فوجی پیشقدمیوں کی ابتدا اسکے ایک انقلاب انگیز اعلان سے ہوئی۔ اس نے تخت نشینی کے ساتھ ہی پورے اسلامی اندلس میں اعلان کرایا کہ خودسر باغی غیر مشروط اطاعت قبول کریں ورنہ انہیں فوج کشیوں سے تباہ و برباد کر دیا جائیگا۔ اس اعلان پر کئی رئیسوں نے فوراً اطاعت کی۔ اور طاقتور سرکشوں نے مرکزی حکومت سے لڑنے کے لئے مدافعانہ تیاریاں شروع کیں۔

عبدالرحمن نے اس اعلان کے بعد ہی اسی سال سنہ ۳۰۰ھ/۹۱۲ء میں اپنی فوجی مہموں کا آغاز کیا۔ اس کی پہلی پیشقدمی اندلس کے سب سے نامی سرکش عمر بن حفصون کے خلاف عمل میں آئی۔ ابن حفصون ایک نوجوان قائد تھا۔ اس نے مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ۲۶۷ھ/۸۸۰ء میں ریہ (REGIO) کے نواح میں قلعہ ببشتر (BIBASTRO) میں جو مالقہ (MALAGA) کے کوہستانی علاقہ میں واقع تھا۔ بغاوت کا علم بلند کیا تھا۔ مرکزی حکومت نے بارہا اسکو سرکرنا چاہا۔ مگر وہ اس کوہستانی علاقہ کے قدرتی استحکاموں کے دامن میں محفوظ رہا۔ اس کی طاقت روز بروز بڑھتی گئی۔ نئے نئے علاقوں پر قبضہ کرتا گیا یہانتک کہ اس نے دارالسلطنت قرطبہ کے صوبہ میں داخل ہو کر ایک قلعہ تعمیر کر لیا تھا۔ اور خلافت عباسیہ کا داعی بن کر اندلس سے اموی حکومت کا خاتمہ کرنے کے لئے مرکزی حکومت پر جارحانہ حملے شروع کر چکا تھا۔

اسلئے عبدالرحمن نے سب سے پہلے اسی پر فوجکشی کی پہلے بدر حاجب کی سرکردگی میں فوج بھیجی پھر خود فوج لیکر گیا۔ ابن حفصون کے مقبوضہ قلعوں پر قبضہ کرتا گیا۔ یہاں تک کہ تین قلعے اسکے قبضہ میں آگئے۔ ابن حفصون نے یہ صورت حال دیکھکر افریقہ کی حکومت فاطمیہ کی طرف رجوع کیا۔ جو عباسی خلافت و اغلبی سلطنت کو افریقہ سے مٹا کر جڑ پکڑ چکی تھی۔ ابن حفصون اور عبید اللہ اسماعیلی میں معاہدہ ہو گیا۔ دولت فاطمیہ کا جنگی بیڑا ابن حفصون کی مدد کے لئے اندلس آیا۔ اور ابن حفصون نے افریقہ میں دعوت فاطمی کا اعلان کیا۔ عبدالرحمن یہ حالات سنتے ہی بڑی سرعت کے ساتھ آگے بڑھا۔ مختلف قلعوں اور شہروں کو فتح کرتا ساحلی

Marfat.com

شہر جزیرۂ خضراء (ALGECIRAS) جا پہنچا۔ یہاں ساحل پر افریقی بیڑا موجود تھا۔ عبدالرحمٰن نے اس پر قبضہ کیا۔ پھر آگے بڑھ کر سمندر کی ناکہ بندی کردی۔ اب ابن حفصون اور دولت فاطمیہ کے تعلقات کے بقا کے لئے کوئی بحری راستہ باقی نہیں رہا۔ مجبوراً اس نے سپر ڈالدی۔ اور ایک اموی شہزادے یحییٰ بن اسحٰق کو واسطہ بنا کر صلح کا پیغام دیا۔ عبدالرحمٰن نے اسکی اطاعت کو قبول کیا اور غیر مفتوح علاقہ میں اسکی حکومت تسلیم کی۔ اور خراج کی سالانہ رقم مقرر کردی۔ ابن حفصون جب تک زندہ رہا مطیع رہا۔ ۳۰۶ھ/۹۱۸ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کا لڑکا جانشین ہوا۔ ۳۰۶ھ/۹۱۸ء سے ۳۱۴ھ/۹۲۶ء تک اس کے جانشینوں میں سے بعض نے بغاوت کی۔ ایک دو موقعوں پر اس نے طرح دی۔ آخری مرتبہ ۳۱۴ھ میں عیسائی حکومت کی مدد سے پھر سرکشی کی۔ تو عبدالرحمٰن نے اس علاقہ میں فوجکشی کر کے زیر کر لیا۔ اور بنو حفصون کی حکومت کے خاتمہ کا اعلان کر کے اس پورے علاقہ کو ممالک محروسہ میں داخل کر لیا۔

عبدالرحمٰن نے ۳۰۰ھ/۹۱۲ء سے جو فوجی مہموں کا آغاز کیا اسکا سلسلہ ۳۱۶ھ/۹۲۸ء تک جاری رہا۔ ابتدائی دو ہی سالوں میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ پھر رفتہ رفتہ بڑے بڑے نامی سرداروں اور مستقل حکومتوں کا قلع قمع کیا گیا۔ چنانچہ ۳۰۰ھ/۹۱۲ء میں سعید بن مزیل سے حصن المنتوں (MONTELEON) اور حصن سمنان (SAMONTON) چھینا۔ ۳۰۱ھ میں اشبیلیہ سے بنو حجاج کا خاتمہ کیا۔ اسی طرح مرسیہ (MURCIA) بلنسیہ (VALENCIA) اوریولہ (ORIHUELA) اور لبلہ (NIEBLA) کی باغیانہ حکومتوں کا خاتمہ کیا۔ پھر ۳۰۵ھ/۹۱۷ء میں قرمونہ (CARMONA) کو حبیب بن سوادہ سے لیا۔ پھر ۳۰۶ھ/۹۱۸ء میں حصن حمریہ ( ) اور مغربی پرتگال کے شہر شنترین (SANTAREN) پر قبضہ ہوا۔ ۳۰۹ھ/۹۲۱ء میں حصن طرش (TARROY) پر اموی علم بلند ہوا۔ پھر حصن الجامہ ( ) کے سردار احمد بن اضحیٰ ہمدانی نے اطاعت قبول کی۔ ۳۱۵ھ/۹۲۷ء میں محمد بن ہشام تجیبی سے سرقسطہ (SARAGOSSA) اور مطرف بن منذر تجیبی سے قلعہ ایوب (CALATAGAD) لیا۔ پھر ایک دوسرے قائد یونس بن عبدالعزیز کا خاتمہ ہوا۔ اسکے بعد شہر بطلیوس (BADAJAZ) کو بنو ابن مروان جلیقی سے لیا پھر شہر ماردہ پر قبضہ کیا۔ اور سب سے آخر میں طلیطلہ کی باری آئی۔ یہاں کے مسلمان قائد اور عیسوی سردار سر جوڑ کر لڑے اور مغلوب کئے گئے۔ اور اسی پر اندلس کے غدار متولیوں کی حکومتوں کا خاتمہ ہوا۔

اس پندرہ برس کے اندر عبدالرحمٰن کے حدود حکومت میں ایک طرف برشلونہ سے بحر اٹلانٹک تک اور دوسری طرف کوہ پائرنیس سے بحر روم کا وسیع علاقہ داخل ہو گیا۔ اس اثنا میں اس نے ملک میں کامل امن و امان قائم کر کے محاصل میں غیر معمولی کمی کردی۔ جس سے رعایا کے درمیان غیر معمولی ہردلعزیزی حاصل ہوئی۔ اور حکومت کے حسن انتظام، اور ٹیکسوں کے وقت پر وصول ہو جانے سے حکومت کی آمدنی میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔

اسی زمانہ میں عبدالرحمٰن کو دو اموی شہزادوں محمد بن عبدالجبار اور قاضی بن محمد کے متعلق معلوم ہوا کہ وہ دونوں در پردہ اپنی امارت کے لئے

Marfat.com

باغیانہ سازشوں میں مصروف ہیں۔ عبدالرحمن نے تحقیقات کے بعد ان دونوں کے سر قلم کرا دیئے۔

آگے چل کر شاہی خاندان کی ایک اور رقابت کا اس کو سامنا کرنا پڑا۔ اور اسکا نتیجہ خود اسی کے ہاتھوں اسی کے لئے اندوہناک ثابت ہوا۔ اس نے اپنے بڑے لڑکے الحکم کو اپنا ولی عہد بنایا تھا یہ انتخاب اسکے دوسرے لڑکے عبداللہ کو ناگوار گذرا۔ عبداللہ اندلس کے ممتاز فقہائے شافعیہ میں شمار کئے جاتے تھے۔ اور زہد و عبادت گذاری میں مشہور تھے۔ انہوں نے بعض ارکان دولت کو اپنا ہمنوا بنا کر بیعت لینے کی کوشش کی۔ اسکی خبر عبدالرحمن کو مل گئی۔ اس نے ان کو اور ان کے سب ساتھیوں کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔ عید الاضحیٰ کے دن نماز کے بعد ارکان دولت جمع تھے۔ قید خانہ سے ان سب کو بلوایا۔ اور ارکان دولت کی طرف مخاطب ہو کر کہا: آج قربانی کا دن ہے۔ دیکھو اب میں اپنی قربانی دیتا ہوں۔ یہ کہتا ہوا اپنے جگر گوشہ عبداللہ کی طرف بڑھا اور انہیں زمین پر پچھاڑ کر خود اپنے ہاتھ سے ذبح کر ڈالا۔ پھر دوسرے قیدیوں کیطرف متوجہ ہو کر اس نے کہا: میں اپنی قربانی کر چکا اب تم لوگوں کی باری ہے۔ اپنی اپنی قربانی ادا کرو۔ یہانتک کہ عبداللہ کے سب ساتھی اسی دردانگیز طریقہ سے اسی ضمن میں ذبح کئے گئے۔

(طبقات کبرٰی سبکی ج ۲ ص ۲۳۰)

اس المناک حادثہ کے بعد اسکے عہد میں بغاوت کا پھر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

اندلس کے عیسائی علاقوں میں فتوحات اور انکی اطاعت

اسی زمانہ میں اندلس میں عیسائی سلطنتوں میں سے سلطنت لیون (LEON) دولت امویہ اندلس کی حریف تھی۔ اور اچھی خاصی طاقتور بن چکی تھی۔ عبدالرحمن اندلس کے باغیوں کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ ان میں سے بعض باغیوں سے لس کی عیسائی سلطنتوں کی سازباز تھی۔

انہیں وجوہ سے عبدالرحمن کی فوجی مہموں کے آغاز کے ساتھ اردون (URDONO) شاہ لیون نے بھی پیشقدمی کی اور ۲۰۲ھ/۸۱۷ء میں نواح ماردہ (MARIDA) میں لوٹ مار کر چلا گیا۔ پھر ایک قلعہ حصن الحنش (ALANGE) پر قبضہ کر لیا۔ مسلمان طلبیرہ (TALAVERA) نے عبدالرحمن سے آکر شکایت کی کہ عیسائیوں نے ان کے شہر کے مضافات کو آگ لگا دی ہے۔ چنانچہ امرا نے مسلمان باغیوں کے سرکرنے کی مہم میں مصروف رہنے کے باوجود فوراً ادھر توجہ کی۔ اور ایک مہم وزیر احمد بن عبدہ کی سرکردگی میں بھیجی۔ جو اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی اس میں بہت سے عیسائی مارے گئے۔ پھر ۲۰۵ھ/۸۲۰ء میں اسی کے تحت ایک دوسرا لشکر بھیجا گیا۔ شنت اسطاح غرباج (سین اسٹرن ڈی گورمز) (SAN-ESTEBADEGORMAS) کی دیواروں کے نیچے دونوں فوجوں کے مورچے جمائے گئے۔ اڑدون نے سخت شکست دی۔ مسلمان سپہ سالار وزیر احمد بن عبدہ اس لڑائی میں کام آیا۔ اڑدون نے اسکا سر کاٹ کر قلعہ کے پھاٹک پر نصب کر دیا۔

اس مہم کی ناکامی کا انتقام لینے کے لئے امیر نے پھر ایک لشکر حاجب بدر کی سرکردگی میں بھیجا۔ جس نے غارتگری کی۔ پھر ۲۰۸ھ/۸۲۳ء میں عبدالرحمن خود فوج لیکر گیا۔ دو اور عیسائی سلطنتیں نبرہ (NAVARRA) و لیون مل کر لڑیں۔ مگر شکست

Marfat.com

گھائی۔ عبدالرحمن نے کئی قلعوں پر قبضہ کر لیا۔

ان میں سے وشمہ (OSMA) اور قلنہ (CLUNIA) خاص طور پر ذکر کے لائق ہیں۔ عیسائیوں نے سمورہ شُبت۔ بانکش۔ شنت۔ اشتبیاج، غرباح، اور وشمہ اور قلنہ کی تعمیر مسلمانوں ہی کے مقابلہ میں خاص طور پر کی تھی۔ پھر سلطنت نبرہ کے حدود میں تاخت کی اور اسکے دارالحکومت پنبلونہ (PANPLONA) پر قبضہ کر لیا۔ عیسائیوں پر خوف غالب آچکا تھا۔ وہ بایرنیس کے جنگلوں میں جا چھپے۔ اس اثنا میں اردون لشکر لیکر آگیا۔ مگر سخت ہزیمت اُٹھائی۔ دو معزز پادری ڈلیڈس آف سلامنکا اور ہرموجیس آف ٹوئی جنگ میں مارے گئے۔ اس طرح وزیر احمد بن عبدہ کا قصاص وصول ہو گیا۔ عبدالرحمن نے ان حملوں میں لیون و نبرہ کو ایسا تاخت و تاراج کیا کہ وہ پھر مدتوں سر نہ اُٹھا سکے۔ نیز ان میں خانہ جنگیاں شروع ہو گئیں۔ اور عبدالرحمن کو مغرب و افریقہ کی طرف توجہ کرنے کا موقع ملگیا۔

عیسائی حکومتوں سے دوبارہ معرکہ آرائی ۳۲۵ھ/۹۳۷ء میں شروع ہوئی۔ رمیرا (RAMERO) شاہ لیون نے اسی سال بلنیہ (VALENCIA) پر حملہ کیا۔ اس حملہ میں ممتاز مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ نیز رذمیر نے چند مسلمان والیوں کو پھر بغاوت پر آمادہ کر لیا۔ چنانچہ اسی سال محمد بن ہشام تجیبی نے سرقسطہ میں امیہ بن اسحٰق نے شنترین میں۔ اور مطرف میں لندف نے قلعہ ایوب میں سرکشی اختیار کی۔ عبدالرحمن ان بغاوتوں کو فرو کرنے کے لئے گیا تو ان کی مدد کے لئے رذمیر اپنے لشکر کے ساتھ موجود تھا۔ عبدالرحمن نے ان میں سے ہر ایک کو زیر کر لیا۔ مطرف بن مندف کا سر قلم کیا گیا۔ محمد بن ہشام تجیبی کی جان بخشی ہوئی۔ امیہ بن اسحٰق فرار

ہو کر رذمیر کے دامن میں جا چھپا۔ اس نے اس کو وزارت کے عہدہ پر مامور کیا۔ آگے چلکر اسلامی حکومت کے خلاف اسکے مشورے رذمیر کے لئے نہایت سودمند ثابت ہوئے۔ اور مسلمانوں کو نقصان اُٹھانا پڑا۔

ان بغاوتوں کو سر کرکے اس نے نبرہ کا رخ کیا۔ ملکہ طوطہ (تھیوڈا) نیابۃً یہاں حکمران تھی اس نے سر ڈال کر اطاعت قبول کی۔ خراج کی سالانہ رقم مقرر کی گئی۔ اور اس نے سلطنت لیون کو سر کرنے میں اسلامی حکومت کی مدد کرنے کا عہد کیا۔

اب صرف سلطنت لیون کا مرحلہ باقی رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس نے سلطنت کا تختہ الٹ دینے کے لئے عظیم الشان فوجی تیاری کی۔ اور ۳۲۷ھ/۹۳۹ء میں ایک لاکھ فوج لیکر اس کے دارالسلطنت سمورہ (Zamora) کی دیوار کے نیچے جا پہنچا۔ شہر سمورہ یکے بعد دیگرے سات فصیلوں کے اندر واقع تھا۔ یہ شہر ۹۳ھ میں مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔ ۴۷ برس کے بعد الفانسو سوم نے اس پر قبضہ کرکے اسکے قدرتی استحکاموں سے فائدہ اُٹھایا۔ اور یکے بعد دیگرے سات فصیلیں اور سات خندقیں تیار کرائیں۔ ہر فصیل دوسری فصیل سے اونچی ہوتی گئی تھی۔ اور ہر فصیل کے بعد پانی سے بھری ہوئی گہری خندق تھی۔ مسلمانوں کے مقابلے میں جو نئے قلعے تعمیر کئے گئے تھے، ان میں سے یہی باقی رہ گیا تھا۔ عبدالرحمن نے سمورہ کی جنگ کو فیصلہ کن قرار دیا تھا۔ لیکن کامیابی اسکی قسمت میں نہ تھی۔ اس نے دو فصیلیں عبور کر لیں۔ دشمن کی فوج میں مفرور و غدار عرب قائد امیہ بن اسحٰق موجود تھا۔ وہ اسلامی لشکر کی نقل و حرکت اور جنگی چالوں پر نگاہ رکھے تھا۔ عبدالرحمن نے جیسے ہی تیسری فصیل

Marfat.com

میں قدم رکھا، امیہ کی خائنانہ جنگی تدبیروں سے عیسائی لشکر مسلمانوں کی ٹڈی دل فوج پر ٹوٹ پڑا۔ اور تیروں کی بارش اور دست بدست لڑائی سے ساری فوج تتر بتر کر دی۔ چالیس سے پچاس ہزار تک مسلمان شہید ہوئے۔ عبدالرحمن باقیماندہ فوج کو لیکر نامراد قرطبہ واپس گیا۔[1]

جنگ سمورہ کے خاتمہ کے بعد ابتدآ یہ دونوں حریف اپنی اپنی جداگانہ مشغولیتوں میں کچھ دنوں کے لئے مشغول ہوئے۔ اُدھر عیسوی حکومتیں خانہ جنگیوں میں مصروف ہو گئیں۔ ادھر عبدالرحمن عالم اسلامی کی نبض شناسی کے بعد اندلس میں خلافت امویہ کے احیاء میں مصروف ہوا جس سے فطری طور پر اموی سلطنت کے وقار میں آگے چلکر غیر معمولی اضافہ ہوا۔ عیسائی سلطنتیں خانہ جنگیوں سے کمزور ہوئیں اور اموی سلطنت کے لئے بین الاقوامی عزت و شہرت کے مواقع پیدا ہو گئے۔ اس طرح آگے چل کر اندلس کی عیسائی و اسلامی حکومتوں کے وقار و مرتبہ میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔ جس کا ان دونوں حکومتوں کے سیاسی تعلقات پر گہرا اثر پڑا۔

عیسائی حکومتوں کی خانہ جنگیوں میں ایک نئی حکومت نشتالہ نے زور پکڑ لیا تھا۔ ابھی باہمی خانہ جنگیاں جاری تھیں کہ عبدالرحمن نے اپنے پے در پے حملوں سے انھیں تھکا ڈالا۔ ارڈون سوم فرمانروائے لیون نے پریشان ہو کر عبدالرحمن ناصر سے صلح کی درخواست کی۔ اور اپنی کامل اطاعت پیش کی۔ معاہدہ صلح پر دستخط ہو گئے۔ مگر اسکے بعد ہی ارڈون سوم کا انتقال ہو گیا۔ نئے فرمانروا سانچہ (SANCHA) نے صلح کے شرائط کو ماننے سے انکار کر دیا۔ عبدالرحمن ناصر نے ۳۴۵ھ / ۵۶ء میں سانچہ کے معاون خاص فرڈی نینڈ شاہ قشتالہ کے پاس سفارت بھیج کر اسکو قرطبہ طلب کیا۔ اس نے بھی تابعداری سے انکار کیا۔ اور اس نے چند ہی دنوں میں سانچہ کو تخت سے اتار کر ارڈون چہارم کو تخت نشین کر دیا۔

سانچہ کی حمایت میں اس کی نانی ملکہ طوطہ (تھیوڈا) آگے بڑھی۔ اور دربار قرطبہ سے فریاد کی۔ عبدالرحمن ناصر نے حصدی نامی ایک یہودی کو مطالبات کے ساتھ اسکے پاس بھیجا کہ (۱) فلاں فلاں دس قلعے اسلامی حکومت کو دئیے جائیں۔ (۲) سانچہ، ملکہ طوطہ اور غرسیہ (GARCIA) اصالتہً دربار قرطبہ میں آکر اس معاہدہ پر دستخط کریں۔ (۳) حکومت قرطبہ لیون پر حملہ آور ہو کر ان کے مقصد کی تکمیل کرےگی۔

ملکہ طوطہ نے ان شرائط کو قبول کیا۔ یہ عیسوی سلاطین ۳۴۷ھ / ۶۱ - ۹۶۰ء میں قرطبہ آئے۔ جہاں ان کی

---

[1] اس جنگ کے متعلق عرب اور یورپین مؤرخین کے بیانوں میں اختلافات ہیں۔ عرب مؤرخین کے بیان کے مطابق مسلمان شہداء کی تعداد چالیس سے پچاس ہزار تک ہے۔ لیکن عیسائی مؤرخین نے صرف پچاس سپاہیوں کے ساتھ عبدالرحمن کو قرطبہ واپس کیا ہے۔ پھر عیسائی مؤرخین نے بڑے فخر و غرور سے اس جنگ کے واقعات کو لکھے ہیں۔ اسکا ہیرو ایک معقلی قائد کو قرار دیا ہے۔ لیکن عرب مؤرخین نے اس شکست کا باعث غدار مسلمان قائد امیہ بن اسحٰق کے جنگی مشوروں کو قرار دیا ہے۔ انکے بیانات خود امیہ کے بیان پر مبنی ہیں جو اس نے معافی پانے کے بعد قرطبہ میں آکر دیا تھا۔ زمانہ حال کے مؤرخین نے موقع جنگ کی اہمیت کو کم دکھانے کے لئے میدان جنگ کو بھی بدل دیا ہے۔ حالانکہ مسعودی سے نویری تک سب عرب مؤرخین نے سمورہ ہی کو مقام جنگ لکھا ہے۔ اور نقشہ جنگ میں سات فصلیں سات خندقیں دکھائی ہیں۔

پذیرائی ہوئی۔ ان لوگوں نے معاہدہ پر دستخط کئے اور دربار قرطبہ کی سیادت تسلیم کی۔ پھر حکومت قرطبہ نے لیون کو سر کرنے کے لئے مہم بھیجی۔ یہ اسلامی لشکر شہر بہ شہر فتح کرتا ہوا دارالحکومت کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اُرڈونو چہارم شہر چھوڑ کر فرار ہوا۔ پھر حکومت قشتالہ پر مہم بھیجی گئی۔ فرڈینینڈ بھی زیر ہوا۔ اور لیون کے تخت پر سانچہ کو بٹھا دیا گیا۔

یہ عبدالرحمن ناصر کی زندگی کا سب سے آخری اور سب سے درخشاں کارنامہ ہے۔ کہ اس نے عیسائی اندلس کی قطع بندیوں کو توڑ کر ان کو پورے طور پر مطیع کر لیا۔ اور سرحدی قلعوں کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ کہ پھر سر نہ اٹھا سکیں۔ اسکے بعد اندلس کی عیسائی حکومتوں کی کچھ دنوں یہ صورت حال رہی کہ جب کبھی ان میں کوئی باہمی اختلافات ہوتے۔ ایکی فریاد قرطبہ پہنچتی۔ یہاں سے فریقین کے نام فرامین جاری کر دیئے جاتے، جن کی وہ بلا تامل تعمیل کرتے رہتے۔

مغرب و افریقہ میں فتوحات اور دولت فاطمیہ پر برتری

حکومت قرطبہ شمال و جنوب کی دو سمتوں سے دو دشمنوں سے گھری ہوئی تھی۔ الناصر نے شمال کی عیسوی سلطنتوں کو کمزور کرنے کے بعد جنوب کے دشمنوں کی طرف توجہ کی۔ یہاں افریقہ میں فاطمیوں کی نئی حکومت قائم ہوئی تھی۔ ان کا سیلاب مغرب کی طرف بڑھتا آتا تھا۔ اور مغرب اقصیٰ کی بربری حکومتیں ان کی سیادت قبول کرتی جاتی تھیں۔ فاطمیوں کی نظر اندلس پر بھی تھی۔ ابن حفصون کی مدد میں وہ اپنا جنگی بیڑا بھیج چکے تھے۔ اسلئے الناصر کو جیسے ہی موقع ملا۔ اس نے مغرب میں اپنے جارحانہ حملے شروع کر دیئے۔ چنانچہ ۳۱۷ھ/۹۲۹ء میں مشہور شہر سبتہ پر قبضہ کر لیا۔ اور اس کو اندلس پر فاطمیین کے حملہ کو روکنے کے لئے بحری قلعہ کی حیثیت سے مستحکم کر لیا۔ ابراہیم بن محمد نے جو بنو عصام میں سے آخری فرمانروائے سبتہ تھا، اس شہر کی بازیافت کی کوشش کی اور ناکام ہونے کے بعد اس نے اموی حکومت کی سیادت قبول کر لی۔ الناصر نے اسکو یہاں کا والی بنا دیا۔ اور شہر کی حفاظت کے لئے ایک لشکر متعین کر دیا۔ بنو عصام کے مطیع ہو جانے کے بعد ادریسیوں کی دوسری شاخوں کے حکمران ادریس بن ابراہیم امیر ارشکک۔ محمد بن خزر امیر مغراوہ، موسیٰ بن ابو العافیہ امیر مکناسہ، پھر مختلف امراء قاسم بن ابراہیم، اور حسن بن عیسیٰ وغیرہ نے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح افریقہ کا کچھ حصہ اور مغرب اقصیٰ کا وسیع علاقہ الناصر کی سیادت میں داخل ہو گیا۔

دولت فاطمیہ نے مغرب اقصیٰ کی بازیافت کے لئے ۳۲۱ھ/۹۳۳ء میں عامل تاہرت کی سرکردگی میں مہم بھیجی۔ اس نے سلطنت مکناسہ کا رخ کیا۔ والی مکناسہ موسیٰ بن ابو العافیہ نے اس حملہ آوری کی اطلاع اندلس بھیجی۔ یہاں سے عظیم الشان لشکر اس کی امداد کے لئے بھیجا گیا۔ لیکن وہ ابھی سبتہ ہی میں تھا کہ ابن ابو العافیہ نے فاطمی لشکر کو شکست دیدی۔ اس ہزیمت کے بعد فاطمیوں نے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں کیا۔ سارے مغرب اقصیٰ میں الناصر کا خطبہ و سکہ جاری رہا۔

فاطمین سے تعلقات کے ناخوشگوار ہونے کے باعث الناصر کو عظیم الشان بحری طاقت قائم رکھنی پڑتی تھی۔ جنگی بیڑوں کے سایہ میں تجارتی بیڑے شام و مصر جاتے تھے۔ اس قسم کا پہلا بیڑا جب

Marfat.com

۳۴۴ھ/۹۵۵ء میں مشرق کی طرف گیا تو واپسی میں اندلسی بیڑے نے صقلیہ (جو فاطمیوں کی اطاعت میں تھا) کے ڈاک کے جہاز کو بے یار و مددگار پا کر گرفتار کر لیا۔ اس کی بازیافت کے لئے افریقہ سے حسن بن علی کلبی عظیم الشان بیڑا لیکر تعاقب میں اچانک آ گیا۔ اور اندلسی ساحل پر جو تجارتی جہاز کھڑے تھے، انہیں جلا دیا۔ اور اپنی ڈاک کا جہاز افریقہ واپس لے گیا۔

الناصر نے اس واقعہ کے انتقام میں فاطمی ممالک محروسہ پر فوج کشی کی۔ اور ایک دو خونریز معرکوں کے بعد المعز فاطمی کو الناصر کے سامنے جھکنا پڑا۔ اور معاہدہ صلح میں افریقہ کے چند مقامات سے اموی حکومت کے حق میں فاطمی حکومت کو دست بردار ہونا پڑا۔ اس واقعہ سے افریقہ و مغرب میں اموی سیادت کو مزید استحکام پہنچا۔ اور عبد الرحمٰن الناصر نے اپنے جنوب کی اس حریف سلطنت کی معاندانہ سرگرمیوں سے بھی نجات حاصل کر لی۔

جون ۴۵ء

-(۲)-

اندلس میں اموی خلافت کا احیاء

اموی: منصب خلافت کو اپنا موروثی حق جانتے تھے۔ لیکن مشرق میں خلافت امویہ کے خاتمہ کے بعد انہوں نے ابتک اندلس میں اس منصب کا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس وقت تک نظری طور پر عالم اسلامی میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ خلیفہ کے لئے مقامات مقدسہ پر قبضہ رکھنا ضروری ہے۔ اسلئے گرچہ وہ عباسیوں کو غاصب جانتے تھے، تاہم انہوں نے اندلس میں اپنے لئے صرف "امیر" یا "بنو خلفاء" کے لقب کو قائم رکھا تھا۔ لیکن اب عبد الرحمٰن نے دیکھا کہ عباسیوں کی حکومت نہ صرف مقامات مقدسہ پر نہیں بلکہ صحیح معنوں میں خود دار الخلافت بغداد میں بھی باقی نہیں رہی ہے۔ پھر فاطمیوں نے اپنی خلافت و امامت کا دعویٰ کر کے ایک نظیر بھی قائم کر دی ہے۔ اس لئے اس نے اپنی دولت و حشمت، عظمت و شوکت، اور زور و اقتدار کے لحاظ سے اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھا۔ اور ۳۱۶ھ/۹۲۹ء میں اپنی خلافت کا اعلان کر دیا۔ ممالک محروسہ میں فرمان شائع کیا کہ اس کو خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے "امیر المومنین الناصر لدین اللہ" کے لقب سے یاد کیا جائے۔ منبروں پر خطبے پڑھے جائیں۔ وزراء، امراء، و حکام، قصر خلافت میں بیعت خلافت کے لئے حاضر ہوں۔

چنانچہ ۸ جمادی الاولیٰ ۳۱۶ھ/۹۲۹ء کو بڑی شان و شوکت سے بیعت خلافت کی رسم ادا ہوئی۔ وزیروں اور والیوں نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق نذریں پیش کیں۔ اور قصائد تہنیت پڑھ کر سنائے گئے۔ اس موقع پر وزیر ابن شہید نے جو نذر پیش کی تھی مؤرخین نے اس کی فہرست محفوظ رکھی ہے۔ اس سے اس عہد میں اندلس کی عام مرفہ الحالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس فہرست کی چند چیزیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) زر مضروب پانچ لاکھ مثقال (۲) زر غیر مضروب چار سو رطل (۳) ڈھلی ہوئی چاندی ۴۵ ہزار، (۴) عود ۶۹۲ رطل۔ (۵) مشک ۲۱۳ اوقیہ (۶) عنبر اشہب

Marfat.com

۵۰۰ اوقیہ مشک کافور ۳۰۰ اوقیہ مشک سمور کی کھالیں ۲۰ گٹھے عمدہ ریشم پانچ ہزار رطل۔ بہترین اونی قالین ۳۰ عدد، اسی طرح پھولدار زرکار ریشمی تھان، عراقی چادریں، عراقی پردے، ساختہ بغداد ریشمی سنہری جھولیں، جائے نمازیں، بہر سامان اسلحہ میں زرہوں کے نیچے پہننے کی صدریاں، ڈھالیں، چیدہ عربی گھوڑے، خنجر، تبر، ارابشی اسلحہ موضع شعیبہ کے نادر اونٹ، منتخب غلام، چیدہ کنیزیں مع قیمتی ملبوسات، وآلات موسیقی، اور اراضی قیمتی ۸۰ ہزار دینار۔ (ابن خلدون ومقری ابن اثیر)

عبدالرحمن نے اسی موقع پر ابن شہید کو "ذوالوزارتین" کے خطاب سے سرفراز کیا۔ اب الناصر اندلس کا دینی و دنیاوی دونوں پیشوا تھا۔

یورپین ممالک کے وفود دربار قرطبہ میں

عبدالرحمن الناصر نے اپنی دانائی، تدبر، اور دوراندیشی سے اسلامی حکومت اندلس کا بین الاقوامی وقار قائم کیا تھا۔ چنانچہ اس زمانہ کے یورپ کی مشہور عیسائی حکومتوں بیزنطی، اٹلی، جرمنی، اور فرانس کے فرمانرواؤں نے اسی کی طرف اپنی دوستی کے ہاتھ بڑھائے۔ اور قسطنطین ہفتم، شہنشاہ قسطنطنیہ، وسط یورپ کے فرمانروا، صقالبہ (SCAUSLOAIANS) دوقہ (DUX) شاہ جرمنی۔ ہوقوہ (HUGO) شاہ فرانس، اور مشرق فرانس کے شاہ کلدہ (CORAL) کے سفراء دربار میں آئے۔ اور بڑے تزک و احتشام سے قیمتی ہدایا و تحائف اور پیمان عہد ساتھ لائے۔ ان کے جواب میں اسلامی سفارتیں ان ممالک میں بھیجی گئیں۔ اسی طرح اردون (ORDONO) امیر لیون، نیرہ (NAYARRA) کی ملکہ طوطہ (THAEDA) غرسیہ (GARCIA) اور سانچہ (CANCHO) خود دربار خلافت میں حاضر ہوئے۔

ان سلاطین اور یورپی سلطنتوں کے وفود کے قرطبہ میں وارد ہونے کے مفصل حالات عرب مؤرخین میں سے خاص طور پر ابن خلدون اور مقری نے محفوظ رکھے ہیں۔ چنانچہ حکومت بزنطی قسطنطنیہ کا وفد ۳۳۶ھ / ۹۴۸ء میں قرطبہ پہنچا۔ الناصر نے اپنی مشرقی روایات کے شاہانہ آداب و فراہم جلوہ جلوس اور کروفر سے اس سفارت کا استقبال کیا۔ پہلے ایک استقبالی وفد نے یحییٰ بن محمد کی سرکردگی میں ساحل اندلس پر اس کا خیر مقدم کیا۔ پھر جیسے جیسے یہ وفد قرطبہ کے قریب پہنچتا گیا، شاہانہ جاہ و جلال کے مناظر اس کی نگاہوں سے گزرتے گئے۔ قرطبہ کے قریب شاہی لشکر اپنی قیمتی خوبصورت وردیوں اور چمکیلے ہتھیاروں سے آراستہ اپنے اپنے سالار کی سرکردگی میں دورویہ ایستادہ تھا۔ تمام سپہ سالار ارکان وفد سے باری باری ملے۔ اور اپنی اپنی فوج پیش کی۔ پھر اعیان سلطنت، خواجہ سرا، وزراء، امراء، یکے بعد دیگرے ملتے گئے۔ یہاں تک کہ یہ وفد قرطبہ کے بیرونی حصہ آبادی میں داخل ہوا۔ اور ولیعہد کے محل "النصیر" میں فروکش ہوا۔ میزبان خاص خود ولیعہد تھا۔

بارگاہ خلافت میں اس کے باریاب ہونے کی تاریخ ۱۱ ربیع الاول پنجشنبہ مقرر ہوئی۔ اس موقع کے لئے "قصر الزہرا" کو خاص طور پر آراستہ کیا گیا۔ خصوصاً اس کے ایوان عام کی آرائش سے نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں۔ قصر کے پورے صحن میں قیمتی قالینوں کا فرش بچھا تھا۔ دروازوں اور دالانوں پر دیبا کے زرق برق پردے لٹکائے گئے۔ آرائش کے پرتکلف سامان جابجا رکھے گئے۔ وسط میں جواہرات سے مرصع طلائی تخت بچھایا گیا۔ اور اس کے دائیں بائیں ولیعہد، اموی شہزادے وزراء، امراء، قضاۃ، کتاب و حکام کی نشستیں حسب مراتب لگائی گئیں۔ نقیب و چوبدار اپنی اپنی جگہ ایستادہ رہے۔

دربار مرتب ہوجانے کے بعد سفراء باریاب کئے گئے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ دربار قرطبہ کی شان و شوکت و عظمت و سطوت کو دیکھکر ان کی نگاہیں

Marfat.com

خیرہ ہوگئیں۔ اور تھوڑی دیر کے لئے وہ مبہوت سے ہوکر رہ گئے۔ پھر انہوں نے آداب شاہی بجا لاکر قیصر روم کا پیمان محبت سے لبریز مکتوب خلیفہ ناصر کی خدمت میں پیش کیا۔

قیصر کا مکتوب آسمانی کاغذ پر سونے کے حروف اور یونانی زبان میں لکھا ہوا تھا۔ لوح مکتوب پر دائیں طرف چار مثقال سونے کا حضرت عیسیٰ کا مرقع تھا۔ بائیں طرف قیصر روم اور اس کے لڑکے کی تصویریں تھیں۔ دوسرے کاغذ پر روپہلی روشنائی سے ہدایا و تحائف کی فہرست مرقوم تھی۔ یہ دونوں تحریریں ایک لفافہ میں بند تھیں۔ اور وہ لفافہ ایک نقرئی بکس میں جس پر سونے کے نقش سر جڑے ہوئے تھے۔ رکھا ہوا تھا۔ اس بکس میں بھی شہنشاہ قسطنطین کا مرقع خوبصورت رنگین شیشہ پر بڑی صنعت سے بنایا گیا تھا۔ پھر یہ بکس ایک ترکش میں رکھکر دیبا سے لپیٹ دیا گیا تھا۔

مکتوب و ہدایا کے پیش ہونے کے بعد قادر الکلام خطیب خطبہ کے لئے اُٹھے۔ مگر ابو علی قالی جیسے مشہور روزگار خطبا، دربار کی سطوت شان سے مبہوت ہوکر بیٹھ رہے۔ دو خطیبوں کی ناکامی کے بعد اس موقع پر منذر بن سعید بلوطی نے اپنے فن کا کمال دکھایا۔ اور آگے چل کر یہی اندلس کے خطیب قرار پائے۔

شاہانہ آداب و مراسم کے بعد دربار برخاست ہوا وفد کی واپسی میں عبدالرحمٰن ناصر نے بھی قیمتی ہدایا و تحائف اس وفد کے ساتھ کئے۔

الناصر کا عہد حکومت اور اسکی تمدنی ترقیاں

الناصر، اندلس کا اولو العزم اور نہ تھکنے والا حکمراں تھا۔ اس کی پوری زندگی مشغول گذری۔ وہ اپنا ایک روزنامچہ رکھتا تھا۔ اس میں خوشی کے ایسے دنوں کو تاریخ و ماہ و سنہ کی تعین کے ساتھ لکھ لیا کرتا تھا جس میں اس کو کوئی فکر نہ رہی ہو۔ تو عمر بھر میں بے فکری کے صرف ۱۴ دن نکلے۔ مؤرخین کہتے ہیں جتنے لوگوں نے اس ملک پر حکمرانی کی، ان میں وہ سب سے زیادہ نرم دل، خوش اخلاق، صاحب علم و فضل، سخی فیاض اور حق رس تھا۔ اس کے پیشروؤں میں سے کوئی میدان جنگ میں اس سے زیادہ سرگرم، اور اپنی ہمت میں بازی لے جانے والا تھا۔ وہ علم کا شائق اور علماء کا قدرداں تھا۔ (ابن خلدون مقری)

اس نے اپنے عہد حکومت میں بغاوتوں کا استیصال کرکے قرطبہ کی مرکزیت قائم کی۔ عیسوی حکومتوں کو زیر کیا۔ اور فاطمیوں کا سر نیچا کیا۔ اور اس طرح دونوں سمتوں کی حریف سلطنتوں کے جارحانہ حملوں کے امکان کو ختم کر دیا۔ ایک مضبوط نظام حکومت قائم کرنا۔ ملک میں زراعت، صنعت و حرفت، تعمیرات اور تجارت کو فروغ دینا، علوم و فنون کی سرپرستی کرنا، اور ملک میں فراغ البالی کا دور دورہ آنا۔ اس کے عہد کے زریں کارنامے ہیں۔

نظام حکومت

عبدالرحمٰن ناصر کی حکومت کا سیاسی نظریہ یہ تھا کہ شاہی اقتدار تمام و کمال خود حکمراں کے ہاتھوں میں رہے۔ اور نظم و نسق ایسے لوگوں کے سپرد ہو جو اسی کے ہاتھوں پرورش پاکر آگے بڑھے ہوں۔ اس نے عربوں اور بربروں کے قبائلی امتیازوں کو مٹایا۔ ان کی عصبیتوں کو توڑا۔ اور ان کو اختیارات سے بیدخل کرکے ان کے جذبۂ تفوق کو مٹایا۔ اس کے موالی۔ اس کے دست راست تھے۔ حکومت کے اعلیٰ عہدے انہی کے سپرد تھے۔ ملک کا نظم و نسق، فوج کی کمان اور مالیات کا انتظام انہی کے ہاتھوں میں تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت شاہی محل میں کی جاتی تھی۔ اور وہ لائق و فائق ہو کر بڑی وفاداری سے حکومت کے فرائض انجام دیتے تھے۔ مغربی مؤرخین کو بھی اعتراف ہے کہ اس دور میں عرب، بربر، اسپینی مسلمان، اور اسپینی عیسائیوں کے ساتھ یکساں برتاؤ قائم رہا۔ (لین پول اسکاٹ)

حکومت کا کثیر حصہ چند شعبوں میں تقسیم تھا۔ وزارت کے عہدہ پر احمد بن شہید، عبدالملک بن جہور اور احمد بن عبدالملک بن شہید سرفراز تھے۔ آخر الذکر کو ذوالوزارتین کا لقب ملا۔ عمال حکومت کے رجسٹر

Marfat.com

میں اس کا نام سب سے پہلے لکھا جاتا تھا۔ اس کی تنخواہ ۸۰ ہزار دینار تھی۔ حجابت کے عہدہ پر موسیٰ بن محمد بن یحییٰ، اور ولی بدر مامور تھے۔ قرطبہ کے قضاۃ کو قاضی القضاۃ کی حیثیت حاصل تھی۔ مسلم بن العزیز، احمد بن بقی بن مخلد، محمد بن عبداللہ بن عیسیٰ، اور منذر بن سعید بلوطی اس عہد میں اس عہدہ پر سرفراز رہے۔ عدالتی نظام اور پولس کے فرائض ایسی خوش اسلوبی سے انجام پاتے تھے کہ دور دراز حصہ ملک میں بھی کامل امن وامان قائم رہتا تھا۔ نیز مختلف اہم شہروں کو صوبہ کی حیثیت حاصل تھی۔ یہاں کے ولاۃ حکومت کے فرائض نیابۃً انجام دیتے تھے۔

عبدالرحمٰن فرائض کی انجام دہی میں سخت گیر تھا۔ اپنے جگر گوشہ کو قتل کی سزا دینے سے بھی باز نہ رہا۔ حالانکہ اس کا وہ بھائی جس کے خلاف اس نے سازش کی تھی شفاعتی بن کر آیا۔ وہ اس قتل پر کبھی پشیمان نہ ہوا۔ اس کے ساتھ شفقت پدری سے اس مقتول لڑکے کے غم میں اس کے آنسو خشک نہیں ہوئے۔

(مقری، ابن خلدون، ابن اثیر)

منظم فوج کی تعداد ڈیڑھ لاکھ تھی۔ ضرورت کے وقت شہری آبادی کے لوگ بھی فوجی خدمات انجام دیتے تھے۔ الناصر کے باڈی گارڈ لشکر کی تعداد ۱۲ ہزار تھی۔ جو زرق برق پوشاکوں، نقرئی وطلائی کمر بندوں اور بیش قیمت ہتھیاروں سے آراستہ تھا۔ اس کی بحری طاقت، بلا استثناء دنیا کی تمام بحری طاقتوں سے بڑھی ہوئی تھی۔

حکومت کے خزانہ عامرہ کی سالانہ آمدنی (۸۰۰ ۱۵۰۰۴۰) دینار اور بازار کی (۷۵۰۰۰۰۰) دینار تھی۔ اور صرف قرطبہ کی دوکانوں کا ٹیکس ۳۰ لاکھ سے متجاوز تھا۔ مال غنیمت کی آمدنی اس سے علیحدہ تھی۔ اس کا حساب کتاب دفتری محاصل سے علیحدہ رکھا جاتا تھا۔ یہ محاصل چار حصوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ ایک فوج کے لئے۔ ایک نظم ونسق کے لئے ایک تعمیرات، اور ایک خزانہ عامرہ میں محفوظ رہنے کے لئے۔ (مقری)

زراعت کے لئے اندلس کی زمین قدرتاً موزوں تھی۔ اس کی سرسبزی وشادابی پر ہسپانیہ نویسوں نے صفحے کے صفحے لکھے ہیں۔ یہ پورے سال زراعت کے کام آتی۔ اور سال میں کئی فصلیں پیدا ہوتی تھیں۔ الناصر نے یہاں کے قدرتی ذرائع سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا۔ آبپاشی کے نئے وسائل اختیار کئے۔ یورپ افریقہ اور ایشیا کے مختلف ملکوں سے مختلف قسم کے غلوں اور میووں کے پودے اور بیج منگا کر لگائے۔ پہاڑوں کے دامنوں اور پہاڑیوں کے نشیب وفراز کو سیڑھیوں کی طرح اونچی نیچی بنا کر ان پر نئی بچا کر باغ لگائے۔ اندلس اس زمانہ میں انواع واقسام کے غلوں اور میووں کی پیداوار میں عظیم شہرت رکھتا تھا۔ اور باغوں کی کثرت کے لئے یورپ میں مشہور ہو چکا تھا۔ اندلس نے زرعی حیثیت سے جیسی اس عہد میں ترقی کی اس کی مثال اس سے پہلے موجود نہ تھی۔

(مقری، السی پول)

صنعت وحرفت کی ترقیوں کے لحاظ سے بھی یہ اندلس کا درخشاں عہد سمجھا جاتا ہے۔ ہر قسم کی صنعت وحرفت اور پیشے رائج تھے۔ صدہا کارخانے جا بجا شہروں میں چل رہے تھے۔ صرف وادی کبیر کے کنارے تقریباً ۵ ہزار کارخانے تھے جن میں انواع واقسام کے سامان، اسباب معیشت، ظروف، آلات، اور سامان آرائش تیار ہوتے تھے۔ اسی طرح دستکاری کے اعلیٰ نوادر بازار میں آتے تھے۔ اور یہاں کی ساختہ چیزیں اور نوادر دوسرے ملکوں کو تحفے میں بھیجی جاتی تھیں۔ مدینۃ الزہرا میں سرکاری دارالصناعہ قائم تھا جس میں بڑے پیمانہ پر آلات حرب، اور بحری بیڑے تیار کئے جاتے تھے

(مقری، اسکاٹ)

تعمیرات کے لحاظ سے بھی الناصر کا دور اندلس کے اگلے پچھلے سب دوروں میں ممتاز رہا۔ مدینۃ الزہرا جو اندلس کا خوبصورت ترین سلسلہ عمارات تھا، اسی کے عہد میں تعمیر پایا۔

مدینۃ الزہرا کی بنا ۳۲۵ھ / ۹۳۶ء میں الناصر کی ایک کنیز زہرا کی خوشنودی کے لئے قرطبہ کے شمال میں جبل عروس کے نیچے ڈالی گئی۔ اس کی تعمیر کے زمانہ میں دس ہزار

Marfat.com

ہزار ۱۵۰۰ باربرداری کے جانور روزانہ کام کرتے تھے۔ روزانہ ۶ ہزار ریختہ کئے ہوئے پتھر لگائے جاتے تھے۔ ہر پتھر پر ادسطاً دس دینار خرچ ہوتے تھے۔ پتھر اور تیار کئے ہوئے ستون دنیا کے مختلف حصوں سے منگا کر لگائے گئے۔ سنگ مرمر امریہ کا سنگ موسیٰ ریہ کا گلابی اور سبز پتھر، اسفاقس اور قرطاصیفہ (افریقہ) سے منقوش و مذہب شام سے۔ ان پتھروں کے حوض میں طلائی نقوش اور تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ قصر کے ستون افریقہ، یورپ کے مختلف ممالک اور قسطنطنیہ اور اندلس میں بنائے گئے تھے۔ مدینۃ الزہرا کے انجینروں اور معماروں میں عبداللہ بن یونس، علی بن جعفر اسکندرانی احمد یونانی، اور اسقف ربیع وغیرہ ممتاز تھے۔ انجینر، معماروں اور مستریوں کی تنخواہ پر ۳ لاکھ دینار سالانہ صرف ہوتے تھے۔ تعمیر کا سلسلہ ۲۵ سال تک جاری رہا۔ قصر الخلفا، مجلس مونس اور مسجد زہرا، مدینۃ الزہرا کی مشہور عمارتیں ہیں۔

قصر خلفا گویا ایوان عام تھا۔ اس کی چھت اور دیواریں طلائی و مرمریں تھیں۔ چھت کے اوپر سونے اور چاندی کے کھپڑوں سے چھایا گیا تھا۔ اس ایوان کے بارہ ضلعے تھے۔ ہر ضلع میں آٹھ آٹھ محرابوں والے در تھے۔ محرابیں رنگ برنگ کے بلوریں ستونوں پر قائم تھیں۔ کواڑ آبنوس اور ہاتھی دانت کے تھے، جن پر طلائی صنعت کاری کی گئی تھی۔ ایوان کے وسط میں اوپر ایک بہت بڑا ہیرا لٹک رہا تھا۔ وسط میں ایک محیر العقول حوض تھا جس میں پارہ بھرا گیا تھا۔ جب دھوپ کی شعاعیں اندر کی جاتی تھیں تو پارہ کی چمک سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ مقری کا بیان ہے کہ الناصر جب کسی نووارد پر رعب قائم کرنا چاہتا تھا تو چوبدار کو اشارہ کرتا، وہ دھوپ کی شعاعوں کے داخل ہونے والے دروازوں کو کھول دیتا۔ پورے ایوان میں چکا چوند پیدا ہو جاتی تھی اور دلوں پر رعب طاری ہو جاتا تھا۔

مجلس مونس شاہی محل کا مشرقی ایوان تھا۔ یہ کے نزدیک خوابگاہ کی عمارت تھی۔ اس کو ایوان خاص کہہ سکتے ہیں۔ سبز پتھروں کا ایک خوبصورت حوض اس میں بھی نصب تھا۔ اس کے گرداگرد سونے کے بنے ہوئے مختلف چرند، پرند اور درندہ جانوروں کے مجسمے نصب تھے۔ جن کے منہ سے پانی کا فوارہ جاری تھا۔ اسی کے پاس ایک دوسرا برنجی حوض تھا۔ جس پر ہر طرف سونا چڑھا ہوا تھا۔ اور جانوروں کی تصویریں بڑی صنعت سے بنائی گئی تھیں۔

مسجد زہرا۔ انہی محلوں کے تناسب سے عالیشان تیار کی گئی تھی۔ مسقف حصہ مسجد میں پانچ کے دالان تھے۔ صحن میں نیلگوں اور گلابی رنگ کے پتھر بچھے ہوئے تھے۔ وسط میں ایک حوض اور فوارہ تھا۔ اور ایک پہلو میں چوپہل مینار کھڑا تھا۔ مسجد کا مقصورہ دیوار قبلہ سے ملا ہوا تھا۔ بیش قیمتی بیل بوٹے اس کی دیواروں پر چڑھائے گئے تھے۔ مقصورہ کے لئے ایک منبر بھی نئی وضع کا بنایا گیا تھا۔ اس مسجد کی تعمیر ۲۲ شعبان [illegible]ھ (۲۳ جنوری [illegible]ء) کو ختم ہوئی۔

مدینۃ الزہرا میں ان شاہی محلوں کے علاوہ عالیشان حمام، بازار، سرائیں، مدرسے اور سرکاری عمارتیں بنائی گئی تھیں۔ یہیں حکومت کا دارالصناعہ بھی تھا۔ نیز ایک عجائب خانہ کھولا گیا تھا۔ مدینۃ الزہرا کے صدر پھاٹک پر ملکہ زہرا کا خوبصورت مجسمہ نصب کیا گیا تھا۔ مدینۃ الزہرا کی پشت پر جبل عروس واقع تھا۔ اس پر باغ اس طرح لگایا گیا تھا کہ پہاڑی اپنی زیبائش سے دلہن بن گئی۔ مدینۃ الزہرا کی عمارتوں میں صنعت، حسن کاری اور تناسب کا جو نمونہ تیار ہوا، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس سے پہلے روئے زمین پر کہیں ایسی عالیشان دلکش عمارتیں اور خوشنما منظر دکھائی نہیں دیا تھا۔

الناصر کے عہد حکومت کی چند اور یادگاریں ہیں جن میں قصر رزاق، مسجد قرطبہ ہیں۔ اس کے قیمتی اضافے اور قصر الروضہ کی یادگار عمارتوں کی تعمیر

ہے۔ الناصر کی تعمیری دلچسپیوں کی وجہ سے اندلس میں تعمیری ذوق کی عام اشاعت ہوئی۔ اور وزراء امراء اور ارباب ثروت کے معلوم نہیں کتنے قصور و محلات اس دور میں تعمیر ہو گئے تھے۔ (ابن اثیر مقری، ابن خلدون، لین پول، اندلس کا تاریخی جغرافیہ)۔

تجارت ۔ ملک کی زرعی، صنعتی، و تعمیری ترقیوں کا قدرتی نتیجہ تھا کہ اس عہد میں اندلس کی تجارت اپنے کمال فروغ پر پہنچی۔ الناصر نے تجارت کی ترقی کے لئے وسیع پیمانہ پر اہتمام کیا۔ آمد و رفت و رسل و رسائل کے لئے ہموار سڑکیں تعمیر کرائیں۔ ڈاک کا معقول انتظام کیا۔ ڈاک کی چوکیاں اور قلعے افریقہ و مغرب میں بھی تعمیر کئے۔ بازاروں کو رونق دی۔ بحری تجارت کے لئے مضبوط تجارتی بیڑے تیار کرائے۔ اس عہد میں اندلس کے تجارتی تعلقات فرانس، اٹلی، جرمنی اور قسطنطنیہ سے زیادہ وابستہ تھے۔ مختلف حکومتوں کی دوستانہ سفارتوں اور عہد ناموں میں اس کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اس طرح افریقہ، مصر اور شام سے درآمد و برآمد کے سلسلے قائم تھے۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے تجارتی بیڑے دور دراز ملکوں، سواحل چین، صغد اور سیلون تک آنے جانے لگے۔ ان تجارتی تعلقات سے خصوصاً یورپ میں اسلامی تہذیب، و تمدن کے پھیلنے کی راہیں پیدا ہوئیں۔

پیدائش دولت کے ان غیر معمولی وسائل کے باعث ملک میں عام رفاہ و فراغ بالی کا دار دورہ تھا۔ ملک کے باشندے صنعت حرفت، زراعت تعمیر اور تجارت میں مصروف رہتے تھے۔ اور ان میں حسب مراتب دولت تقسیم ہوتی تھی۔ پھر دولت کے صرف میں بھی اسی کے شایان شان ملک کے گوشہ گوشہ میں عیش و عشرت کے سامان نظر آتے تھے اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ عبد الرحمٰن الناصر کا عہد حکومت معاشی حیثیت سے اندلس کے باشندوں کے لئے بہترین زمانہ تھا۔ اس سے پہلے اندلس کو ایسی سرسبزی و شادابی اور معاشی فراغ بالی کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ قرطبہ کی آبادی دس لاکھ نفوس تک پہنچ گئی تھی۔ بعض مغربی مورخین کے اندازہ کے مطابق اس زمانہ میں (۸۰) شہر ایسے تھے، جو موجودہ زمانہ میں کارپوریشن کے مرتبہ کے سمجھے جا سکتے ہیں۔ (۳۰۰) شہر میونسپلٹی کی حیثیت کے تھے۔ اور قصبوں اور گاؤں کے اعداد و شمار کا یہ حال تھا کہ صرف وادی کبیر کے کنارے (۱۲) ہزار چھوٹے بڑے گاؤں آباد تھے۔ (مقری و ابن خلدون ابن اثیر، لین پول، اسکاٹ)۔

علوم و فنون ۔ ملک کی معاشی مرفہ الحالی کے ساتھ قدرۃً علوم و فنون کو بھی ترقی کے نمایاں مواقع حاصل ہوئے۔ الناصر خود صاحب علم و فضل تھا۔ دینی، عقلی، و ادبی علوم پر یکساں عبور رکھتا تھا۔ علماء و فضلاء، و شعراء کا قدر داں تھا۔ اس کے دربار میں علمی مذاکروں کی مجلسیں قائم ہوتی تھیں۔

کا شائق تھا۔ علماء و ارباب فضل کا دل سے احترام کرتا تھا۔ شیخ ابو ابراہیم فقیہ اس عہد کے ذی علم بزرگوں میں تھے۔ درس و تدریس کا مشغلہ رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی ضرورت سے عبد الرحمٰن نے انہیں طلب کیا۔ خواجہ سرا آیا۔ موصوف نے جواب دیا "امیر المومنین سے کہد دیں اللہ کے گھر میں طلباء کو حدیث سنا رہا ہوں۔ وہ لکھتے جاتے ہیں۔ یہ مجلس محض اللہ کی خوشنودی کے لئے منعقد ہوئی ہے۔ دربار شاہی میں حاضری دینے سے یہاں ٹھہرنا زیادہ مناسب ہے" خواجہ سرا برافروختہ ہو کر جواب لئے دربار میں واپس گیا۔ الناصر نے جواب سن کر خاموشی سے کہا "جاؤ انتظار کرو جب درس ختم ہو لے آؤ" اس نے آکر پھر پیغام دیا۔ موصوف نے کہلایا "میں ضعیف ہوں نہ زیادہ پیدل چل سکتا ہوں نہ سواری پر جا سکتا ہوں۔ محل کا باب الصناع قریب پڑتا ہے۔ یہ کھول دیا جائے" یہ دروازہ صرف شاہی تقریبوں میں شاہی ضرورتوں سے کھلا کرتا تھا، الناصر نے بلا تامل اس کے کھولنے کا حکم دیا۔ اور موصوف کی

Marfat.com

دروازہ سے محل کی نشستگاہ میں تشریف لے گئے۔

مدینۃ الزہرا کی تعمیری مصروفیتوں میں الناصر کے دو تین جمعے ناغے ہو گئے۔ تیسرے جمعہ میں جب وہ نماز پڑھنے مسجد میں آیا تو اس دن قاضی منذر بن سعید بلوطی نے جو خطیب اندلس بھی تھے اپنے خطبہ میں ایسی آیتیں پڑھیں جن میں عالیشان قصور و محلات کی ناپائیداری کا ذکر آیا ہے۔ پھر فرائض و واجبات کے ترک پر وعید کی آیتیں اور حدیثیں پڑھیں۔ اس خطبہ میں روئے سخن تمام تر الناصر کی طرف تھا۔ اس کو یہ سخت ناگوار گذرا۔ اس نے کہا کہ قاضی منذر نے مجھ پر سخت زیادتی کی ہے۔ بھرے مجلس میں میری ذلت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اس نصیحت میں سیاست حال کا لحاظ بھی نہ رکھا۔ ان کا لہجہ ایسا سخت تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ قریب ہے کہ وہ اپنے عصا سے مجھ پر حملہ آور ہو جائیں۔ پھر قسم کھائی کہ منذر کے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا۔ کچھ دنوں اس پر عمل کیا تو حکم نے کہا جب آپ ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تو انہیں معزول کیوں نہیں کر دیتے ہیں۔ یہ سنتے ہی الناصر سخت برہم ہوا۔ اور کہا "یہ ممکن ہے کہ تم کو ولیعہدی سے معزول کر دوں۔ لیکن قاضی منذر کو معزول نہیں کر سکتا۔ یہ میرے لئے سعادت ہوگی کہ میرے اور میری نماز جمعہ کے درمیان بارگاہ خداوندی میں قاضی منذر جیسے باورع بزرگ میرے شفیع ہوں۔ میں کفارہ ادا کروں گا۔ اور ان کے پیچھے نماز پڑھا کروں گا" چنانچہ ایک دعوت کا اہتمام ہوا۔ عمائد وعلما بلائے گئے۔ قاضی منذر خاص طور پر مدعو ہوئے الناصر نے بھری محفل میں اپنی غلطی پر ان سے درگذر چاہی۔ المنذر نے اس موقع پر بھی نصیحت کے چند کلمات سنائے۔ (نفح الطیب مقری)

الناصر نے سائنٹیفک ترقیوں کے لئے ایک مستقل ادارہ قائم کیا تھا۔ اندلس کا مشہور طبیب ابن جلجل اس ادارہ کا نگراں تھا۔ مستند اطبا کی ایک جماعت علمی تحقیقات میں مصروف تھی۔ اس ادارہ کے دائرہ عمل میں یہ بھی تھا کہ علم طب کی یونانی اصطلاحوں اور دواؤں کے نام عربی زبان میں منتقل کئے جائیں۔ اور پیش رو مصنفین سے جو غلطیاں ہوئی ہیں، ان کی اصلاح کی جائے۔ قیصر روم کے تحائف میں یونانی و لاطینی زبان میں علم طب کی نادر الوجود کتابیں بھی آئی تھیں۔ وہ کتابیں اس مجلس کے سپرد کی گئی تھیں جن پر اس نے اہتمام سے کام کیا۔ (عیون الانبا۔ ترجمہ ابن جلجل)

اس کے عہد میں علوم و فنون کی بکثرت درسگاہیں قائم تھیں۔ جن میں نہ صرف مسلمان طلبا، بلکہ یورپ کے دور دور ملکوں کے عیسائی طلبہ آکر تعلیم حاصل کرتے۔ اور اپنے ملکوں میں واپس جا کر وہاں کی جہالت کی کو دور کرتے تھے۔ ان مدارس سے محدثین، مفسرین فقہا، متکلمین، علما، ہیئت، اطبا، فلاسفہ، ادبا و شعرا پیدا ہوئے جن کے ذکر سے رجال اندلس کی کتابیں لبریز ہیں۔

الغرض خلیفہ عبدالرحمٰن الناصر کا عہد حکومت اپنی درخشان مختلف حیثیات کے لحاظ سے اندلس کا سب سے درخشان عہد تھا۔

وفات

خلیفہ عبدالرحمٰن ناصر نے ۷۳ سال کی عمر میں ماہ رمضان ۳۵۰ھ (۹۶۱ء) میں اس دار فانی کو الوداع کہا۔ اس نے کامل پچاس برس ۶ مہینے ۳ دن حکومت کی اور اپنے دور حکومت میں اندلس کی دنیا بدل ڈالی۔

اگست ۱۹۴۵ء

Marfat.com

افغانستان

جنگِ عظیم کے بعد

از جناب سید محبوب احمد صاحب وارثی بی اے۔ ایل ایل بی۔ علیگ

جنگِ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے اور ختم ہونے کے بعد تک افغانستان میں فی الحقیقت کوئی آزاد اور خود مختار حکومت نہ تھی، بلکہ حکومت برطانیہ کے زیر اثر یہ ایک ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس کے فرمانروا کو بادشاہ نہیں، بلکہ امیر کہا جاتا تھا۔۔۔ جنگ عظیم کے دوران میں افغانستان میں امیر حبیب اللہ خاں برسراقتدار حکومت تھے۔ برطانیہ سے ان کی دوستی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ افغانستان میں صرف برطانوی حکومت قائم ہونی باقی رہ گئی تھی ورنہ برطانوی اثر اور اقتدار دوستی کی حد سے تجاوز کر کے ملک کو محکومیت کے درجے پر پہنچا چکے تھے۔

سنہ ۱۹۱۸ء میں جنگ عظیم ختم ہوئی، اور افغانیوں نے محسوس کیا کہ برطانیہ کی دوستی ملک کے حق میں مہلک ثابت ہو رہی ہے۔ امیر حبیب اللہ کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن ان کی دوستی عشق کی اس حد تک پہنچ چکی تھی، جہاں خطرات کا احساس ممکن ہی نہیں ہے۔ لہٰذا ملک کے باشندوں کے دلوں میں بادشاہ وقت کے خلاف منافرت کے جذبات پرورش پانے لگے، اور ایک سال بھی گذرنے نہ پایا تھا کہ اس جذبہ نے خطرناک صورت اختیار کر لی اور سنہ ۱۹۱۹ء کے اوائل میں امیر حبیب اللہ خاں کو اپنی عزیز جان کو برطانیہ کی دوستی کا حق ادا کرنا پڑا۔

فروری سنہ ۱۹۱۹ء میں امیر امان اللہ خاں نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ امیر امان اللہ خاں نے برطانیہ کی دوستی کا نتیجہ ملک اور بادشاہ کے حق میں بھی بخوبی دیکھ لیا تھا۔ ایک ہمدرد اور بہی خواہ وطن ہونے کی حیثیت سے ملک میں برطانوی اثر و اقتدار کو یک لخت ختم کرنا انہوں نے اپنا فرض اولیں جانا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کی خاطر امیر امان اللہ نے مئی سنہ ۱۹۱۹ء میں افغانی فوج کا ایک مضبوط دستہ ہندوستان کی سرحد پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ کیا۔ جنگ عظیم کو ختم ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہونے پایا تھا کہ برطانیہ کے سر پر مصیبت کا نیا پہاڑ افغانی فوج کی شکل میں ٹوٹ پڑا۔ دو تین مقامات پر افغانی اور برطانوی فوجوں میں سخت مڈبھیڑ ہوئی۔ دو مقامات پر افغانستان کو فتح ہوئی۔ اور ایک مقام پر برطانیہ کو۔ جنگ عظیم کی ماندگی ابھی دور نہیں ہوئی تھی اسلئے برطانیہ نے اس جنگ کو ختم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور بالآخر یہ طے پایا کہ برطانیہ اپنی قدیم پالیسی کو افغانستان میں جاری نہ رکھے گا۔ صلحنامہ راولپنڈی پر فریقین کے دستخط ہو جانے کے بعد افغانستان کی سرحد متعین کر دی گئی۔ اور فرمانروائے افغانستان کا لقب "ہز میجسٹی" تسلیم کر کے برطانوی اثر اور اقتدار کو افغانستان میں ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔

اس کامیاب مہم سے فرصت پا کر امان اللہ خاں نے ملک کی اصلاح کی ٹھانی۔ امان اللہ ایک روشن خیال اور جدید روشنی کا دلدادہ فرمانروا تھا۔ ملک کی ابتری اور زبوں حالی نے اس کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ افغانستان کی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ ترقی کے وہ ذرائع جنہیں اختیار کر کے دوسرے ممالک نے ترقی کے زینے طے کئے ہیں۔ افغانستان میں بغیر ترمیم و تنسیخ عمل میں نہ لائے جائیں۔ یورپ کی ترقی نے اس کے دل میں رشک کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اور اس کی دلی تمنا تھی کہ اس کا ملک بھی ترقی کے میدان میں یورپ کے دوش بدوش نظر آئے۔ مذہبی پیشواؤں نے اپنے ذاتی اقتدار کو قایم رکھنے کی غرض سے ملک کو مذہب کے خود ساختہ اصولوں کی آہنی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ گویا اسلام اصلاح اور ترقی کا دشمن ہے۔ اور تغیرات زمانہ کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ امان اللہ خاں اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوا کہ تاوقتیکہ ان آہنی زنجیروں کے ٹکڑے نہ کر دئے جائیں ملک ہرگز ترقی نہیں کر سکتا ہے۔ مخالفوں کی پرواہ کئے بغیر اس نے اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا۔ ملک کے باشندوں کے علاوہ بیرونی طاقتوں نے حریفانہ کارروائیاں شروع کیں لیکن امان اللہ کو ان کے ارادوں سے باز رکھنا کوئی آسان امر نہ تھا۔ چنانچہ باوجود شدید مخالفتوں کے اصلاحات کی متعدد دفعات ملک میں جاری کر دی گئیں۔

Marfat.com

ملک کی اندرونی حالت کی درستی اگر ضروری تھی تو اس سے زیادہ ضروری ملک کے بیرونی اور بین الاقوامی تعلقات کا قیام تھا۔ بین الاقوامی تعلقات قائم کئے بغیر افغانستان کی آزادی ناپائدار اور غیر مستحکم ثابت ہو رہی تھی۔ چنانچہ مارچ ۱۹۲۱ء میں امان اللہ نے سب سے پہلے ترکی سے دوستانہ تعلقات رکھنے کا معاہدہ کیا۔ اسی ماہ میں ایران سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کے علاوہ تجارتی اور سیاسی معاملات کے لئے بھی ایک معاہدہ کیا گیا۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں روس کا وفد افغانستان آیا اور افغانستان اور روس میں بھی ایک معاہدہ کے ذریعہ دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔

ان معاہدوں نے افغانستان کو آزاد ممالک کے دوش بدوش لا کھڑا کیا۔ اور جب امان اللہ خاں کو اپنے ملک کے مکمل آزاد ہونے کا اطمینان ہو گیا تو اس نے یورپ کی ترقی کا راز براہ راست معلوم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر امان اللہ ۱۹۲۷ء میں یورپ کے سفر پر روانہ ہوئے۔ کامل ایک سال تک یورپ کے مختلف ممالک کی سیر کرتے رہے۔ اور وہاں کے حالات کا بغور مطالعہ اور ان کی ترقی کا راز معلوم کرنے کے بعد ترکی اور ایران کو دیکھ کر ۱۹۲۸ء میں افغانستان واپس آ گئے۔

یورپ کے سفر نے امان اللہ خاں کے خیالات میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اور اپنے ملک کو یورپ کی تہذیب کا جامہ پہنانے کی فکر نے انہیں اس قدر بے چین کر دیا کہ انہوں نے چشم زدن میں کابل کو پیرس اور قندھار کو لندن کی شکل میں دیکھنا چاہا ---- یورپ جانے سے پیشتر مذہبی پیشواؤں نے مخالفت کا علم بلند کر دیا تھا۔ ملک سے مکمل ایک سال کی غیر حاضری سے مخالفین نے ہر قسم کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ چنانچہ امان اللہ کے واپس آنے کے بعد مخالفت کا طوفان اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ عمائد سلطنت و اکابر حکومت بھی مخالفین کی صف اول میں آ کھڑے ہوئے تھے۔ امان اللہ خاں نے مصلحت وقت اور ہوا کا رخ دیکھے بغیر شور اور سنگلاخ زمین میں اصلاحات کے پودے نصب کر ڈالے۔ موسم کی غیر موزونیت اور مخالفت کی تند ہوا نے پودوں کو جڑ پکڑنے نہ دیا۔ امان اللہ خاں نے اپنے جوش کے عالم میں ملاؤں کے علاوہ بااثر عمائد سلطنت کے خلاف بھی جارحانہ قدم اٹھایا اور یہ ان کی زندگی کی پہلی اور آخری غلطی ثابت ہوئی۔ ملک میں مخالفت کا ایک ایسا شور برپا ہوا کہ امان اللہ اس کی تاب نہ لا سکے اور اس شورش نے ملا آئے شور بازار کو مخالفت کا علمبردار بنا کر مئی ۱۹۲۹ء میں امان اللہ کو جلاوطن کر دیا۔

افغانستان کی اس خانہ جنگی نے بچۂ سقہ نامی ایک جاہل غریب اور گمنام شخص کو تخت و تاج کا مالک بنا دیا۔ پانچ ماہ تک ملک کی حکومت اس ڈاکو بچۂ سقہ کے ہاتھوں میں رہی اور اس عرصہ میں افغانستان کے شاہی قلعہ اور شاہی دربار میں جو ڈرامہ اسٹیج ہوا کیا اس کا تذکرہ بھی شرمناک ہے۔ اس ڈرامے کا ڈائرکٹر بچۂ سقہ تھا۔ اور اس کے ایکٹر بچۂ سقہ کے وہ ساتھی تھے جنہوں نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا تھا۔

بچۂ سقہ کی حکومت افغانستان کے شرفاء و روساء کی عزت و ناموس پر ایک ایسا حملہ تھا جسے وہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۲۹ء میں نادر خاں کے زیر کمان افغانی فوج نے بچۂ سقہ کی حکومت کا خاتمہ کر کے ملک کو مزید ذلت و رسوائی سے بچا لیا۔ ۱۶ر اکتوبر ۱۹۲۹ء کو نادر خاں کو ملک کے باشندوں نے بہ اتفاق رائے اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ اس انتخاب نے افغانستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا اور جنرل نادر خاں، نادر شاہ کے لقب سے تخت حکومت پر بیٹھے۔

نادر شاہ کو ملک کا کافی تجربہ ہو چکا تھا۔ اور انہوں نے ملک کے باشندوں کی ذہنیت کا بھی صحیح اندازہ لگا لیا تھا اس لئے انہوں نے امان اللہ کی پالیسی برقرار رکھتے ہوئے اس احتیاط کے ساتھ اس پر عمل شروع کیا کہ مخالفتوں کا طوفان تھمتا گیا۔ اور خلاف توقع ایک قلیل عرصہ میں زمین از خود ہموار ہو گئی۔

اصلاحات افغانستان نادر شاہ کے عہد حکومت میں

دستور اساسی نادر شاہ نے اصلاحات کے باب میں سب سے اول جگہ دستور اساسی کو دی کیونکہ سابق دستور اساسی کے رائج رہتے ہوئے ملک کی ترقی کے لئے مخالفت کے فتنہ کو جگائے بغیر کوئی اصلاح جاری کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے ۱۹۳۱ء میں نادر شاہ نے ایک مکمل جامع دستور اساسی کی تشکیل کر کے ملک کی ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھول دیا۔ اور مخالفت کے سیلاب کی آمد کے تمام راستے بند کر دئے۔ اس جدید دستور اساسی کی رو سے ملک میں پہلی مرتبہ دو ایوانوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ ایک ایوان کا نام سینٹ رکھا گیا۔ اور دوسرے کا نیشنل اسمبلی۔ سینٹ کے اراکین کا انتخاب بادشاہ وقت کے ہاتھوں عمل میں آتا ہے، اور نیشنل اسمبلی کے اراکین کو ملک کے باشندے منتخب کرتے ہیں بلکہ ہر بالغ اور صحیح الدماغ مرد کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ افغانستان کی بادشاہت موروثی ہے اور بادشاہ کا بڑا بیٹا تخت و تاج کا وارث ہوتا ہے۔ حکومت کے مختلف شعبے ہیں اور ہر شعبہ ایک وزیر کے سپرد ہے۔ وزیر اعظم کی تقرری بادشاہ وقت خود کیا کرتا ہے اور دیگر وزرا کی تقرری بادشاہ کی منظوری سے وزیر اعظم کرتا ہے۔ مختلف شعبوں کے نام حسب ذیل ہیں جو فی الحال ذیل کے وزرا کی نگرانی میں نہایت

Marfat.com

سرعت کے ساتھ ترقی کے زینے طے کر رہے ہیں۔

۱	وزیر حربیہ	=	شاہ محمود خاں
۲	وزیر خارجیہ	=	فیض محمد خاں
۳	وزیر داخلیہ	=	محمد گل خاں
۴	وزیر عدلیہ	=	فضل احمد خاں
۵	وزیر معارف	=	احمد علی خاں
۶	وزیر تجارت و مالیہ	=	میرزا محمد خاں
۷	وزیر فوائد عامہ	=	اللہ نواز خاں
۸	مدیر مستقل طبیہ	=	محمد اکبر خاں
۹	ٹیلیگراف و ٹیلیفون		رحیم اللہ خاں

فوج

ایران کی مانند افغانستان کو بھی اپنی خوش قسمتی سے ایک فوجی سپہ سالار بادشاہ کی قیادت نصیب ہوئی، چنانچہ فوجی اصلاحات میں افغانستان کو بھی بڑی کامیابی ہوئی۔ نادر شاہ نے فوج میں اصلاح نہیں بلکہ ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ملک میں ——— بد امنی بغاوت اور خانہ جنگی کے باعث افغانی فوج کی ذہنیت حد سے زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ نادر شاہ نے اپنی پیہم کوششوں سے فوج میں ڈسپلن کی ایسی روح پھونک دی کہ آج افغانی فوج کی ڈسپلن دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ہے کہ چند سال پیشتر اس ملک میں اتنی سخت بغاوت بھی ہوئی تھی۔ فوج کی ڈسپلن درست کرنے کے بعد فوج کے لئے جدید ترین سامان حرب مہیا کئے گئے اور آج افغانی فوج کے پاس ہر قسم کے جدید ترین لوازم جنگ موجود ہیں۔ افغانی فوج کا سپاہی آج جرمن اور انگلینڈ کی فوج کے سپاہی سے ہرگز مختلف نہیں ہے۔ فوجی افسروں کی تعلیم کے لئے نادر شاہ نے ایک ملٹری اکیڈمی بھی قائم کی جس میں اعلیٰ قسم کی جدید ترین فوجی تعلیم دی جاتی ہے۔

تعلیم

افغانستان کی جہالت ضرب المثل ہے اور بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان کی خانہ جنگی کا واحد سبب وہاں کی عام جہالت تھی جس سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مذہبی پیشواؤں نے مذہب کے نام پر ملک کی ترقی کی راہیں روکنی چاہیں اور انہیں ایک بڑی حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ نادر شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں جہالت کے خلاف ایک عام جنگ کا اعلان کر دیا۔ ملک میں جہالت کا دورہ ختم کرنے کے لئے متعدد مدرسے اور اسکول قائم کئے گئے۔ حکومت کی طرف سے وظیفے دے کر طلبہ کو یورپ کے مختلف ممالک میں تحصیل علم کیلئے بھیجا گیا۔ عام تعلیم کے علاوہ طلبہ سینکڑوں کی تعداد میں صنعتی تعلیم کے لئے جرمنی، انگلینڈ اور امریکہ بھیجے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ افغانستان کے طلبہ کی سب سے بڑی تعداد اس وقت امریکہ میں صنعتی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔ نادر شاہ نے اپنی حکومت کی قلیل مدت میں ایک یونیورسٹی بھی قائم کی جس میں عام تعلیم کے علاوہ صنعتی اور حرفتی تعلیم کا بھی معقول انتظام ہے۔

زراعت و تجارت

افغانستان دنیا کا ایک نہایت زرخیز ملک ہے۔ یہاں کی پیداوار کا مقابلہ دنیا کے کسی دوسرے ملک کی پیداوار سے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ نادر شاہی حکومت نے آبپاشی کا معقول نظم کر کے اور زراعت کی دوسری جدید سہولتیں بہم پہنچا کر زراعت کی ترقی لامحدود کر دی ہے۔ تجارت کی ترقی کے لیے غیر ممالک سے تجارتی سمجھوتے اور ملک میں متعدد سڑکیں اور بنک وغیرہ بنائے گئے جن کا اثر ملک کی عام تجارت پر نہایت اچھا پڑا اور نئی تجارتوں کے دروازے کھل گئے۔

اسلامی ممالک سے تعلقات

دیگر اسلامی ممالک کی ترقی پذیر حالت کو دیکھتے ہوئے اور بین الاقوامی سیاسیات میں ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کو محسوس کرتے ہوئے نادر شاہ نے یہ ضروری سمجھا کہ افغانستان دیگر اسلامی ممالک سے اپنے تعلقات قائم کر کے اپنا پوزیشن مستحکم کرے۔ چنانچہ نادر شاہ نے اسلامی حکومتوں سے نئے معاہدے کر کے ترکی، ایران، حجاز، مصر اور بغداد میں افغانی سفارت خانے قائم کئے۔ سفارت خانوں کے قیام نے افغانستان کے تعلقات اسلامی دنیا سے نہایت خوشگوار کر دئے ہیں۔ اور امید کی جاتی ہے کہ افغانستان کو کسی اسلامی سلطنت کے خلاف فوج کشی کی ضرورت کبھی پیش نہ آئیگی۔

ملاؤں کا خاتمہ

نادر شاہ کی حکمت عملی نے افغانستان کو دوبارہ زندگی عطا کی ہے۔ سب سے زیادہ خوش آئندہ امر یہ ہے کہ نادر شاہ کی دور اندیشی اور سیاست دانی نے خود غرض اور پیشہ ور ملاؤں کے اثر کو ایک بڑی حد تک ختم کر دیا ہے۔ اور یہی افغانستان کی آئندہ ترقیوں کا راز ثابت ہوگا۔ نادر شاہ نے ملک میں کوئی نئی پالیسی رائج نہیں کی۔ اُن کے دورِ حکومت میں سلطنت کا ہر شعبہ امان اللہ کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ امان اللہ کو ان کی

Marfat.com

ت اندیشی نے ناکام کیا اور نادر شاہ کو ان کی دُور اندیشی نے کامیاب بنایا۔

شاہ کا واقعہ شہادت

۸ رنومبر ۱۹۳۳ء کو افغانستان میں ایک دوسرا جانکاہ حادثہ پیش آیا۔ نادر شاہ بعد نماز ظہر ایک یں طلبہ کو انعامات تقسیم کرتے ہوئے گولیوں کا نشانہ بنائے گئے۔ نادر شاہ کی شہادت نے ملک میں ایک ہیجان برپا کر دیا اور دُنیا سمجھا کہ افغانستان میں پھر ایک مرتبہ خونریزی اور خانہ جنگی کا بازار گرم ہوگا۔ لیکن ارباب حکومت نے فوراً ہی حالات پر قابو پالیا۔ اور ں کو اپنے ارادوں میں کامیاب ہونے کا موقعہ دئے بغیر نادر شاہ کے اکلوتے اور جواں سال بیٹے محمد ظاہر شاہ کو ملک کا تخت و تاج حوالہ خت نشینی کے وقت محمد ظاہر شاہ تحصیل علم میں مشغول تھے۔ اور انہیں یہ گمان بھی نہ تھا کہ اتنی جلد اتنی بڑی ذمہ داری اُن کے سپرد کر ئے گی۔ لیکن ظاہر شاہ جواں سال ہونے کے علاوہ جواں ہمت بھی ثابت ہوئے۔ انہوں نے اپنی تاجپوشی کے بعد وزرا۔ عمائد حکومت اور خدام سلطنت م جو فرمان جاری کیا اُس سے اُن کی بیدار مغزی اور اعلیٰ تعلیم و تربیت کا پتہ لگتا ہے۔ ذیل میں اس فرمان کا آزاد ترجمہ مختصراً ناظرین کی دلچسپی لئے درج کیا جاتا ہے۔

شی حکومت اعلیحضرت محمد ظاہر شاہ

بنام محترم محمد ہاشم خاں۔ صدر اعظم مملکت افغانستان۔

موجودہ حکومت اسلام کے احکام اور حنفی مذہب کے اصول کے مطابق تمام امور سلطنت کو انجام دیگی۔ مجلس شوریٰ اور وزارت عدلیہ کا فرض ہو کہ ت محمدی کو ملک میں قایم رکھے۔ شعبۂ احتساب اس حکومت کا ایک جزو لازم ہے۔ سلطنت کے کاموں کی انجام دہی میں بلا تفریق قومیت و نسل ہر کے حقوق مساوی تصور کئے جائیں۔ افغانستان میں پردہ اُسی حد تک رہیگا جس حد تک شریعت نے تاکید کی ہے۔

۔ رشوت اور شراب نوشی کی سخت ممانعت۔ میرے عہد حکومت میں سلطنت کے ہر رکن کو قرآن مجید کی قسم کھانی ہوگی کہ وہ سلطنت کے امور کی ردہی میں ــــ کسی شخص سے رشوت ہرگز قبول نہ کرے گا۔ اور اپنی تنخواہ پر اکتفا کر کے دیانتداری اور ایمانداری سے اپنے فرائض کو انجام ۔ شراب نوشی کی سزا شریعت کے مطابق دیجائے گی۔ اور مامورین حکومت کو شرعی سزا کے علاوہ اُن کے عہدوں سے بھی برطرف کر دیا جائیگا ستان میں شراب فروشی قطعاً ممنوع ہے اور اگر کوئی شخص اپنے مکان یا دُوکان پر شراب بیچتا پکڑا جائے تو اس کی جائداد ضبط کر لیجائے۔ س کی سزا شریعت کے اصول کے مطابق کیجائے۔

۔ امور حربیہ۔ موجودہ حکومت کی خواہش ہے کہ اس مسئلہ کو کافی اہمیت دیجائے۔ کیونکہ اس شعبے سے افغانستان کی حیات و ممات وابستہ ہے ی جدید ترین اصولوں پر تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے اور جدید سامان حرب مہیا کئے جائیں۔ فوجی افسروں کی تعلیم کے لئے فوجی اسکول کو ینے کے تمام ذرایع عمل میں لائے جائیں۔ اور فوج کی دلجوئی اور خوشنودی کا خاص خیال رکھا جائے۔

۔ شعبۂ خارجیہ۔ غیر ممالک سے وہ دوستانہ تعلقات قایم رکھے جائیں۔ جو سلاطین پیشین یعنی امان اللہ خاں اور نادر شاہ کے زمانے میں روں کے ذریعہ قایم کئے گئے تھے۔ اور افغانستان کے تحفظ و استقلال کیلئے اگر ضرورت پیش آئے تو نئے معاہدے بھی کئے جائیں۔

۔ امور داخلہ۔ وزارت داخلیہ کا فرض ہے کہ وہ حکومت کے ہر چھوٹے بڑے افسروں اور حاکموں کے کاموں پر نظر رکھے اور اس بات کی کوشش ہ جو شخص جس کام کا اہل ہو اُسی کے سپرد وہ کام کیا جائے اور تمام افسروں اور حاکموں کی مکمل فہرست رکھی جائے اور اُسے وقتاً فوقتاً مجلس انتخاب کے سامنے ش کیا جائے تاکہ اس پر غور و خوض کیا جاسکے۔ ٹیلیفون۔ ٹیلیگراف۔ سڑکوں اور دیگر ذرایع مراسلات کی ترقی و توسیع کے لئے ہر ن کوشش کو فوراً عمل میں لایا جائے۔

۔ وزارت مالیہ۔ ملک کے باشندوں کو اختیار دیاجائے کہ حکومت کے ٹیکس قسطوں میں ادا کریں اور باقی۔ ندہ ٹیکس کی وصولی اس طرح کیجائے وگوں کو ناحق پریشانی اور ذلت اُٹھانی نہ پڑے۔ اور حکومت کے خزانہ کو بھی نقصان کا متحمل نہ ہونا پڑے۔ باقیات میں جس طرح سابق متوں نے معافی کا اعلان کیا تھا۔ موجودہ حکومت بھی اس اعلان کو برقرار رکھے۔ کوشش کیجائے کہ ملک کی آمدنی میں اضافہ ہو لیکن فرنگ باطل ملک کے باشندوں کو ناحق زیر بار ٹیکس نہ کیا جائے۔

۔ تجارت و زراعت۔ افغانستان کی حکومت اس شعبہ کو ترقی دینے کی ضرورت آج سب سے زیادہ محسوس کر رہی ہے۔ حکومت کی خواہش ہے کہ بیرونی لک مثلاً ایران۔ اطالیہ۔ فرانس۔ برطانیہ۔ اتحاد جماہیر اشتراکیہ۔ امریکہ۔ بلجیم۔ جرمنی اور جاپان سے تجارتی تعلقات قایم کئے جائیں اور ملک تجارت کو فروغ دیا جائے۔ معدنیات افغانستان کو ترقی دینے کے تمام ذرایع عمل میں لائے جائیں۔ آبپاشی کے لئے نہریں تعمیر کیجائیں

:۔۔ زراعت کی ترقی کے وسایل دریافت کیے جائیں ۔ (سالنامہ کابل)

پھر تخت نشینی کے وقت ظاہر شاہ نے جو عہد نمایندگان سلطنت اور اکابر حکومت کی موجودگی میں کیا تھا اُسے ذیل میں بجنسہٖ نقل کیا جا…
اس عہدنامے کی عبارت سے ظاہر شاہ کی حکومت اور پالیسی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اور انکی پالیسی کی وضاحت اس سے بہتر کرنی ممکن نہیں …

تعہدنامۂ اعلیحضرت محمد ظاہر شاہ بمجلس شورائے ملی

" امروز کہ ایں خادم اسلام بہ فضل خدائے قادر متعال و اتفاق ملت عزیز… بہ پادشاہی افغانستان انتخاب و سلطنت ما از طرف جمہور طبقات ملت نا… شدہ براساس اصولنامہ اساسی مملکت حاضر شدہ ایم، عہدنامہ را کہ قبول و تعہد آں بما متوجہ میشود بحضور شما نمایندگان ملت قرائت کردہ و صورت کتبی آنرا بنام سعادت مملکت امضا نمائیم ۔ ۔ بہ خدائے عظیم و قرآن کریم عہد می کنیم کہ در اعمال و افعال خود خداوند جل شانہ را حاضر و ناظر دانستہ بحفاظت دین مبین اسلام و استقلال افغانستان و حفظ حقوق ملت و حراست و ترقی و سعادت وطن بر اساس شرع متین محمدی و مقررات اصول اساسی مملکت سلطنت نمایم و بہ برکت روحانیت مقدس اولیائے کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم برائے خود استمداد می نمایم ۔ (سالنامہ کابل …)

ندیم - بہار نمبر ۱۹۴۰ء

Marfat.com

سیّد جمال الدین افغانی

(۱۲۵۴ھ / ۱۸۳۸ — ۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷)

از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی

امام الاحرار سید جمال الدین افغانی پر جناب محمود صاحب بریلوی کا مفید مضمون نظر سے گذرا، انگریزی کتابوں سے استفادہ کے باعث بعض اسماء و اعلام کے تلفظ میں مسامحت ہو گئی ہے، نامناسب نہ ہو گا اگر ان کی تصحیح کر دی جائے۔

(۱) احمد عرابی پاشا (۱۲۵۶ھ/۱۸۴۰ — ۱۳۲۹ھ/۱۹۱۱) کی مسلح بغاوت کو بار بار "عربی بغاوت" کہا گیا ہے۔ احمد عرابی مصر کے ان طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے فوج میں بھرتی ہوئے، اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر ترقی تے چلے گئے۔ خدیو اسماعیل کی من مانی کارروائیوں اور اسراف کے باعث مالیات پر غیروں کا تسلط ہو ہی چکا تھا، خدیو توفیق عہد میں پیچیدگیاں اور بڑھ گئیں، تا آنکہ ملک میں ایک فوجی انقلاب رونما ہوا، جس کی قیادت احمد عرابی کے ہاتھ میں ی، قصہ طویل ہے، خلاصہ یہ کہ اسکندریہ میں باشندوں کا "ذبح عام ہوا" (۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲) اور عرابی پاشا کو سیلون میں جلاوطن کر دیا گیا، ۱۳۱۹ھ میں یعنی انیس ۱۹ سال کے بعد خدیو عباس نے واپسی کی اجازت دی۔

یہی مصر کی مشہور "عرابی بغاوت" تھی، جسے مضمون میں بار بار "عربی بغاوت" کہا گیا ہے، عرابی کا انگریزی املا Arabi ہے، اس لئے غلط فہمی ہوئی، رہا یہ سوال کہ اسے بغاوت کہا جائے یا "جہاد حریت" تو ہندی اہل قلم کو سوچنا چاہئے کہ وہ ۵۷ء کی . . . . ناکام کشمکش کو کس نام سے ادا کرنا چاہتا ہے؟

(۲) (العروۃ الوثقیٰ) کا املا "العروۃ الوثقیٰ" ہونا چاہئے تھا[۱]، العروۃ الوثقیٰ امام سید جمال الدین اور شیخ محمد عبدہ کے مشہور ہفتہ وار اخبار کا نام تھا، ابھی اس پیام انقلاب کے دو چار ہی نمبر نکلنے پائے تھے کہ ایوان شہنشاہیت میں زلزلے کی دھمک محسوس ہونے لگی، عرش نشینوں کی نیند اچٹ گئی، بالآخر اس بیباکی کے کل اٹھارہ نمبر نکل پائے، مصر اور ہندوستان کے دروازے اس پر بند کر دیئے گئے، اور اخبار بند ہو گیا، لیکن اس کا ہر حرف محفوظ کتابی صورت میں بار بار چھپ چکا ہے، اور عربی جاننے والا اس کا پڑھنا فرض سمجھتا ہے، اس کو قریب قریب اردو میں "الہلال" کی حیثیت ہے، حقیقت میں الہلال کی دعوت بھی امام جمال الدین کے نعرہ حق کی صدائے بازگشت تھی، حق یہ ہے کہ اس صدی میں مشرق میں جس کو جو کچھ ملا . . . . وہ اسی امام الاحرار کے ذریعہ اور واسطہ سے — دعوت الہلال کے مبلغ مولانا ابو الکلام آزاد۔

[۱] ندیم — مضمون نگار نے اعلام ہی لکھا تھا۔ کتابت میں غلطی سرزد ہوئی۔

Marfat.com

بار بار اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ "المنار" کا پہلا نمبر غالباً ان ہی اور ان کے شاگرد شیخ محمد عبدہ کی تصویروں سے مزین تھا۔

(۳) ماخذ کے سلسلہ میں دو کتابیں بہت اہم ہیں جن کا علم ضروری ہے:-

(الف) علامہ سید رشید رضا رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ الاستاذ الامام۔ سید رشید مرحوم نے یہ تاریخ تین حصوں میں لکھی ہے، اس میں یہ کتاب شیخ محمد عبدہ (۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۹ء — ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۵ء) کی مکمل سوانح حیات ہے لیکن شیخ محمد عبدہ کا ذکر، ان کے استاذ اور مشرق کے امام سید جمال الدین کی سیرت کے بغیر کس طرح مکمل ہو سکتا تھا؟

سید رشید مرحوم نے ساتھ ساتھ امام جمال الدین کی سیرت بھی لکھ ڈالی۔ بیان کی جامعیت اور معلومات کی فراوانی کے متعلق کہنا کافی ہوگا کہ سید رشید مرحوم امام جمال الدین سے بچپن ہی سے واقف تھے، اور ان کے درمیان عرصہ تک خط و کتابت بھی رہی تھی۔ شیخ محمد عبدہ کی شاگردی کے بعد یہ رشتہ اور مستحکم ہو گیا۔ شیخ محمد عبدہ کے بعد یہ بطور بر وارث علوم "الحکیمین الامامین" کے نام سے جانے لگے، مصر کے مشہور مفکر ادیب مصطفیٰ صادق رافعی (متوفی ۱۹۳۷ء) خاص طور پر انہیں اس لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔

(ب) عہد حاضر کے امام سیاست اور دنیائے اسلام کے سب سے بڑے مفکر امیر شکیب ارسلان نے گو اپنے استاذ اور سید جمال الدین کی سیرت پر کوئی خاص کتاب نہیں لکھی، لیکن ان کی مختلف کتابوں میں "حکیم مشرق" کی سیرت اور کارناموں پر اتنا مو[اد] ہوا ہے کہ اگر انہیں سمیٹ کر یکجا کیا جائے تو مختصر لیکن جامع سیرت مرتب ہو جائے۔ میرا اشارہ خاص طور پر ان کی دو کتابوں (حا[ضر] العالم الاسلامی ۴ جلدیں؛ نیا اڈیشن) اور "السید رشید رضا او اخاء اربعین سنۃ" کی طرف ہے۔ موخر الذکر کتاب کی (اور اس کے ساتھ مقدم الذکر کتاب بھی) صحیح قدر و قیمت جاننے کے لئے راقم کا مضمون سیرت سید رشید رضا (معارف ۱۹۳۶ء: نومبر و دسمبر) پڑھئے۔ بات بڑھتی چلی جاتی ہے۔ امام جمال الدین کا جتنا بار بار ذکر آئے اچھا ہے۔ سر دست اسی قدر لکھنے پر اکتفا کرنے کی اجازت [چاہتا] ہوں، موقع ملا تو پھر کبھی تفصیل سے عرض کرنے کی کوشش کرونگا۔

(ندیم، اپریل ۱۹۴۱

Marfat.com

مقالات

حضرت علامہ سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ علیہ

از

جناب محمود بریلوی ریاست منگرول

حضرت علامہ سید جمال الدین افغانی ۱۸۳۹ء میں، افغانستان میں، کابل کے قریب بمقام اسد آباد، پیدا ہوئے۔ ان کا یہ مولد خود ان کے قول کے مطابق ہے، ورنہ ایرانی تو انھیں اپنی ہی قوم کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اسی نام کے مقام پر پیدا ہوئے تھے جو ایران میں شہر ہمدان کے متصل واقع ہے۔ اگر وہ واقعی ایرانی النسل تھے تو کوئی صحیح وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ انھوں نے خود کو افغانی کہلانا کیوں پسند کیا، کیونکہ ان کی اوائل عمر کے بیشتر حالات ہنوز پردۂ خفا میں ہیں۔ ان کے اس زمانۂ عمر کے متعلق ہمیں جو اطلاعات ملی ہیں وہ زیادہ تر خود انھیں کی زبان و قلم سے وابستہ ہیں۔ البتہ ان کی آخر عمر کے حالات کے متعلق کافی مواد موجود ہے۔ انگریزی زبان میں ان کا بہترین سوانح نگار پروفیسر ای جی براؤن اپنی مشہور تصنیف "انقلاب ایران" (Persian Rivolution) کے صفحات ۴۰۳ پر رقم طراز ہے کہ "انھوں نے خود کو بہ نسبت ایرانی کے افغانی کہلانا یوں زیادہ پسند کیا کہ اول تو وہ خود کو دوسروں کی نظروں میں کم تر ظاہر کرنا مناسب سمجھتے تھے، دوئم یہ کہ وہ ایران کی برائے نام حفاظت کو اپنے لئے بے معنی جانتے تھے۔ اور اس سے محترز رہنے میں مصلحت خیال کرتے تھے جیسا کہ بعد ازاں واقعات نے ثابت کر دکھایا۔ بہر نوع صداقت کچھ بھی ہو وہ 'الافغانی' کے نام سے موسوم ہو گئے۔" مذکورہ بالا انگریزی تصنیف کے صفحہ ۴۰۲ پر نوٹ کے ضمن میں یہ حوالہ بھی موجود ہے کہ ڈبلیو ایس بلنٹ نے اپنی ڈائری (مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۸۸۳ء) میں لکھا ہے کہ "سید جمالؒ کا خاندان عربی النسل تھا۔" محمد رشید رضا مصری مصنف نے "المنار" باب ہشتم صفحہ ۳۸۹ (۱۹۰۵ء) میں لکھا ہے کہ "سید جمالؒ باوجود ایک نہایت اچھے عربی مقرر و ادیب ہونے کے اپنی عربی تقریر و تحریر میں ایرانی زبان کے اثرات سے کبھی عہدہ برآ نہ ہو سکے۔"

موصوف کے والد کا نام نامی سید صفدر تھا، جو خود تو نادار و غیر تعلیم یافتہ تھے مگر اپنا سلسلۂ نسب مشہور و معروف محدث اسلام السید علی الترمذیؒ سے ملاتے تھے (جن کا انتقال ۱۸۹۲ء میں ہوا تھا) اور ان کے توسط سے خود کو حضرت حسینؓ شہید کربلا کی اولاد میں بتاتے تھے۔

Marfat.com

پانچ سے لیکر دس کی عمر تک حضرت جمال الدین افغانیؒ نے اپنے وطن کے مدرسہ میں تعلیم پائی۔ وہاں بعد انھوں نے ایران و افغانستان کے مختلف مقامات میں رہ کر تحصیل کی۔ حتیٰ کہ اٹھارہ سال کی عمر تک تمام علوم نقلیہ و عقلیہ میں انھوں نے کمال حاصل کر لیا۔ عربی صرف و نحو، لسانیات، علم کلام، تاریخ اسلام، الہیات، تصوف، منطق، فلسفہ، علم موجودات ہمئیت، طب، علم تشریح الاعضا، اور علم مابعد الطبعیات وغیرہ پر انھیں کامل عبور تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ہندوستان آئے اور یہاں وہ قریباً ڈیڑھ برس مقیم رہے۔ کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں انھوں نے انگریزی زبان بھی سیکھی تھی۔ پشتو، فارسی، ترکی اور عربی میں تو وہ پہلے ہی سے ماہر تھے۔ ہندوستان سے وہ مکہ معظمہ گئے جہاں وہ ۱۸۵۷ء میں پہنچے۔ وہاں سے وہ افغانستان دوست محمد خاں کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ وہ امیر کے ساتھ اس وقت بھی تھے جبکہ اس نے ہرات کا محاصرہ اور آخر کار اسے فتح کیا تھا۔ ہرات پر ان دنوں امیر کے چچیرے بھائی اور داماد سلطان احمد شاہ نے قبضہ کر لیا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں امیر دوست محمد خاں کا انتقال ہو گیا۔ اور شیر علی تخت افغانستان پر متمکن ہوا۔ اس کے تخت پر بیٹھتے ہی اس کے اور اس کے تینوں بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ حضرت سید جمال الدین نے ان میں سے ایک بھائی محمد اعظم کی رفاقت کی۔ جو سیکڑوں مصائب برداشت کرنے کے بعد بالآخر امیر افغانستان ہوا۔ اور حضرت جمال الدین کو اس نے اپنا وزیر اعظم بنایا۔ جن کی عمر اس وقت ستائیس سال کی تھی۔ محمد اعظم کے امیر ہوتے ہی پھر خانہ جنگی کی تجدید ہو گئی۔ اور شیر علی انگریزوں کی مدد سے دوبارہ تخت و تاج افغانستان کا مالک بن بیٹھا۔ شکست خوردہ محمد اعظم روپفرار ہوا اور غریب الوطنی کی ہی حالت میں جاں بحق ہوا۔

امیر شیر علی نے حضرت جمال الدینؒ کی بظاہر تو کوئی مخالفت نہیں کی کیونکہ اول تو وہ سید تھے، دوسرے یوں بھی ان کا جمہور میں کافی اثر و اعتقاد تھا۔ مگر در پردہ ان کی جان کا دشمن ہو گیا۔ دریں حالات حضرت سید نے مصلحتاً افغانستان سے ہجرت کی اور ۱۸۶۹ء میں ہندوستان کی راہ سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے۔ حکومت ہند نے ان کی پذیرائی عزت کی مگر انھیں یہاں رہ کر سیاسی امور میں حصہ گیر ہونے اور مسلمان قائدین سے تبادلۂ خیال کرنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ ایک ہی ماہ کے قیام کے بعد وہ ہندوستان سے آگے روانہ ہو گئے۔ حکومت ہند نے سرکاری جہاز میں انھیں سویز تک پہنچایا جہاں سے وہ قاہرہ پہنچے مگر صرف ۴۰ روز مقیم رہے۔ اس مختصر دوران قیام میں انھوں نے متعدد بار ازہر یونیورسٹی کا دورہ کیا۔ اور وہاں کے معلمین و متعلمین کو ہدایات و نصائح سے مستفیذ فرمایا۔

یہاں سے وہ بجائے مکہ شریف جانے کے قسطنطنیہ چلے گئے جہاں سلطان عبدالحمید، وزرائے سلطنت اور دیگر عمائد و اکابرین ان کا غیر معمولی جوش و مسرت کے ساتھ استقبال کیا۔ جیسا کہ ان کا معمول تھا انھوں نے فوراً نہایت انہماک اور تندہی سے اپنے مذہبی و سیاسی خیالات کی ترویج شروع کر دی اور بہت جلد اپنا رسوخ قائم کر لیا۔ ان کی اس قدر اچانک اور غیر معمولی ہر دلعزیزی نے شیخ الاسلام کو ان سے بدظن و متنفر کر دیا۔ ۱۸۷۰ء کے اختتام پر انھوں نے ناظم دارالفنون یعنی ڈائرکٹر ٹرکش یونیورسٹی کی دعوت پر اساتذہ و طلبا کے روبرو صنعت و تجارت کی اہمیت پر ایک لکچر دیا۔ حالانکہ یہ لکچر انھوں نے سلطنت کے بعض سربرآوردہ حکام کو دکھایا تھا۔ اور ان کی رضامندی کے بعد پڑھا تھا مگر شیخ الاسلام نے ان کے بعض جملوں پر سخت اعتراض کیا اور ان کو اسلام کی شان کے منافی بتایا۔ پبلک پریس نے شیخ الاسلام کا ساتھ دیا۔ حضرت جمالؒ نے دنداں شکن جوابات دیئے۔ اور ایسا شور و شر پھیلا کہ ترکی حکومت نے امن و امان کی مصلحتوں کے پیش نظر ان کو ملک چھوڑ دینے پر مجبور کیا۔ ترکی سے وہ واپس مصر گئے اور قاہرہ میں ۲۲ مارچ ۱۸۷۱ء کو پہنچے۔ مصر میں حضرت جمالؒ کا زیادہ عرصہ تک قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا، لیکن ریاض پاشا کی وساطت و مساعی سے جو ان دنوں وزیر اعظم تھے، حکومت مصر نے ان کا دس مصری پونڈ ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ اور انھیں مصر کو اپنا مستقر بنانا پڑا۔ یہاں طلبا کا

Marfat.com

ان کے دروازے پر ہجوم رہنے لگا، جو الٰہیات، فلسفہ، سیاست، قانون، ہیئت اور تصوف وغیرہ میں حضرت سیدؒ سے درس لیتے تھے۔ انھوں نے نوجوان اہل قلم کی ایک جماعت تیار کرنے کا ارادہ کیا جو ان کی تعلیمات و عقائد کو نزدیک و دور پھیلائے اور اس غرض سے انھوں نے ہونہار طلبا کو منتخب کیا اور انہیں اس فن کی تعلیم و تربیت دینی شروع کی۔ انھوں نے خود بھی مصر کے سیاسی معاملات میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔ انھوں نے ہر ممکن کوشش سے ملک مصر کو اجنبیوں کی مداخلت بیجا و تسلط کے خلاف ابھارا اور جو مضامین اس سلسلہ میں انھوں نے اخبارات میں شائع کرائے ان سے ان کے انگریزوں کے خلاف جذبات کا اظہار ہوتا تھا۔

آٹھ سال کی طویل مدت تک مصر اور اہالیان مصر کے مفاد کی خاطر ان کی یہ سرگرمیاں جاری رہیں۔ آخر کار ان کی مخالفت شروع ہوئی۔ پرانے خیال کے علما، ان کے فلسفیانہ و جدید خیالات کے باعث مخالفت پر اتر آئے اور حکومت مصر جو نکہ اس وقت یورپین طاقتوں خصوصاً انگریزوں کے پنجہ میں گرفتار تھی۔ ان کی سیاسی کارروائیوں سے خوف زدہ ہو گئی کیونکہ مصر کے برطانوی حکام حضرت سیدؒ کے وجود کو نہایت خطرناک سمجھتے تھے حضرت جمالؒ کے مصر میں دوران قیام کے اندر ملک کی مالی و اقتصادی حالت بد سے بدتر ہو گئی۔ خدیو اسمٰعیل پاشا کی فضول خرچیوں نے خزانہ خالی کر دیا۔ اور حکومت یکسر دیوالیہ ہو گئی تھی۔ بالآخر یورپین طاقتوں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر ملک مصر کے اندرونی معاملات میں بھی مداخلت شروع کر دی۔ نتیجتاً خدیو اسمٰعیل پاشا کو تخت و تاج سے دستبردار ہونا پڑا اور ۲۵ رجون ۱۸۷۹ء کو اس کا بیٹا توفیق پاشا تخت پر بیٹھا۔ توفیق حضرت سیدؒ کا پہلے بہت خیال کرتا تھا۔ اور اس نے حضرت جمال الدین کے ہوا خواہوں کو وعدہ دیا تھا کہ جب وہ پاشا ہو گا تو ملکی اصلاح کی ناطر ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھائے گا۔ لیکن خدیو پاشا ہوتے ہی اس نے ستمبر ۱۸۷۹ء میں حضرت جمال الدینؒ کو مع ان کے ایرانی شاگرد ابو تراب کے مصر سے باہر کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت جمال الدینؒ نے توفیق پاشا سے وعدہ لے لیا تھا کہ جب وہ خدیو ہو گا تو ملک کو دستوری طور پر چلائے گا۔ اور کاروبار سلطنت کے لئے انگلستان اور فرانس کی طرز پر پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لائے گا۔ مگر انھیں دونوں یورپین سلطنوں نے اس اصلاح کی سخت مخالفت کی اور مصری رعایا کو بدستور شخصی حکومت کی غلامی میں مبتلا رکھنا چاہا۔ کیونکہ اس طرح ان کا اقتدار غیر محدود وقت تک قائم رہنا ممکن تھا۔ ای جی براؤن نے اپنی تصنیف "انقلاب ایران" (Persian Revolution) کے صفحہ ۸ پر لکھا ہے کہ "جمالؒ کی سیاسی تحریکات سے گھبرا کر حکومت برطانیہ نے نوجوان خدیو پر دباؤ ڈالنا شروع کیا اور اس طرح جمالؒ کو مصر چھوڑنا پڑا۔"

مصر سے نکل کر حضرت جمالؒ پھر ہندوستان آئے اور حیدرآباد دکن میں اقامت گزیں ہوئے۔ یہاں رہ کر انھوں نے فارسی زبان میں ایک معرکۃ الآرا کتاب اسلام کی موافقت میں اور جدید خیال لوگوں کے حملوں کی مدافعت کیلئے، جو وہ اسلام پر کرتے تھے لکھی۔ یہ کتاب رد دہریہ (The Refulation of The materialish) کے نام سے شائع ہوئی۔ ایس جی ولسن نے اپنی تصنیف "جدید اسلامی تحریکات" کے صفحہ ۱۷ پر لکھا ہے کہ "حضرت جمال الدین افغانیؒ کی ایک تصنیف جو مسئلہ خلافت پر مبنی تھی حکومت ہند نے ضبط کر لی تھی۔"

۱۸۸۲ء میں "تحریک الشبان المصریہ Young Egyption movement" جس کی حضرت سیدؒ روح رواں رہے تھے "عربی بغاوت" کی شکل میں منتج ہوئی اور آخر کار برطانیہ عظمٰی کا قبضہ مصر پر ہو گیا۔ اس زمانہ میں حکومت ہند نے حضرت جمالؒ کو کلکتہ میں نظر بند رکھا۔ مگر جب مصر کی قومی تحریک کا زور ٹوٹ گیا تو انھیں ہندوستان چھوڑنے

Marfat.com

کی اجازت دیدی گئی۔ ہندوستان سے وہ لندن گئے جہاں وہ کچھ روز ٹھہرے اور پھر وہاں سے پیرس چلے گئے جہاں وہ تین سال تک مقیم رہے۔

پیرس میں رہ کر انھوں نے نہایت زور و شور سے اپنے سیاسی خیالات کا بین الاقوامی پروپگنڈا شروع کیا۔ یہاں کے قیام میں انھوں نے کسیقدر فرانسی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ ان کے سیاسی خیالات جن کی اشاعت فرانسیسی پریس میں ہوئی ان یورپین حکومتوں کی بدرجۂ غایت توجہ کا باعث ہوئے۔ جو اسلامی ممالک میں سیاسی دلچسپیاں رکھتی تھیں۔ ایسی یورپین حکومتوں میں برطانیہ عظمیٰ پیش پیش تھا۔ ۱۸۸۴ء میں حضرت سید جمال الدین افغانیؒ سے ان کی طلب پر انکے دوست اور سابق شاگرد محمد عبدہ بھی مصر سے یہاں آملے، جو عربی بغاوت میں ماخوذ ہونے کے الزام میں جلاوطن کردئے گئے تھے۔ پیرس میں دونوں استاد و شاگرد نے ملکر ایک ہفتہ وار عربی اخبار جاری کیا جس کا مقصد اسلامی دنیا کو مغربی طاقتوں کے ستمرانہ استبداد کے خلاف ابھارنا تھا۔ حضرت سید جمالؒ کے جو مضامین اس میں شائع ہوتے تھے ان کی زبان اور لہجہ انگریزوں کے سخت خلاف ہوتا تھا۔ اس اخبار کا پہلا نمبر ۵ جمادی الاولیٰ ۱۳۰۱ھ المطابق ۱۳ مارچ ۱۸۸۴ء کو شائع ہوا۔ اس کے صرف اٹھارہ نمبر شائع ہوئے۔ آخری نمبر ۱۶ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو شائع ہوا تھا۔ اس اخبار کا نام "العروۃ الوثقیٰ" فرانسیسی زبان میں Le Lien Indissoluble اور انگریزی میں The Indissoluble Bond تھا۔ برطانیہ عظمیٰ نے اس اخبار کا داخلہ ہندوستان اور مصر میں بند کردیا تھا۔ محمد رشید رضا "المنار" صفحہ ۵۵۴ میں کہتے ہیں کہ "اگر یہ صحیفہ جاری رہتا تو عام اسلامی بغاوت کا بہت امکان تھا۔ یہ جریدہ ایک خفیہ جماعت کا آرگن تھا جسکا نام بھی وہی تھا جو اس پرچہ کا تھا۔ حضرت سید جمالؒ نے اس سائٹی کی بناڈالی تھی۔ اس جماعت میں ہندوستان، مصر، شمالی افریقہ اور شام وغیرہ ممالک کے مسلمان شامل تھے اور اس کے اغراض میں مسلمانوں کو متحد کرنا، ان کو جمود و خواب غفلت سے بیدار کرنا اور ان کو یورپین اقوام کی غلامی و تسلط سے آزاد کرانا تھا۔" مگر اس انجمن کا فوری قصد مصر اور سوڈان کو برطانیہ کے قبضہ سے آزاد کرانا تھا۔ حضرت سید جمالؒ نے مکہ معظمہ میں بھی ایک "پان اسلامک سوسائٹی" "ام القریٰ" کے نام سے قائم کی تھی جس کا مقصد تمام اسلامی دنیا کے لئے ایک خلیفۃ المسلمین کا انتخاب تھا۔ مگر یہ سوسائٹی ایک سال کے اندر ہی نہ سلطان عبد الحمید کے حکم سے توڑدی گئی ("انقلاب ایران" صفحہ ۱۰، "جدید اسلامی تحریکات" صفحہ ۲۷) حالانکہ سید جمال افغانیؒ کا عربی اخبار جو انھوں نے محمد عبدہ کے ساتھ پیرس سے شائع کیا تھا، زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا مگر اس نے تمام اسلامی دنیا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تہلکہ ڈالدیا تھا۔ اور مائل بہ تنزل مسلمانان اقوام میں قومی جوش و افتخار کا احساس پیدا کردیا تھا۔ اس اخبار کے بند ہونے کے بعد حضرت سیدؒ لندن گئے جہاں وہ ایک قلیل مدت تک مقیم رہ کر برطانی مدبروں سے سوڈان میں خروج مہدی کے سلسلہ میں تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ یہ سلسلہ جنبانی ۱۸۸۵ء میں کی گئی تھی ("انقلاب ایران" صفحہ ۴۰۲، "مشاہیر" صفحہ ۵۵، "المنار" صفحہ ۵۵۴) برطانوی وزیر خارجہ نے حضرت سید جمال الدین افغانیؒ اور محمد عبدہ کے انتداب کے نتیجہ کے طور پر سوڈان کی تسخیر کے خیال کو ترک کردیا تھا۔ ڈبلیو ایس بلنٹ اپنی تصنیف "انقلاب ایران" کے صفحہ ۴۰۳ پر رقم طراز ہے کہ "جمالؒ اسلئے انگلستان آیا تھا کہ برطانیہ سے مہدی سوڈانی کی صلح کرادے۔ انگلستان میں گفت و شنید کے بعد یہ طے ہوا تھا کہ جمالؒ ایک خاص برطانی مشن کی شایعت میں قسطنطنیہ جائے اور وہاں سلطان عبد الحمید اور حکومت ترکی کو راضی کرکے انگلستان اور ترکی میں مصالحت کرادی جائے جس کی شرائط میں سے ایک شرط برطانیہ کی مصر سے دستبرداری بھی تھی۔ اور دوسری شرط یہ تھی کہ روس کے خلاف ترکی، ایران، اور افغانستان برطانیہ کے حلیف بن جائیں۔ مگر آخری لمحہ میں جبکہ برطانی مشن

Marfat.com

تیار تھا اور جمال نے ٹکٹ بھی خرید لیا تھا برطانوی مدبرین کی رائے پلٹ گئی۔ چنانچہ جمالؒ سخت شکستہ دل اور ناراض ہوکر ماسکو چلا گیا اور انگلستان کے خلاف ایک روسی ترکی معاہدہ کا انتظام کرنے لگا۔" غرضیکہ حضرت جمالؒ لندن سے ماسکو اور وہاں سے سینٹ پیٹرزبرگ گئے۔ ان دونوں مقامات (یعنی ماسکو اور سینٹ پیٹرزبرگ) پران کا خیر مقدم بڑے زور و شور سے کیا گیا۔ یہاں سے بھی حضرت جمالؒ نے اخبارات میں افغانستان، ایران، ترکی اور انگلستان کے متعلق جو سیاسی مضامین شائع کرائے ان کا دنیائے سیاست میں بڑا شہرہ ہوا۔ روس میں وہ چار سال سے زیادہ عرصہ تک مقیم رہے۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے اس درمیان میں وہ ایران بھی گئے۔

۱۸۸۹ء میں جبکہ حضرت سید جمالؒ شاہ ایران کی طرف سے ایک خفیہ مشن پر میونخ گئے ہوئے تھے۔ انھیں وہاں شاہ ناصرالدین والیٔ ایران ملے جو وہاں بغرض سیر و سیاحت آئے تھے۔ شاہ ایران نے انھیں ترغیب دی کہ وہ ایران کی وزارت عظمیٰ قبول کریں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ دوسرا موقع تھا جبکہ حضرت جمالؒ شاہ ایران کے وزیر ہوئے۔ ۱۸۸۶ء میں انھیں بذریعہ تار شاہ ایران نے بلایا اور وزیر جنگ بنا دیا تھا۔ ان کے تبحر علمی، بے پناہ قوت تقریر، اور اخوت اسلامی کے جذبے نے ان کو ایران کے ہر طبقہ میں بیحد عزیز بنا دیا تھا۔ ان کی اس روز افزوں ہر دلعزیزی سے شاہ خوف زدہ و بدگمان ہوگیا تھا جس پر حضرت جمالؒ نے ملک چھوڑ دینا قرین مصلحت سمجھا اور تبدیلیٔ آب و ہوا کے بہانہ سے روس چلے گئے تھے۔

جب حضرت جمالؒ شاہ کی درخواست پر ۱۸۸۹ء میں دوبارہ ایران آئے تو باشندگان ایران نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا کیونکہ اس مبارک ہستی کی دوبارہ آمد سے ان کی یہ توقعات تازہ ہوگئی تھیں کہ ایران کی سیاسی ابتری بہتر صورت اختیار کر سکے گی۔ حضرت سیدؒ وزیر اعظم ہو گئے اور کچھ عرصہ تک ان کے اور شاہ کے درمیان اچھے تعلقات رہے مگر شاہ کی بدطینی پھر عود کر آئی اور حضرت جمالؒ نے پھر ایران چھوڑنے کی اجازت مانگی مگر اس مرتبہ اجازت نہ ملی۔ اب ان کا جام صبر لبریز ہو چکا تھا۔ انھوں نے علی الاعلان شاہ کی مخالفت کا آواز بلند کیا اور ملک سے اپیل کی کہ اس کو معزول کر دیا جائے۔ ان کے متبعین اور ہمدرد لوگوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ ان کے انھیں ایرانی پیرووں میں تازہ ایرانیوں کی وہ جماعت بھی تھی جس نے آگے چلکر قومی انقلاب کی بنیاد ڈالی۔ پیروان جمالؒ میں سے ایک نے یکم مئی ۱۸۹۶ء کو شاہ ایران کو قتل کر دیا۔ قاتل کا نام مرزا رضا کرمانی تھا اور عدالت میں جرح کے وقت اس نے اقبال کر لیا تھا کہ اس قتل کے مشورے میں حضرت سیدؒ اس کے شریک تھے۔ (انقلاب ایران ص۶) حضرت جمالؒ جب لندن اور قسطنطنیہ میں مقیم تھے اس زمانے میں انھوں نے شاہ ایران کی اخبارات میں بیحد مخالفت کی تھی اور اپنی تقاریر میں بھی اس کے خلاف بولا کرتے تھے۔ جب شاہ ایران کو مار ڈالا گیا تو حکومت ایران نے حضرت جمالؒ اور ان کے ساتھیوں کو جن پر اس قتل کی مشورت کا شبہ کیا جاتا تھا حکومت ترکی سے مانگا مگر سلطان ترکی نے حضرت جمالؒ کو دینے سے انکار کر دیا۔ مگر دیگر تینوں اشخاص واپس ایران بھیجدیئے گئے جن کو تبریز میں خفیہ طور سے قتل کر دیا گیا (انقلاب ایران ص۹)

ہاں تو شاہ ایران نے آخر کار مسجد کا بھی احترام نہ کرتے ہوئے حضرت جمالؒ کو وہاں سے گرفتار کرا لیا۔ حالانکہ گرفتاری کے وقت حضرت سیدؒ علیل اور صاحب فراش تھے۔ گرفتاری کے بعد نہایت ذلت کے ساتھ شاہ کے حکم سے انھیں ترکی حد پر لیجا کر چھوڑ دیا گیا۔ یہ واقعہ ۱۸۹۰ء کے اواخر یا ۱۸۹۱ء کے اوائل کا ہے۔ ازاں بعد حضرت جمالؒ بصرہ میں اس وقت مقیم رہے جب تک ان کی تندرستی مکمل نہ ہوگئی۔ اور وہاں سے لندن پہنچے۔ لندن سے وہ ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے۔ اور اپنی وفات تک وہیں مقیم رہے۔ اگرچہ وہ ترکی میں نہایت عزت و احترام سے رہتے تھے اور سلطان عبدالحمید ان کی بہت وقعت کرتا تھا مگر فی الحقیقت وہ ایک نوع کی حراست میں تھے۔ ان کا انتقال ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو ہوا۔ ان کے جبڑے میں سرطان کا زخم ہو گیا تھا۔ جو گردن تک پھیل گیا تھا۔ آخر کار اس مہلک مرض نے

Marfat.com

اس عجیب و غریب انسان کی جان لیکر چھوڑی۔ حضرت جمالؒ کے ایرانی احباب کا بیان ہے کہ اگرچہ مرحوم کا مرض بظاہر سرطان تھا مگر درحقیقت ان کے کھانے میں ایک زہر آلود ہڈی شامل کر دی گئی تھی جس کے چبانے سے ان کے ہونٹ میں خفیف سی خراش پیدا ہوئی اور اس طرح وہ زہر ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ لیکن اس حکایت کی ترک مخالفت کرتے ہیں۔ ("انقلاب ایران" صفحہ ۱۲ اور صفحہ ۹۶) کتاب "القضاء والقدر" کے دیباچہ میں بھی حضرت سیدؒ کی طبعی موت میں شک کیا گیا ہے۔ مرحوم کو نہایت شان و شوکت سے قسطنطنیہ میں شیخین کے مشہور قبرستان میں دفن کیا گیا۔

اس حیرت انگیز انسان کی مذہبی و سیاسی تحریکات کی جولانگاہ عملی طور سے تمام اسلامی ممالک تھے۔ نیز وہ یورپین ممالک جن کی حکومتیں مسلمانوں سے کسی جہت سے تعلق رکھتی تھیں۔ افغانستان، ایران، ترکی، مصر اور ہندوستان سب کسی نہ کسی وقت۔ مرحوم کے قیام و تعلیمات سے مستفید و متاثر ہوئے تھے۔ "انقلاب ایران" جو تمباکو کے اجارے (۱۸۹۱ء) کے خلاف پرزور احتجاج کے ساتھ شروع ہوا اور جس کا اختتام ۵ اگست ۱۹۰۶ء کو دستوری حکومت کے قیام کے ساتھ ہوا تھا، ابتدائی ایام میں محض حضرت جمال افغانیؒ کی ترغیب و تحریک سے صورت پذیر ہوا تھا۔ حضرت جمال افغانیؒ نے اپنے ایک خط کے ذریعہ سے حاجی مرزا حسن شیرازی کو جو ایران کے مجتہد اعظم تھے ایرانی تمباکو کے غیر ملکی اجارے کی اطلاع دی تھی جس پر مجتہد موصوف نے اپنے فتوے کی اشاعت سے اس وقت تک ایران میں تمباکو کی کاشت کو ممنوع قرار دیا تھا جب تک کہ مذکورہ غیر ملکی اجارہ اٹھا نہ دیا جائے۔ باشندگان ایران نے اس فتوے کی متابعت کی اور تمباکو کا مکمل بائیکاٹ کیا حتی کہ حکومت کو مجبور ہو کر یہ اجارہ توڑ دینا پڑا۔ عوام اور علماء کے درمیان اس اتحاد کا نتیجہ اول تو شاہ ایران اور وزیر اعظم کے قتل کی شکل میں رونما ہوا اور پھر آخرکار دستوری حکومت قائم ہو کر رہی۔ یہ تھیں وہ سیاسی برکات جو مرحوم کے باعث محض ایک ملک ایران پر نازل ہوئیں۔

۱۹۰۸ء میں کامیاب "تحریک نوجوانان اتراک" مرحوم کی ہی ان تھک مساعی و پیہم احتجاج کے باعث قائم ہوئی تھی۔ ترکی کے علاوہ مصر میں "قومی تحریک" کی مرحوم اور ان کے لائق شاگرد محمد عبدہ ہی نے بنا ڈالی تھی۔ گو یہ تحریک آغاز کار میں "عرابی بغاوت" کے ناکام رہنے کے باعث دب گئی تھی مگر آخرکار کامراں ہو کر رہی۔ مچل (Michel) شیخ محمد عبدہ کی سوانح میں لکھتا ہے کہ "اس میں شمہ بھر مبالغہ نہیں کہ مسلمانوں کی قومی و ملکی آزادی کی وہ تمام سیاسی تحریکات، یورپین اقوام کے خلاف حقارت و نفرت کے جذبات، اور اسلامی ممالک کو اجنبیوں کے پنجے سے آزاد کرانے کی کشمکش، جو ہم آجکل مشرق قریب و بعید میں ہر جگہ موجود پاتے ہیں، کلیتاً جمال افغانیؒ کی عجیب و غریب شخصیت کے پروپگنڈے کی مرہون منت ہے"!

.... مرحوم کی غیر مختتم مساعی کا واحد مقصد عظیم یہ تھا کہ تمام دنیائے اسلام متحد و متفق ہو کر ایک اسلامی حکومت اور ایک خلیفۃ المسلمین کے ماتحت آ جائے تاکہ اسلام کا وہی زریں ابتدائی دور ایک مرتبہ پھر واپس آ جائے اور دنیائے اسلام مغربی استبداد اور استعمار سے آزاد ہو کر اقوام عالم کے دوش بدوش کھڑی ہو سکے۔ مرحوم اپنے مقصد کی تکمیل کیلئے کسی اسلامی مرکز کے متلاشی تھے۔ پہلے تو انھوں نے مصر کو اپنی امیدوں کا گہوارہ بنایا اور جب وہاں ناکامی ہوئی تو ہندی سوڈان پر نگاہ ڈالی۔ زاں بعد ایران کو آزمایا اور آخرکار ترکی کی طرف اپنی جد و جہد کو مرکوز کر دیا۔ مسلمان ممالک و اقوام کی موجودہ گری ہوئی حالت ان سے ایک آنکھ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ اسلام کے خیر القرون کی تجدید کے خواہاں تھے۔

مرحوم نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے سیاسی انقلاب کو آلۂ کار بنایا۔ وہ یقین کرتے تھے کہ اسی ذریعے سے وہ بہت جلد اسلامی دنیا کو آزادی دلا سکیں گے تاکہ وہ اپنے گھروں کی حفاظت کا کام خود اپنے ہاتھوں میں لے لیں۔ تعلیم اور تدریجی اصلاح (اقتصادی

Marfat.com

معاشی و معاشرتی) ان کے نظریہ میں طول عمل اور کامیابی مشکوک کی راہیں تھیں۔ کیونکہ وہ اپنی کوشش کو اپنی زندگی ہی میں بارآور ہوتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ بدیں وجہ انھوں نے اسلامی ممالک کی موجود الوقت طراق کو الٹ دینا چاہا۔ ان کے خیال سے ایسے حکمرانوں اور والیان ممالک کی، جو اپنے ضمیر کو یورپین اقوام کے ہاتھ فروخت کر چکے ہوں۔ تخت و تاج سے معزولی بلکہ قتل بھی ملک و ملت کی خاطر مباح تھا۔ پروفیسر براؤن کہتا ہے کہ "ایک مرتبہ دوران ملاقات میں حضرت جمال افغانیؒ نے مجھے کہا تھا کہ جبتک چھ یا سات معزز و باثر اسلامی شخصیتیں قتل نہ کردی جائیں اسلامی امور کی اصلاح و ترقی کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ انھوں نے اس سلسلہ میں شاہ ایران اور اس کے وزیر اعظم کا نام بھی لیا تھا۔ اور یہ دونوں بعد ازاں قتل کردیئے گئے ("انقلاب ایران" صفحہ ۴۵) ڈبلیو ایس بلنٹ اپنی تصنیف "مصر کی خفیہ تاریخ" کے صفحات ۹۵ اور ۱۰۱ میں رقم طراز ہے کہ "۱۸۷۹ء کے موسم بہار میں جمال افغانی" اور ان کے شرکائے کار کے درمیان یہ مشورہ ہوا تھا کہ کس طرح خدیو اسمٰعیل کو معزول یا قتل کیا جائے"۔ کرومر اپنی تصنیف "مصر جدید" کے صفحہ ۱۸۱ پر لکھتا ہے کہ "محمد عبدہ کے بیان کے مطابق خدیو اسمٰعیل کے قتل کی تجویز کثرت رائے سے منظور بھی ہو گئی تھی، مگر وہ اسوقت اسوجہ عمل میں نہ لائی جاسکی کہ کوئی موزوں قاتل موجود نہ تھا"۔ لیکن ان انتہا پسندانہ کارروائیوں کے ساتھ وقت اور محل کی نزاکتوں اور ضرورت کی شدت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اور حضرت جمال افغانیؒ کو ان امور کے باعث جو مجبوریوں کے تحت پذیر تھے ایک خونخوار قاتل اور انارکسٹ نہیں سمجھ لینا چاہیے۔ برخلاف اس کے وہ اپنی تمام زندگی اسلامی مفاد کی خاطر موت سے کھیلتے رہے۔ ہمیشہ خطرات کو دعوت دیتے رہے اور انھوں نے بے غرضی اور ذاتی قربانی کی وہ عدیم المثال نظیر پیش کی کہ ہمارے موجودہ خود غرض قومی رہنماؤں اور علمائے سو کو، اگر ان کے اندر حمیت و غیرت کا شائبہ بھی باقی ہو۔ تو ان کے سوانح پر غور اور انکی تقلید کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔

حضرت جمالؒ تمام اسلامی علوم عقلیہ و نقلیہ، دینی و دنیوی میں فاضل ہونے کے علاوہ متعدد زبانوں کے ماہر اور بے مثل مقرر و انشاپرداز تھے۔ فلسفہ پر انھیں کامل عبور تھا اور اسلام کو ایک غیر عقلی مذہب نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ جدید سائنس کی روزافزوں ترقی سے بخوبی واقف تھے۔ اور اسلام کو انھیں جدید فلسفیانہ اور سائنٹفک خیالات کی روشنی میں ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ مرحوم مذہبی رواداری کا ایک قابل تقلید نمونہ تھے۔ وہ ہمیشہ اسلام کے دو بڑے مذہبی فرقوں سنی اور شیعہ کے درمیان مصالحت کے کوشاں رہے۔ اور ان کے شاگردوں اور متبعین میں متعدد شیعہ نوجوان اور دیگر غیر سنی حضرات شامل تھے، جو مرحوم کو اپنا مذہبی و سیاسی قائد باور کرتے تھے اور ان پر اپنی جان تک نثار کرتے تھے۔ مرحوم کی اسی مذہبی رواداری اور روشن خیالی کے باعث اسلامی ممالک خصوصاً مصر کے علمائے سو انکے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ البتہ اس مخالفت و عناد میں مرحوم کے تبحر علمی، فضیلت و ہر دلعزیزی کے باعث بغض و حسد کا بھی حصہ تھا۔ اس وجہ سے مصر اور ترکی میں مرحوم کا گرویدہ وہ حصۂ قوم ہوا جو آفندی کہلاتا تھا اور مغرب زدہ شمار ہوتا تھا۔ اور یہی سبب تھا کہ باوجودیکہ مرحوم نے تعلیمی و مذہبی اصلاح کی بڑی کوشش کی مگر اس نہج پر ان کے معتقدین کی تعداد ہمیشہ کم ہی رہی۔ چنانچہ یہ بات نہایت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب مرحوم نے اپنا انتہا پسندانہ سیاسی پروگرام پیش کیا تو نوجوان محبان وطن جوق جوق سرفروشی کیلئے حاضر ہو گئے۔ کیونکہ نوجوانوں کی نظر میں سیاسی انقلاب ملک کی فوری قومی آزادی کا ذریعہ ہونے کے علاوہ اظہار جواں مردی و زور آزمائی کا بھی آلہ ہوتا ہے جس کا یہ طبقہ ہمیشہ بھوکا رہا کرتا ہے۔ دوسری طرف زیادہ سنجیدہ اور بنیادی اصلاح جو فطرۃً تدریجی اور دیر طلب ہوتی ہے۔ نوجوانوں کی نظر میں کوئی کشش نہیں رکھتی۔ محمد عبدہ نے اپنے استاد کی جو سوانح عمری شائع کی ہے اس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ مرحوم تعمیری و بنیادی اصلاحات کے کس قدر خواہاں تھے۔

مرحوم کے دو نہایت مشہور و معروف سوانح نگاروں نے، جن میں سے ایک مغربی فاضل ہے اور دوسرا مشرقی،

Marfat.com

مرحوم کے کیرکٹر اور شخصیت کی ان الفاظ میں وضاحت کی ہے:۔

(۱) پروفیسر ای جی براؤن اپنی مشہور عالم تصنیف "انقلاب ایران" کے صفحات ۲ و ۳ پر لکھتا ہے کہ "جمال ایک بیداغ کیرکٹر اور جاں بلب کا مالک تھا۔ وہ ایک نہایت جید عالم فاضل، کبھی نہ تھکنے اور شکست قبول کرنیوالا لیڈر، جری اور بہادر، بے مثل مقرر، اور بے نظیر ادیب تھا۔ وہ ایک حیرت انگیز مقناطیسی شخصیت رکھتا تھا۔ اس کی رفتار و گفتار اور انداز شاہانہ تھے۔ وہ بیک وقت فلسفی، انشاپرداز، مقرر اور صحافی اور سب سے زیادہ یہ کہ سیاست دان تھا۔ اس کے مداح اسکو ایک عظیم الشان قوم پرست کہتے تھے اور اس کے دشمن اس کو ایک نہایت خطرناک ہستی سمجھتے تھے۔"

(۲) حضرت سید جمال الدینؒ کا شامی سوانح نگار جرجی زیدان اپنی تصنیف "مشاہیر" دوئم کے صفحہ ۶۱ پر اس طرح گویا ہوتا ہے کہ "جمال کا اصلی مقصد اتحاد اسلامی تھا۔ اور اس مقصد کے حصول کیلئے اس نے اپنی تمام طاقت صرف کر دی تھی اور تارک الدنیا ہو گیا تھا۔ کیونکہ نہ تو اس نے تمام عمر شادی کی اور نہ حلب منفعت کی کبھی فکر کی۔ حالانکہ اس عظیم الشان شخص نے اپنی تصانیف زیادہ تعداد میں نہیں چھوڑیں لیکن وہ اپنے احباب، ہم نشینوں اور شاگردوں کے دلوں میں ایک ایسی زندہ آرزو پیدا کر گیا جو اسوقت تک مردہ نہیں ہو سکتی جب تک کہ مرنے والے کا مقصد بحسن احسن پورا نہ ہو جائے۔"

جنوری ۱۹۳۱ء

تعلیق:۔ حضرت السید جمال الدین الافغانی کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کیلئے حسب ذیل کتب کا مطالعہ ضروری ہے:۔
(۱) انقلاب ایران۔ از ای جی براؤن ۱۹۱۰ء باب اول۔ (۲) اسلامی قاموس العلوم۔ از گولڈ زیہر۔ (۳) تاریخ الصحافۃ العربیہ۔ از وکاؤنٹ فلپ ۱۹۱۳ء
(۴) مشاہیر الشرق۔ از جرجی زیدان، جلد دوم۔ (۵) العروۃ الوثقیٰ۔ از مصطفےٰ عبدالرزاق، قاہرہ ۱۳۴۲ھ۔ (۶) المنار۔ جلد اول تا ...
(۷) القضاء والقدر۔ از جمال الدین افغانی۔ قاہرہ

Marfat.com

البانیا

یورپ کی ایک ننھی سی مسلمان حکومت

جناب پروفیسر محمد مسلم صاحب ایم اے اسسٹنٹ کولمباس کالج ہزاری باغ

ابھی حریت البانیہ کی سلور جوبلی یعنی چوتھائی صدی کا جشن سالگرہ منایا گیا ہے۔ یورپ کی اس ننھی سی مسلم ریاست کی تاریخ کئی اسباب سے نہایت ہی دلچسپ اور قابل توجہ ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ قوم یورپ کی قدیم ترین اقوام سے ہے۔ ہندوستان کی طرح آئے دن بیرونی فاتحوں کی ہوس کا شکار بننے کے باوجود اس مٹھی بھر جفاکش جنگجو قوم کی قسمت جاتی بہت کچھ ہندوستان سے مشابہ ہے۔ اس میں وہ "کچھ بات" موجود ہے جس کی طرف اقبال نے "ہندی ترانہ" میں اشارہ کیا ہے:-

یونان و مصر و روما سب مٹ گئے جہاں سے — باقی مگر ہے اب تک نام و نشاں ہمارا
"کچھ بات" ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — دشمن رہا ہے صدیوں دور زماں ہمارا

دوسرے یہ کہ مغربی قوم ہونے کے باوجود مغربی تہذیب و تمدن کی بہت کم خوگر ہوئی۔ اور شاید کشمکش زندگی میں اس کی نسلی عصبیت اور فطری حریت پرستی میں جسے وحشت اور بربریت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی بقا کا راز مضمر ہے۔ تیسرے یہ کہ ترکوں کے علاوہ یہ دوسری مسلمان قوم ہے جو یورپ کی مخالف فضا میں اپنی حریت کے ساتھ زندہ ہے۔ چوتھے یہ کہ اس ضعیف و ناتواں ریاست کی بقا کا اصلی راز اس کے دشمنوں کی باہمی رقابت میں مضمر رہا ہے۔ ورنہ کب کے اس کے حصے بخرے ہو چکے تھے۔ پانچویں یہ کہ اس کے مرض کا علاج نہ قیصریت سے ہو سکا، نہ جمہوریت سے، نہ پنچایتی طرز حکومت سے، نہ کسی دوسرے متوسط دستور سے بلکہ صرف آمریت جبری (ڈکٹیٹرشپ) سے، جس نے روس، جرمنی، اٹلی، پولینڈ، ترکی اور ایران کے ناتواں اجسام میں زندگی کی تازہ روح پھونک دی ہے۔

جغرافیہ البانیہ جزیرہ نمائے بلقان کے مغربی ساحل پر بحیرہ ادریاتک کے مشرقی بازو میں ایک بلند پہاڑی خطہ ہے جو پہاڑوں، جنگلوں، جھیلوں اور ندیوں سے بھرا ہوا ہے۔ جنگلات اور نشیب و فراز کے سبب سے راہیں اس قدر پیچیدہ دشوار

Marfat.com

گذار اور خطرناک ہیں کہ اب تک ملک کا پورا جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے قیاس کیا جاتا ہے کہ اسکی زمین معدنی دولت کی خزانہ دار ہے۔ اب تک جو پیداوار اس سے برآمد کی جاتی ہے وہ انگوری شراب اور روغن زیتون ہے۔ باشندوں کا ذریعہ معاش زیادہ تر گلہ بانی ہے رقبہ تقریباً دس ہزار آٹھ سو مربع میل اور آبادی کم و بیش سولہ لاکھ ہے۔ اہل البانیہ جزیرہ نمائے بلقان کی قدیم ترین قوموں میں سے ہیں۔ جذبہ آزادی اور اپنی قدیم رسوم و روایات کا استحکام و استقامت ان کی ممتاز خصوصیتیں رہی ہیں۔ جمہور البانیہ مسلمان ہے صرف دو خمس ⅖ عیسائی ہیں جو یونانی و رومی کلیساؤں میں منقسم ہیں

تاریخ قرون ماضیہ میں رومی، اگاتھ، جسٹینین، سربی، بازنطینی، نارمن فتوحات کے آثار البانیہ میں موجود ہیں۔ ان فاتحین میں سے صرف سربی ہمسائگی کے باعث زیادہ مدت تک قابض رہے۔ بارھویں سے چودھویں صدی عیسوی تک یک لخت حکمراں رہے۔ ۱۳۶۰ء میں آخری سربی حکمران کی وفات کے بعد سے یہ خود اپنے ملکی سرداروں کے زیر حکومت رہا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پندرھویں صدی عیسوی میں ترکوں کے ہاتھ آگیا۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے آغاز میں بعض مسلمان سرداروں نے البانیہ میں آزاد خود مختار حکومت قائم کرنے کی کوشش کی مگر ۱۸۲۲ء میں علی پاشا کی شکست سے ان مساعی کا خاتمہ ہو گیا۔

علی پاشا علی پاشا ملقب بہ الاسلام ۱۷۴۱ء میں البانیہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ جوانی ہی میں مقتول ہوا۔ اس نے بیٹے کے دل میں باپ کے خون کے جوش انتقام کی پرورش کی جو بعد کو حد سے زیادہ ہیبتناک پھیل لایا۔ اپنی سربلندی کا رستہ صاف کرنے کیلئے پہلے اپنے بھائی پر ہاتھ صاف کیا، پھر اقدام زہر خورانی کے الزام پر ماں کو قتل کر دیا۔ ۱۸۰۳ء میں وہ قزاقی کے سد باب کے لیے متعین کیا گیا جو اس زمانہ میں ایک عام وبا بنی ہوئی تھی۔ مگر شجاعت و جلاوت سے مقابلہ کرنے کے عوض رشوت دہی سے کام لیتا رہا بلکہ خود بھی قزاقانہ ترکتازیں شریک ہونے لگا۔ آسٹروی روسی جنگ میں اس نے ترکوں کی مدد کی۔ مگر اس کی مسلسل غداریوں کی سزا میں سلطان محمود نے اسے قتل کرا دیا۔ اس کے نظم حکومت کا مدار ہیبت و تخویف پر تھا۔ ملک کو اس نے ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ سے تو پاک کر دیا مگر خود اس کا ناپاک وجود کسی جرائم پیشہ سے کم نہ تھا۔ ان عیوب کے ساتھ وہ مذہبی رواداری کی صفت سے متصف تھا۔ اس نے یونانیوں اور دوسرے عیسائیوں کو کامل مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ اور ان کو مدرسے کالج کتب خانے کھولنے کی اجازت دیدی تھی۔ اور تمام قوموں کے ساتھ یکساں سلوک کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اندرونی بد انتظامی کے باوجود دول عیسائی اس سے ناراض نہ تھیں۔ بلکہ ترکوں سے علی پاشا کی مخاصمت ان کے باہمی ایک مشترک ربط اتحاد تھی۔

اسعد پاشا حریت البانیہ کی جدید تاریخ کے اصل بانی مبانی اسعد پاشا تھے۔ یہ ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے البانیہ کے ایک مقتدر با ثروت خاندان ڈ… کے سرداروں میں تھے۔ ان کے بھائی غنی سلطان عبدالحمید کے معتمد مشیر اور کارپرداز تھے۔ آخری حمیدی دربار کی منحوس سازشوں یا سلطان کی حکمت عملیوں کا شکار ہو گئے اور قتل کر دئے گئے۔ اس واقعہ نے اسعد کو حمیدی حکومت کا جانی دشمن بنا دیا۔ چنانچہ وہ جوان ترکوں کے انقلاب ۱۹۰۸ء میں شریک ہو گئے اور ۱۹۱۲ء تک ترکی پارلیمنٹ میں البانیہ کے ساحلی علاقہ دورازو کے نمائندہ رہے۔ مگر وہ انجمن اتحاد و ترقی کے کامل مخلص حامی نہ تھے۔ اس کی رکنیت کے ساتھ ساتھ وہ برطانوی حکمبرداری یا سرپرستی کی گفت و شنید میں مصروف رہے۔

جنگ بلقان کے خاتمہ پر ۱۹۱۳ء کے عہد نامہ لندن نے البانیہ کی خود مختاری کا فیصلہ کیا۔ مگر کیسی خود مختاری؟ طے پایا کہ دول یورپ البانیہ کے لیے ایک بادشاہ منتخب کریں گی۔ چنانچہ پرنس ولیم آف ویڈ کو اس کے سر تھوپا گیا۔

ولیم آف ویڈ یہ شاہزادہ نو ویڈ نیدرلینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ تخت البانیہ پر اس کا انتخاب اس کے مواقع نہ تھا کہ … … ترقی اور آسٹریا کی وفاداری اور جان نثاری کا ثبوت دیا تھا۔ اس کا پردادا ڈچ جمہوریہ کا نیدرلینڈ کا تاجدار تھا۔ فرانس سے جنگ کی اور ہالینڈ کی شکست پر پرشیا اور آسٹریا کی فوجوں میں ۱۸۱۲ء

Marfat.com

برنامو سے نبی نشدہ عظمت و اقتدار کی باریابی کے موقع کی تاک میں لگا رہا۔ آخر جب مجسم زید رلنگ کے ساتھ مدغم ہوا تو ۱۹۱۴ء میں وہ اس نئی سلطنت کا تاجدار اعلان کیا گیا۔ مگر ۱۹۲۳ء میں مجسم نے اس کی بادشاہی کا جوا کاندھے سے اتار پھینکا۔ اس قسم کا عروج و زوال اس بدنصیب خاندان شاہی کی نمایاں قسمت رہا ہے۔ اس کی اولاد ایک قسم کے آغا خاں کی طرح رہی۔ بے تاج مگر ایک شاہانہ وقار کی مالک کسی تخت کی آرزومند، موقع کی جویاں، مگر صلاحیتوں کے باوجود ناکام آرزو۔

شاہزادہ ولیم وئیڈ کا تعلق بلقان سے اتنا اور بھی تھا کہ اس کی پھوپھی یا خالہ رومانیہ کی ملکہ تھی اور اس کی شادی بھی رومانی خاندان شاہی میں ہوئی تھی۔ اس نے تخت البانیہ کی غیر مرتبہ نذر قبول کرتے ہی اپنی تختگاہ کی طرف رخ کرنے کے عوض یورپ کی مختلف تختگاہوں کا اس قصد سے دورہ کیا کہ اس نئی سلطنت کے چلانے اور ملک میں اصلاحات و ترقیات نافذ کرنے کے جانب سے تیس لاکھ پونڈ قرضہ حاصل کرنے کا سامان کرے۔ اس کے البانیہ پہنچتے ہی شمالی ایپرس کی شورپشت قوم کی بغاوت شروع ہو گئی۔

اسد پاشا وزیر داخلہ و حربیہ تھے۔ انہوں نے اندرونی باغیوں اور بیرونی حملہ آوروں (مونٹنگرو اور سرویا) کے مقابلہ میں دلیری سے وطن کی مدافعت کی۔ مگر ان کی بعض سیاسی حکمت عملیات دلوں میں بے اطمینانی پیدا ہوئی اور وہ برطرف اور جلاوطن کر دیئے گئے۔ گو چند مہینوں کے اندر جنگ عظیم چھڑ گئی اور یہ جرمن کٹ پتلا تاجدار البانیہ ولیم وئیڈ سے تاج شاہی پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد کچھ دن کے لیے سلطان عبدالحمید کے بیٹے شہزادہ برہان الدین البانیہ کی مسند شاہی پر متمکن ہوئے مگر ان کے قدم بھی اس سرزمین پر جم نہ سکے۔ اسد پاشا دوبارہ وطن میں واپس بلائے گئے اور البانیہ کی عارضی حکومت کے صدر بنائے گئے۔ انہوں نے جبر و قہرمانی سے انتخاب مجلس (سینٹ) پر قابو رکھا۔ جب اٹلی نے آسٹریا کے علی الرغم البانوی ساحل پر فوجی مہم بھیجی تو البانیہ سے اسد پاشا کو پھر نکل بھاگنا پڑا۔ وہ سلونیکا میں پناہ گزیں ہوئے اور بعد کو پیرس میں البانوی وفد کی نمائندگی کی۔ جنگ عظیم کے اختتام پر درآنہ سے اطالوی فوج کو مار نکالا۔ ۱۹۲۰ء میں ایک البانوی عولی رستم نے ان کو پیرس کی ایک سڑک پر شہید کر دیا۔

دوران جنگ عظیم ۱۹۱۵ء میں دول اتحادی (انگلستان و فرانس) نے اٹلی کی اعانت جنگ کے معاوضہ میں البانیہ اس کے حوالہ کر دینے کا وعدہ کیا۔ دوسری طرف اس سمجھوتے سے بے خبر دولت آسٹریا ہنگری نے اٹلی کی غیر جانبداری حاصل کرنے کی کوشش میں ولونا پر اٹلی کی حکمرانی و ماسوا نیز پر اس کے کامل اقتدار کی رشوت پیش کی۔ اس طرح البانیہ ممدوحہ کا لاوارث بکرا تھا جس نے جیسے چاہا اس پر اپنا حق جواز کر دیا۔

اسی سال آسٹریا مونٹی نیگرو کے صدر مقام کی تسخیر کے بعد جنوب کی طرف البانیہ میں جا نکلا۔ سقوطری پر قابض ہو گیا اور تیرانا کی بلندیوں تک جا پہنچا۔ اسی اثنا میں بلغاری فوجوں نے بھی سرحد عبور کر کے البسان پر قبضہ کر لیا۔ اس دوطرفی حملے نے اسد پاشا کو سراسیمہ کر دیا۔ آخر اٹلی نے درازو کو تو خالی کر دیا مگر ولونا پر قابض رہا اور جنوبی البانیہ پر اثر انداز۔

جنگ عظیم کی عارضی صلح کے بعد ایک سمجھوتے میں طے پایا کہ جنوبی البانیہ یونان کے حوالہ کر دیا جائے۔ اٹلی بھی اس پر رضامند ہو گیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ یونان البانیہ کے بیشتر حصہ پر اٹلی کا اقتدار و سیادت تسلیم کرے اور شمال سے ایک پتلی سی دھجی سرویا کو دے دی جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں سین ریمو کی کانفرنس میں البانیہ پر اٹلی کی حکمرانی طے پا گئی۔ بعض البانیہ کے حصے بخرے طرح طرح سے قرار پا چکے تھے مگر مجلس مصالحت میں پریسیڈنٹ ولسن اس تقسیم و تسلیم کے خلاف اڑ گئے۔ اٹلی کو یقین تھا کہ جنگ میں البانیہ اپنے سب مقبوضہ حصے نہیں تو کم سے کم ولونا وہ ضرور حاصل کرے گا۔ اس لیے کہ وہ بحیرہ ادریاتیک کی کنجی ہے اور اس کی بدولت وہ بلا شرکت غیرے اس بحیرہ کا مالک ہو جائیگا۔ صلح کی گفت و شنید نے طول پکڑا اور کچھ عرصہ تک کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

اس اثنا میں اہل البانیہ نے گوریلا طرز اختیار کر کے حملہ آور ہوئے اور نکل بھاگنے کی جنگ شروع کر دی اور اس طرح اٹلی کی فوج کو اندرون ملک سے نکال کر جزیرہ ولونا میں ڈھکیل دیا۔ بلکہ ۱۹۲۰ء کی گرمیوں میں ان کو محصور کر لیا اور چھکے چھڑا دئے۔ اٹلی کو ابھی

Marfat.com

اندرونی بدنظمیوں کے باعث آئندہ جنگ جاری رکھنے کی تاب نہ رہی۔ آخر البانیہ سے ایک عہدنامہ کرکے اس کی آزادی تسلیم کرلی اور اطالوی فوجوں کو جزیرہ ساسینو کے سوا تمام البانوی علاقوں سے واپس بلالیا۔ اسے امید تھی کہ شاید اسی جزیرہ کے سہارے سے وہ کبھی بندرگاہ ولونا پر چھا جائے اور بحیرہ ادریاٹک پر پورا قبضہ حاصل کرے۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں البانیہ مجلس اقوام کا رکن بن گیا جس نے اس کی آزادی تسلیم کرلی اس طرح اسے ہضم کر جانے کی آرزو جو یونان اور یوگوسلافیہ کو بے چین کئے تھی پوری نہ ہو سکی۔ پھر بھی اگلے سال جب کہ سرحدوں کا جھگڑا چکا نہ تھا اور زیر تجویز تھا۔ یوگوسلافیہ کے فوجی دستوں نے بار بار البانیہ پر اچانک حملے کئے اور اندرون ملک میں خانہ جنگی اور بے امنی کی آگ بھڑکانے کے لئے خفیہ طور پر ہتھیار اور سامان جنگ مہیا کر دئے۔ البانوی فوج نے ان سب فتنوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ آخر یوگوسلافیہ نے بارہ ہزار باقاعدہ اور آراستہ فوج سے چڑھائی کر دی۔ اٹلی البانیہ کا حلیف بن چکا تھا اس کے علاوہ بحیرہ ادریاٹک کی خاطر یوگوسلافیہ کے ساتھ شدید رقابت کے باعث البانیہ کی حمایت پر مجبور تھا۔ یوگوسلافیہ کی اس فوج کشی سے ایک نئی جنگ یورپ کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ آخر مجلس اقوام کو مداخلت کرنا پڑی اس نے سرحدوں کا فیصلہ کر دیا اور جنگ کا خاتمہ۔

احمد زوغو[۱]

دستور حکومت آغاز ۱۹۲۰ء میں شاہی کے عوض نائبین حکومت کی ایک عارضی مجلس قائم کی گئی۔ جس میں اصل اختیارات وزراء کے ہاتھ میں رہے۔ اسی سال کے آخر میں اسد پاشا شہید ہو گئے۔ بعد کو ۱۹۲۵ء میں ایک جمہوریہ کا اعلان کر دیا گیا جس میں سو منتخب ارکان کی ایک پارلیمنٹ اور ۱۰۰ ارکان کی ایک سینیٹ قائم کی گئی۔ ایک بہادر سردار احمد زوغو اس جمہوریہ کا صدر قرار پایا۔

احمد زوغو ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ صرف سترہ سال کے کمسن نوجوان تھے کہ شریک جنگ ہونے لگے ۱۹۱۳ء میں انہوں نے اپنی چالیس ہزار پہاڑی جوانوں کی فوج لیکر ترکی البانیہ کے خلاف جنگ کی اور داد شجاعت دی۔ ایک سال بعد یہ نوجوان جنگ عالمگیر میں اٹلی کے مقابلہ میں ڈٹ گیا۔ انیس سال کی عمر میں ان کی شخصیت اتنی نمایاں ہو چکی تھی کہ آسٹریا نے ان کو ویانا میں داخل ہونے کی دعوت دی۔ اور وہ اس کے ساتھ آخر تک شریک جنگ رہے۔ ۱۹۲۲ء میں وہ اپنے ملک کے وزیر داخلہ اور ۱۹۲۲ء میں وزیر اعظم ہو گئے۔ ۱۹۲۵ء میں ایک مجلس ملی کی بنا پڑی اور جمہوریہ کا اعلان کیا گیا تو اول اول یہ سات سال کی مقررہ میعاد کے لیے صدر منتخب ہوئے۔ مگر رفتہ رفتہ تمام اختیارات دستوری پر قابض ہو گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۲۸ء میں اپنی طاقت اور صلاحیتوں کے ہاتھ سے البانیہ کا تاج سلطنت سر پر رکھ لیا۔ جنگ عظیم کے بعد جتنی جمہوری ریاستیں قائم ہوئیں ان میں یہ پہلے صدر ہیں جنہوں نے آمریت سے گذر کر سلطنت حاصل کرلی۔

شاہ زوغو کو ایک جدید متمدن ریاست کی تعمیر کرنا تھی۔ قانون، پولیس، شاہراہیں، پل، ریلوے، زبان کی صرف و نحو، لغات، محکمہ تعلیم کی بنا اور قیام و ترقی کی ضرورت تھی۔ پھر ملک کے فوجی استحکام کی حاجت تھی۔ ان ضرورتوں کے لیے ان کو اٹلی سے رشتۂ دوستی مضبوط کرنا پڑا۔ اٹلی نے بحیرہ ادریاٹک کی کنجی آبنائے اوترانتو کے استحفاظ و تصرف اور البانیہ سے اقتصادی استفادہ کے شوق میں البانیہ کی سیاسی، علاقائی، اور مقبوضاتی حقوق سابقہ کی تجدید و توثیق کر دی۔ البانیہ نے اقرار کیا کہ وہ دوسری دول سے کوئی ایسا ملکی یا فوجی معاہدہ نہ کرے گا جو اٹلی کے مفاد کے خلاف ہو۔

اس اثنا میں یوگوسلافیہ نے ایک سرحدی قصبہ کا بہانہ چھیڑ کر البانیہ سے ڈپلو ماتی تعلقات منقطع کر لیے۔ اختتام جنگ عظیم سے قبل یہ شمالی البانیہ کے ایک حصہ کی تاک میں تھا، ادھر اٹلی نے مشہور کر دیا کہ یوگوسلافیہ اس چھوٹی سی کمزور جمہوریہ پر حملہ کرنے والا ہے۔ یوگوسلافیہ نے اس الزام سے انکار کرکے اٹلی پر الزام لگایا کہ وہ ترانا کا (مذکورہ بالا) معاہدہ کرکے حکومت البانیہ کی اعانت کے بہانے سے البانوی سرزمین پر اپنی فوج اتارنے والا ہے۔ بغرض عہدنامہ ترانا اور البانیہ کے ساتھ اٹلی کی دوستی و اعانت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یوگوسلافیہ

۱۔ احمد زوغو

Marfat.com

موجودہ ریاست البانیہ

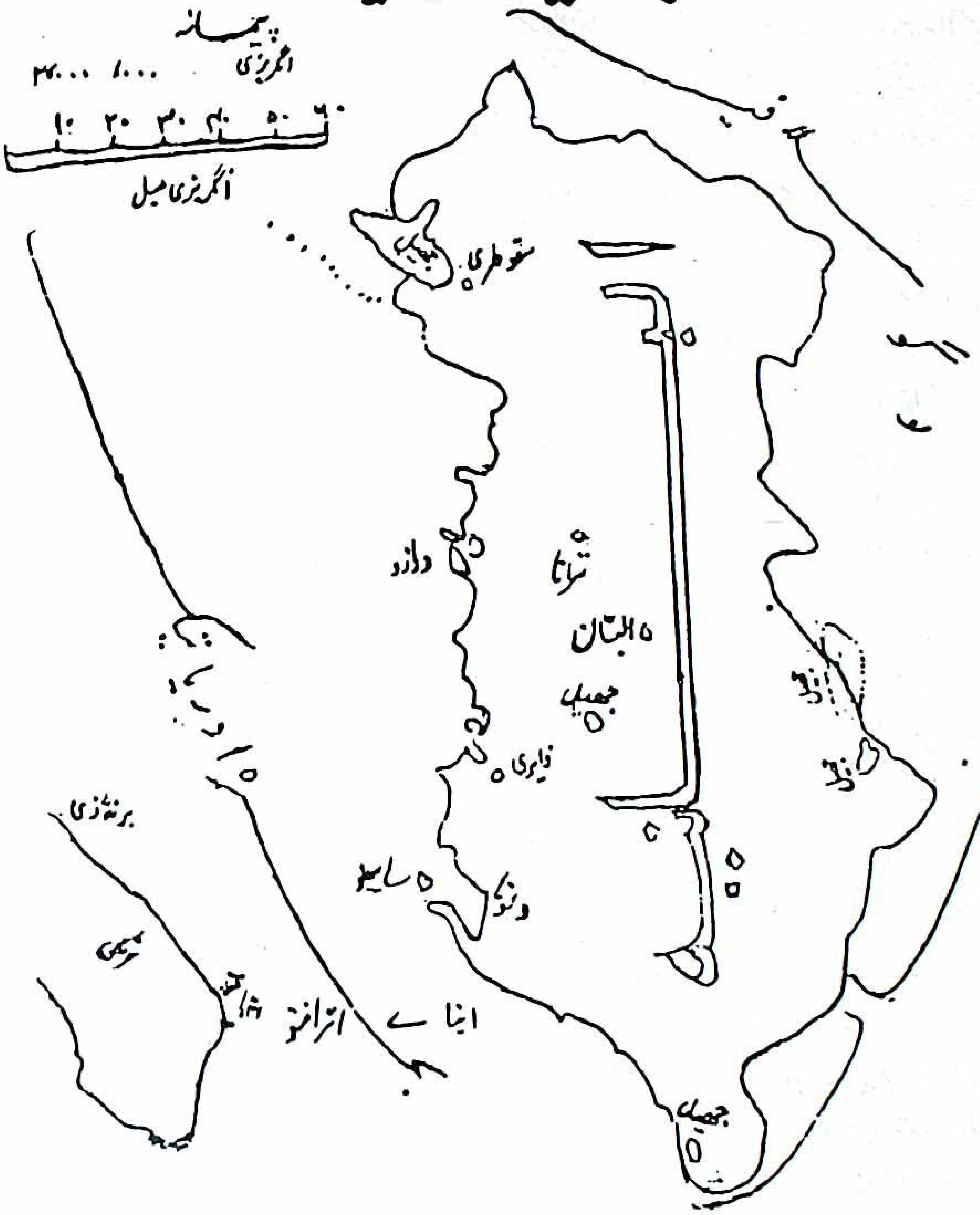

Marfat.com

کے سیاسی توقعات ایک طرف البانیہ سے کشیدہ ہو گئے، دوسری طرف اٹلی سے

بہر حال ۱۹۲۰ء میں اٹلی کے قرض سے اسی کے زیر نگرانی اندرونی اصلاحات نافذ ہوئیں اور اطالوی افسروں کے ماتحت البانوی فوج جدید طرز پر منظم کی گئی۔

یہ نہیں ہے کہ یہ جوان سال بادشاہ محض بخت و اتفاق کی بدولت کے ذریعہ سے بام رفعت پر جا چمکا۔ اس کو بے شمار پیچدار و پر خطر پیچیدہ اور دشوار گذار مرحلے طے کرنا پڑے ہیں۔ کتنی بار اسے جزیرہ دلونات اطالویوں کو اور شمالی سرحد سے یوگوسلافیوں کو ابھر کر نکالنا پڑا ہے۔ ۱۹۲۲ء میں ایک خانہ جنگی فرو کرنا پڑی ہے جب کہ اس نے پہاڑی باغیوں کا مقابلہ کر کے ترانا کو ان کے زغہ سے نکالا ہے۔ اسی سال ایسی کھڑ بھی آئی ہے کہ خود ذوق خود مجروح ہو گئے۔ ایک اور حریف اقتدار بشپ فین نولی نے ان کو البانیہ سے نکال دیا ہے۔ مگر صرف تین ماہ کی جلاوطنی کے بعد وہ پھر وطن واپس آتے ہیں اور بشپ کو فوجی طاقت سے نکال باہر کرتے ہیں۔ اس قلیل عمر میں بیرونی حملوں کے علاوہ کتنی خانگی ہوش ربا گتھیوں میں الجھنا پڑا ہے، جن سے آج تک نجات نہیں۔ ان پریشانیوں کا اندازہ صرف اس حالت سے ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس کے سر پر ہمیشہ قبیلہ وار خانہ جنگیوں کا انتقامی خون سوار رہتا ہے۔ یہ سلسلہ پندرہویں صدی سے جاری ہے جب کہ ایک شامت زدہ البانوی سردار نے اسکندربرگ کے ماتحت مغربی یورپ کی طرف سے ترکوں سے لڑنے کا وبال سر لیا تھا۔ ہر وہ داغ جو کسی قبیلہ یا فرد کے دامن پر ہو صرف خون ہی سے دھلتا ہے۔ ان قبیلہ وار خون آشامیوں سے صرف عورتیں مستثنیٰ ہیں، محض اس بنا پر کہ عورت کا خون کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ شاہ ذوق کے سر بھی سیروں خون کا بوجھ ہے موجودہ بلند مرتبے کی راہ میں اسے جتنا خون بہانا پڑا ہے اس کی مقدار ملک کے باقی تمام سرداروں کی خونریزیوں سے بہت زیادہ ہے شاہ ذوق نے ان خونیں مشاغل کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دینے کی کوشش کی۔ دو سال ہوئے انہوں نے قبائل کے کل سرداروں کو ترانا میں جمع کیا کہ وہ آپس میں مل جائیں اور آئندہ دوامی صلح کے لیے حلف اٹھائیں اگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ صرف معدودے چند سرداروں نے اس کے پیغام پر لبیک کہا۔ واقف حالوں کا عقیدہ ہے کہ شاہ ذوق انتقامی خونخواریوں کو روک نہیں سکتے جن پر البانیہ کی عزت و آبرو کی محکم روایات مبنی ہیں۔

جہاں یہ سولہ لاکھ آبادی کا ملک ایک سو نوے فرقوں پر منقسم ہے، جن میں سے ہر ایک کا اپنا اپنا ایک منتخب سردار ہے اور جہاں مقامی پولیس کا تعاون جنداریہ کے ساتھ ہے جو مدت تک برٹش افسروں کے ماتحت رہا ہے، اصل حکمران یہی سردار ہیں۔ جن میں سے کچھ ذوق کے وفادار ہیں اور کچھ خود سر۔ شاہ ذوق کو سیاسی رقیبوں اور حریفوں کے علاوہ ان سرداروں سے نبٹنا پڑتا ہے پھر ایسے خارجی عناصر بھی موجود ہیں جن پر بادشاہ کی جان پر حملہ کرنے یا کرانے کی سازش یا ترغیب کا گمان رہتا ہے۔ ایک موقع پر اس کی نمایاں طور پر تصدیق بھی ہوئی۔ ذوق اپنا مسکن چھوڑ کر ایک خوبصورت خاتون سے ملنے دا اپنا جا رہے تھے۔ جیسے وہ اوپرا ہاؤس

(سرود خانہ) میں داخل ہو رہے تھے، ان کے پیچھے کچھ تند دنیں سر ہوئیں۔ پھر کر دیکھتے ہیں تو ان کا اے ڈی کانگ تڑپ رہا تھا۔ اس وقت سے شاہ ذوق ترانا کے نیما بنے گلاب باغ والے محل میں یا درازو کی بلندی پر رہی مسکن بنا رہتے ہیں۔

شاہ ذوق کی زندگی ایسی غیر محفوظ ہے کہ جب وہ گرمیوں میں ساحل پر قیام کرتے ہیں تو راستوں پر چودہ میل تک فوجی پہرہ ہوتا ہے اور مسکن کے گرد ہفتوں سنتریوں کے ڈیرے لگے رہتے ہیں۔ پھر زہر خورانی کا خوف رہتا ہے۔ ضرورت تو ان کو ایسی رفیقہ زندگی (ملکہ) کی تھی جو امکانات زہر کی نگرانی کر سکے۔ برسوں شاہ کی منظورِ نظر ماں اس فرض کو انجام دیتی رہی، جس میں شاہ کیلیے ہر کھانے پینے کی چیز کا چکھ کر امتحان کرنا بھی شامل ہے۔ آجکل اس کی چھ بہنوں میں سے ایک اس فرض کو انجام دیتی ہے۔ مگر اب وہ بھی اور بہنوں کی طرح شادی کرنے والی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ بادشاہ کی جان کی نگرانی کون کرے گا؟ کوئی اور عزیز ایسا قابلِ اعتماد نہیں۔ رہا یہ سوال کہ وہ خود شادی کر کے اس مشکل کو حل کیوں نہیں کر لیتا؟ تو ساتھ ہی خونی انتقامی مناقشات کا پرانا سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

یورپ میں صرف شاہ زوق ایک ناکتخدا تاجدار ہے۔ وہ ایک پسندیدہ جوان ہے اور دنیاوی دولت و عزت سے سرفراز، بلند نگاہ، خوش مزاج، ذہین، حلیم اور سب سے بڑھکر ایک عظیم شخصیت کا مالک، آزمودہ شیر دل۔ بعض وقت دشمنوں کے مقابلہ میں بیحد سنجیدہ، تند مزاج، سختگیر دکھائی دیتا ہے مگر فطرۃً اسکی طبیعت کو مزاح، طیبت اور لطافت سے کافی حصہ ملا ہے۔ اسکے دربار خاص میں چکنی یا لغز بوریا کا فرش بچھا ہے۔ لباس فاخرہ میں ملبوس سردار اس سے ملکر گھٹنے لوٹتے ہیں تو باہر نکلنے کی جلدی میں پھسل پھسل کرتے اور گرتے ہیں اور اس منظر سے وہ بڑا مزا لیتا ہے۔

بہرکیف، اتنی شگفتہ طبیعت، مردانہ صفات، اور سب سے بڑھکر حاجت شدیدہ کے باوجود وہ اب تک ناکتخدا کیوں رہا؟ پچھلے بارہ سال میں وہ بارہا منسوب ہوا۔ ایک دفعہ تو ایک امریکی کروڑپتی حسین و با اثر خاتون سے نسبت ہوئی، کبھی رومانیا کی شہزادی سے، کبھی اٹلی کی شہزادی سے، اور ایک دو بار انگلستان کے معزز و موقر خاندانوں کی لڑکیوں سے۔ پچھلے مہینے تو یہاں تک اعلان ہو گیا کہ شاہ زوق اپنے ہی قبیلہ کی ایک مسلمان لڑکی سے منسوب ہیں اور یہ کہ شادی جوبلی کے ساتھ ہی انجام پذیر ہوگی۔ مگر ہوا کچھ بھی نہیں۔

سچ پوچھئے تو زوق کی واقعی نسبت ایک ہی بار قرار پائی تھی۔ اب سے دس برس پہلے سیاسی کشمکش اور گرم جوش و خروش کے دور میں البانیا کے ایک سردار کی لڑکی سے۔ زوق نے اس سردار کو دیس نکالا دے رکھا تھا۔ صرف اس مصلحت سے انہوں نے یہ رشتہ قبول نہ کیا کہ ایک سردار کو یہ عزت دیتے تو باقی تمام سرداران قبائل میں رشک و حسد کی آگ بھڑک اٹھتی۔ بادشاہ کے خلاف خونیں انتقام کے جوش میں اب سے بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ اور اس منگنی کے بعد غیر نسل میں شادی کرتا تو تمام سرداران ملک کی توہین تھی۔ پھر اب وہ جن خطرات اور نیم اسیری کی حالت میں بسر کرتا ہے غیر اقوام کی لڑکیاں مشکل سے ایسی زندگی میں شرکت پسند کریں گی۔

شاہ زوق خود اس حالت کو محسوس کرتے ہیں۔ کہا کرتے ہیں "دلہن کو میں کیا نذر کر سکتا ہوں؟ ازدواج کے معاملہ میں کوئی فیصلہ نہیں رکھتا۔ سردست میرے لئے یہی بہتر ہے کہ اپنی تمام تر توجہات اپنے ملک کو ایک جدید نظم و تمدن ریاست کی تعمیر میں مرکوز رکھوں۔ صبح صادق سے آدھی رات تک بلکہ کھانے اور ورزش کی مہلت کے گھنٹوں میں بھی ایک دشمن بنا رہتا ہوں۔" پھر بھی شادی کا مسئلہ بھی ایک نہ ایک دن حل کرنا ہی ہے کیونکہ ولیعہد کا اہم تر مسئلہ اس سے وابستہ ہے۔

سردست شاہ زوق کے انکار کا مرکز جدید اٹلی کے مقابلہ میں اپنے ملک کی آزادی کے خطرات ہیں۔ اہل البانیہ کے دلوں میں وطنی حمیت، قومی فخر اور ملی غیرت کی آگ سلگتی رہتی ہے۔ اطالویوں سے انکو کوئی محبت نہیں۔ جن کی ڈھائی ہزار کی آبادی البانیہ میں منتشر ہے اور زیادہ تر حکومت کے عہدوں پر بھی فائز ہیں مثلاً ملکی اور قومی عہدہ دار، انجنیئر، ساہوکار وغیرہ۔ سب سے زیادہ ڈر کا باعث خلیج ولونا کے دہانہ پر جزیرہ ساسینو پر اٹلی کا قبضہ ہے، جو بحیرہ ایڈریاٹک کا جبل الطارق کہا جاتا ہے۔ یہاں سے راس اترانتو پچاس میل سے زائد نہیں اور اٹلی توپوں کی سیدھی زد پر ہے۔

دولت اطالیہ اس جزیرہ کو اتنی اہمیت دیتی ہے کہ اعلیٰ عہدہ داروں کے خاندانوں کی بیویوں بچوں کو بھی جانے کی اجازت نہیں۔ یہ یورپ کے مخفی ترین مقامات سے ہے جس کا علم باہر والوں کو نہیں۔ اس میں سب سے بڑا نقص شیریں پانی کی کمیابی ہے۔

اہل البانیہ دولت اطالیہ سے سخت متوحش اور کھٹکے رہتے ہیں۔ ملک پر اس کے قابض و مسلط ہو جانے کا انہیں ہر وقت اندیشہ رہتا ہے۔ شاہ زوق کے حق میں یہ افواہ بھی باعث پریشانی بن رہا ہے کہ انہوں نے ملک کو مسولینی کے ہاتھ فروخت کر دیا ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ شاہ اکثر حالات کو جب تک ان کے سرانجام کا آخری و صحیح لمحہ نہ آ جائے معرض التوا میں چھوڑ دیتا ہے۔ یہ معاملہ بھی کچھ ایسا لگتا ہے۔ وہ اس بازی میں استاد ہو گیا ہے جو اٹلی کے کھلاڑیوں کو بھی مخمصہ میں کر دیتا ہے، جن کی حریصانہ نظر زیادہ تر البانیہ کے تیل پر لگی ہے۔ اس تیل

Marfat.com

کی لاپنیا فایرنی کے اس پاس ہیں اور یہ بھی انگلو پرشین کمپنی کے قبضہ میں تھیں۔ کمپنی نے ان کو زیادہ رقم لگانے کے لائق نہ سمجھا، آخر ان کو اٹلی نے لے لیا۔ اور جنگ حبشہ سے وہ ان کنوؤں کو کامل ترقی کے درجے پر پہنچا رہا ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء تک ترانا میں صرف ایک درجن موٹر کاریں تھیں۔ عورتیں بہت کم باہر نکلتی تھیں، اور نکلتیں تو جیب چھپا کر سر سے پاؤں تک سیاہ، سلاٰی برقعوں میں لپٹی ہوتی۔ جہالت کامل تھی۔ پست اور بلند ہر خطے میں لوٹ مار جاری تھی۔ نہ مع منی میں وہاں دولت تھے۔ نہ پانی کے نل، نہ دارالحکومت تک پر اسانی کا انتظام، نہ دیہاتوں کا طرز کے سوا دوسری کا کوئی سامان تھا: نہ سڑکیں تھیں، نہ ریل گاڑیاں یا لوگوں کی نقل و حرکت کے لیے کوئی باقاعدہ سلسلہ۔ ترانا کا ایک پورا علاقہ غلیظ جھونپڑوں اور بے شمار مچھروں سے بھرا تھا۔ اب دارالحکومت ترانا میں سیر و تفریح کے لائق ایک کشادہ شاہراہ ہے۔ اس شہر کو جانے والی سب سے بڑی سایہ دار شاہراہ "شارع مسولینی" ہے۔ ڈاک اور مسافروں کے لیے گندا اور خطرناک ہیں کہ اب تک ملک کا پورا جائزہ نہیں لیا جاسکا ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اسکی زمین معدنی دولت کی خزانہ دار ہے۔ اب تک جو پیداوار اس سے برآمد کی جاتی ہے وہ انگوری شراب اور روغن زیتون ہے۔ باشندوں کا ذریعہ معاش زیادہ تر گلہ بانی ہے رقبہ تقریباً دس ہزار آٹھ سو مربع میل اور آبادی کم و بیش سولہ لاکھ ہے۔ اہل البانیہ جزیرہ نمائے بلقان کی قدیم ترین قوموں میں سے ہیں۔ جذبہ آزادی اور اپنی قدیم رسوم و روایات کا احترام و استقامت ان کی ممتاز خصوصیتیں رہی ہیں۔ جمہور البانیہ مسلمان ہے صرف دو خمس ۲/۵ عیسائی ہیں جو یونانی و رومی کلیساؤں میں منقسم ہیں

تاریخ قرون ماضیہ میں رومی، اگاتھ، جسٹینین، سربی، بازنطینی اور نارمن فتوحات کے آثار البانیہ میں موجود ہیں۔ ان فاتحین میں سے صرف سربی، ہمسائگی کے باعث زیادہ مدت تک قابض رہے۔ بارھویں سے چودھویں صدی عیسوی تک یک لخت حکمراں رہے۔ سنہ ۱۳۹۰ء میں آخری سربی حکمراں کی وفات کے بعد سے یہ خود اپنے ملکی سرداروں کے زیر حکومت رہا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پندرھویں صدی عیسوی میں ترکوں کے ہاتھ آگیا۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے آغاز میں بعض مسلمان سرداروں نے البانیہ میں آزاد خود مختار حکومت قائم کرنے کی کوشش کی مگر سنہ ۱۸۲۲ء میں علی پاشا کی شکست سے ان مساعی کا خاتمہ ہو گیا۔

علی پاشا علی پاشا ملقب بہ "اسد یانینہ" سنہ ۱۷۴۱ء میں البانیہ میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ جوانی میں مقتول ہوا۔ اس نے بیٹے کے دل میں باپ کے خون کے جوشِ انتقام کی پرورش کی جو بعد کو حد سے زیادہ ہیبتناک بن کر پھیل لایا۔ اپنی سربلندی کا رستہ صاف کرنے کیلیے پہلے اپنے بھائی کا راستہ صاف کیا، پھر اقدام زہر خورانی کے الزام پر ماں کو قتل کر دیا۔ سنہ ۱۷۸۷ء میں وہ قزاقی کے سدباب کے لیے متعین کیا گیا جو اس زمانہ میں ایک عام وبا بنی ہوئی تھی۔ مگر شجاعت و جلادت سے مقابلہ کرنے کے عوض رشوت دہی سے کام لیتا رہا بلکہ خود بھی قزاقانہ ترکتازی میں شریک ہونے لگا۔ آسٹرو روسی جنگ میں اس نے ترکوں کی مدد کی۔ مگر اس کی مسلسل غداریوں کی سزا میں سلطان محمود نے اسے قتل کرا دیا۔ اس کے نظم حکومت کا مدار ہیبت و تخویف پر تھا۔ ملک کو اس نے ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ سے تو پاک کر دیا مگر خود اس کا ناپاک وجود کسی جرائم پیشہ سے کم نہ تھا۔ ان عیوب کے ساتھ وہ مذہبی رواداری کی صفت سے متصف تھا۔ اس نے یونانیوں اور دوسرے عیسائیوں کو کامل مذہبی آزادی دے رکھی تھی۔ اور ان کو مدرسے کالج کتب خانے کھولنے کی اجازت دیدی تھی۔ اور تمام قوموں کے ساتھ یکساں سلوک کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اندرونی بے امنی کے باوجود دول عیسائی اس سے ناراض نہ تھیں۔ بلکہ ترکوں سے علی پاشا کی مخاصمت ان کے مابین ایک مشترک وجہ اتحاد تھی۔

اسد پاشا حریت البانیہ کی جدید تاریخ کے اصل بانی اسد یا اسعد پاشا تھے۔ یہ سنہ ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے البانیہ کے ایک مقتدر با ثروت خاندان ڈرازو کے سرداروں میں تھے۔ ان کے بھائی غنی سلطان عبدالحمید کے معتمد مشیر اور کارپرداز تھے۔ آخر یلدیزی دربار کی معمولی سازشوں یا سلطان کی حکمت عملیوں کا شکار ہو گئے اور قتل کر دئے گئے۔ اس واقعہ نے اسعد کو حمیدی حکومت کا جانی دشمن بنا دیا۔ چنانچہ وہ جوان ترکوں کے انقلاب سنہ ۱۹۰۸ء میں شریک ہو گئے اور سنہ ۱۹۱۲ء تک ترکی پارلیمنٹ میں البانیہ کے ساحلی علاقہ

[1] یہ ہارورڈ یونیورسٹی امریکہ کا تعلیم یافتہ تھا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں آزادی البانیہ کیلیے کچھ کوشش پیروی کی تھی۔

Marfat.com

ورانڈو کے نمائندہ رہے۔ گروہ انجمن اتحاد و ترقی کے کامل مخلص حامی نہ تھے۔ اس کی رکنیت کے ساتھ ساتھ وہ برطانوی علمبرداری یا سرپرستی کی گفت و شنید میں مصروف رہے۔

جنگ بلقان کے خاتمہ پر ۱۹۱۳ء کے عہد نامہ لندن نے البانیہ کی خود مختاری کا فیصلہ کیا۔ مگر کیسی خود مختاری، طے پایا کہ دول یورپ البانیہ کے لیے ایک بادشاہ منتخب کریں گی۔ چنانچہ جرمن پرنس ولیم آف وِیڈ کو اس کے سر تھوپا گیا۔

ولیم آف ویڈ شاہزادہ نیو ویڈ ہیڈ رلینڈ میں پیدا ہوا تھا۔ تخت البانیہ پر اس کا اتفاق اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس کے باپ دادے جرمنی اور آسٹریا کی وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا تھا۔ اس کا پردادا فتح جمہوریہ کا آخری نائب حکومت اور ہالینڈ کا تاجدار تھا۔ فرانس سے جنگ کی اور ہالینڈ کی شکست پر پرشیا اور آسٹریا کی فوجوں میں ۱۸۱۲ء تک شمال بحر بنجا عالم کارنامے اپنی گمشدہ عظمت و اقتدار کی بازیابی کے موقع کی تاک میں لگا رہا۔ آخر جب بلجیم ہیڈ رلینڈ کے ساتھ ضم ہوا تو ۱۸۱۵ء میں اس نئی سلطنت کا تاجدار اعلان کیا گیا۔ مگر ۱۸۳۰ء میں بلجیم نے اس کی بادشاہی کا جوا کاندھے سے اتار پھینکا۔ اس قسم کا عروج و زوال اس بدنصیب خاندان شاہی کی نمایاں قسمت رہا ہے۔ اس کی اولاد ایک قسم کے آغا خاں کی طرح رہی۔ بے تاج مگر ایک شاہانہ وقار کی مالک کسی تخت کی آرزومند موقع کی جویاں، اگر صلاحیتوں کے باوجود ناکام آرزو۔

شاہزادہ ولیم ویڈ کا تعلق بلقان سے اتنا اور بھی تھا کہ اس کی پھوپھی یا خالہ رومانیہ کی ملکہ تھی اور اس کی شادی بھی رومانی خاندان شاہی میں ہوئی تھی۔ اس نے تخت البانیہ کا غیر متوقع نذرانہ قبول کرتے ہی اپنا تختگاہ کی طرف رخ کرنے کے عوض یورپ کی مختلف تختگاہوں کا اس قصد سے دورہ کیا کہ اس نئی سلطنت کے چلانے اور ملک میں اصلاحات و ترقیات نافذ کرنے کے بہانے تیس لاکھ پونڈ قرضہ حاصل کرنے کا سامان کرے۔ اس کے البانیہ پہنچتے ہی شمالی اپیرس کی شورہ پشت قوم کی بغاوت شروع ہو گئی۔ اسد پاشا وزیر داخلی و حربیہ تھے۔ انہوں نے اندرونی باغیوں اور بیرونی حملہ آوروں (مونٹی نگرو اور سرویا) کے مقابلہ میں دلیری سے وطن کی مدافعت کی۔ مگر ان کی بعض سیاسی حکمت عملی سے دلوں میں بے اطمینانی پیدا ہوئی اور وہ برطرف اور جلا وطن کر دیے گئے۔ مگر چند مہینوں کے اندر جنگ عظیم چھڑ گئی اور یہ جرمن کٹھ پتلا تاجدار البانیہ ولیم ویڈ سر سے تاج شاہی پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد کچھ دن کے لیے سلطان عبدالحمید کے بیٹے شہزادہ برہان الدین البانیہ کی مسند شاہی پر متمکن ہوئے مگر ان کے قدم بھی اس سرزمین پر جم نہ سکے۔ اسد پاشا دوبارہ وطن میں واپس بلائے گئے اور البانیہ کی عارضی حکومت کے صدر بنائے گئے۔ انہوں نے جبر و قہرمانی سے اعضائے مجلس (سینٹ) پر قابو رکھا۔ جب اٹلی نے آسٹریا کے علی الرغم البانوی ساحل پر فوجی مہم بھیجی تو البانیہ سے اسد پاشا کو پھر نکل بھاگنا پڑا۔ وہ سلونیکا میں پناہ گزیں ہوئے اور بعد کو پیرس میں البانوی وفد کی نمائندگی کی۔ جنگ عظیم کے اختتام پر دراز سے اطالوی فوج کو مار نکالا۔ ۱۹۲۰ء میں ایک البانوی عوامی رستم نے ان کو پیرس کی ایک سڑک پر شہید کر دیا۔

(اپریل ۱۹۳۶ء)

Marfat.com

استدراک

مقالہ یورپ کی ایک ننھی سی سخت جان حکومت

شاہ احمد زوغ اول کی شادی

از

جناب پروفیسر محمد مسلم صاحب، ایم اے سینٹ کولمبس کالج ہزاری باغ

وہ احمد زوغ جو اب سے دس برس پیشتر زندگی کے نشیب و فراز، بلند ہمتی کی شکست و فتح اور زمانہ کے رنج و راحت کے گوناگوں تجربے اٹھا چکا تھا، کبھی کھیتوں میں کام کرنے والا چھوکرا تھا، کبھی سپاہی، کبھی وزیر، کبھی انقلابی سرفروش، کبھی خانماں آوارہ مفرور، کبھی جمہوریہ البانیہ کا صدر، اور بالآخر بادشاہ زوغ اول، جس کی جان خطرات کی آماجگاہ رہی، دشمنوں کو راہ سے صاف کرنا، ترامائی دوہری چھتوں والے محل میں بسر کرنا، لگاتار بارہ بارہ گھنٹے کام کرنا، قاتلوں کے خفیہ حملوں سے بچنا اور بیرونی دشمنوں سے ہر وقت ہوشیار رہنا جس کی زندگی تھی، اس کو بھی اپنے ڈراما کا ایک اہم اور دشوار پارٹ انجام دینا تھا۔ اور وہ ازدواج کا مسئلہ تھا۔ گو بظاہر اس میں کوئی دشواری نہ تھی۔ لڑکیاں البانیہ میں بھی تھیں اور ہمسایہ ریاستوں کے شاہی خاندانوں میں بھی، جو اس کی زوجیت کی آرزومند تھیں۔ مگر البانیہ میں ایک قبیلہ کی عزت افزائی سے دوسرے قبائل میں حسد کی آگ لگتا تھا۔ غیر اقوام میں ازدواج سیاسی سازشوں بلکہ جان کے خطروں سے خالی نہ تھا، جب کہ گھر ہی میں بار بار اسے زہر دینے کی کوشش کی جا چکی تھی، محافظ مار چکے تھے، جنہیں جن پر اعتماد تھا مارے جا چکے تھے۔ ایک رفیقہ

ۓ ایڈیٹر صاحب ندیم نے ہمیں متوجہ کیا ہے کہ عام اور مشہور تلفظ زوغو ہے (اور جو غالباً کسی قبیلہ کی جانب انتساب ہے۔ اور شاید مصری اخبار و رسائل میں بھی اسی املا سے یہ نام لکھا جاتا ہے ندیم) مگر یہ صحیح نہیں۔ انگریزی رسم خط کا یہ آخری ہا (واو) غیر ملفوظی ہے، چنانچہ بعض کتابوں اور رسالوں میں بلا واو کے بھی یہ نام دیکھا جاتا ہے۔ حرف حلقی اس ایرانی نسل کا خبر دیتا ہے اور بے شبہ ترکی ہے۔ ان ترکی ایرانی لہجوں میں غ اور ق کا مبادلہ عام ہے جیسے آغا آقا۔ قدغن۔ نمدغن۔ وغیرہ ذالک اسی قیاس پر ہم نے اس فرق کو نظر انداز کر کے بر بنائے ذوق زوق کو ترجیح دی تھی۔ مگر زوغ کو بھی صحیح سمجھتا ہوں اور مقالہ ہذا میں اسی کو اختیار کرتا ہوں۔

Marfat.com

حیات ہمدردی کی فروزاں شدید تھی اور قوم کا متواتر شدید تقاضا، مطالبہ، احتجاج تھا کہ تخت البانیہ کا وارث ہونا چاہئے۔ حالات کے لحاظ سے جن صفات کی ملکہ درکار تھی اسکا انتخاب فوراً مشکل تھا۔ قبیلہ کی ایک لڑکی تھی جس سے اسکی منگنی ہوئی تھی اسے قبائل کی باہمی حسد کے خوف سے رد کر دینا اور اسکے ناراض و برافروختہ باپ کو جلاوطن کر دینا پڑا تھا۔ کچھ دن شاہ اٹلی وکٹر عمانویل کی بیٹی سے شادی کی گفتگو اور دید و باز دید کا سلسلہ جاری رہا۔ مسولینی اس بندھن کا حامی و ساعی بھی رہا لیکن کسی وجہ سے یہ گفتگو منقطع ہو گئی پھر اس شاہزادی کی شادی شاہ بلغاریہ سے ہو گئی۔ کبھی مشہور ہوا کہ زوغ کی شادی رومانیہ کی شاہزادی الیناسے قرار پا گئی ہے گر یہ بھی بر روے نہ آئی۔

زوغ خود ان افواہوں کا مذاق اُڑاتا رہا۔ وہ کہتا کہ "غیر ممالک سے متعلق یہ افواہیں بیہودہ ہیں" ایک بار اس نے ڈیلی ٹیلیگراف کے نمائندے سے کہا کہ "میرے پاس ان شاہزادیوں کی نذر کرنے کو کیا رکھا ہے؟ اسکی سالانہ آمدنی صرف نوے ہزار ڈالر (تقریباً پونے تین لاکھ روپیہ) ہے

ایک دفعہ وائنا کی سیر میں اسکی ملاقات ایک امریکی رقاصہ سے ہوئی۔ کہتے ہیں کہ زوغ اس پر عاشق ہو گیا اور شادی کا پیغام دے دیا مگر رقاصہ نے اسے رد کر دیا۔ بغرض ازدواج کا معاملہ یوں ہی ٹلتا رہا یا دہ ٹالتا رہا۔

دو برس ہوئے شادی کیلئے قوم کے زیادہ شدید تقاضے کی آواز کو خاموش کرنے کیلئے یہ پرلطف تدبیر نکالی کہ شادی کے پیسے دلال کیلئے جنیں ہزار معاوضہ کا اعلان کر دیا جو ایک حور طلعت الدار الکہ تی دلھن مہیا کرے۔ دلال بھی ایک بلا ہوتے ہیں۔ آخر ایک پرتگالی دلال ہنگری کے شاہی خاندان کی ایک انیس سالہ مہ جبیں دوشیزہ ساتھ لیے حاضر ہو گیا مگر یہ مہم بے نتیجہ ہوئی۔

گذشتہ دو سال میں زوغ کی نسبت کے سلسلہ میں متعدد لڑکیوں کے نام مشہور ہوئے، جن میں کچھ البانیہ کی تھیں، ایک مصری شاہزادی تھی، ایک شکاگو کی کثیر دولت کی وارثہ، ایک روسی رقاصہ، مگر سب بے نتیجہ۔

ابھی چند ہفتے ہوئے شاہ زوغ کی زندگی کے اس دلچسپ باب سے متعلق بوداپسٹ سے متواتر یہ خبریں شائع ہوئیں کہ آخر اسکی شادی اپریل میں کونٹس جیرلڈائن اپونی سے طے پا گئی۔ اسکا باپ ہنگری کے خاندان شاہی کا ایک فرد اور ماں امریکی تھی۔ اس لڑکی کا ذریعہ معاش بوداپسٹ کے عجائب خانہ "نیشنل میوزیم" کی رہنمائی یا عجائب نمائی کی خدمت اور سیاحوں کے ہاتھ مصور پوسٹ کارڈ فروخت کرنا تھا اور اسکی آمدنی صرف ۵ ہم ڈالر ماہوار تھی اب اس نسبت کی پختگی کے بعد وہ اس شغل سے دست بردار ہو گئی ہے

الغرض واقعہ نے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی کسی دولت کو عقد نکاح میں لانے کا آرزومند نہ تھا۔ اس قسم کا اظہار خیال صرف شادی کیلئے سر کھانے والوں سے پیچھا چھڑانے کا ایک لطیف حیلہ تھا۔

یہ ہیں البانیہ کے ۴۳ سالہ تاجدار کی زندگی کے وہ واقعات جو افسانہ نویسوں، تمثیل نگاروں، اداکاروں اور شاعروں کیلئے دلچسپ مواد ہیں اور ہمارے لئے یہ سبق کہ یورپ کی سیاسیات حاضرہ نے اعلیٰ طبقہ کی شخصی آزادی کتنی مہنگی بنا رکھی ہے۔ جسکا اندازہ ہم سبکساران ساحل نہیں کر سکتے۔ ڈیوک آف ونڈسر سابق شہنشاہ ایڈورڈ ہشتم کی زندگی کی کایا پلٹ زیادہ نمایاں مثال ہے

(مئی ۱۹۳۸ء)

ؔ ایک ڈالر تقریباً تین روپیہ کا ہوتا ہے۔

Marfat.com

تلخیص و تبصرہ

شاہ البانیہ کی ہمدردی عورتوں کے ساتھ

از
جناب سید علی مظفر امام صاحب، ایجکہ، گیا

ہندوستان کے باشندے البانیا کے متعلق بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ اسلام اس ملک میں ۱۴۶۲ء میں داخل ہوا۔ اس وقت یہ ملک ایک مسلمان بادشاہ کے زیر حکومت ہے۔ لیکن مسلمانوں کے ذہن میں اسلامی ممالک کے ساتھ البانیہ کا تخیل نہیں آتا ہے۔ اسلامی خلافت کے تعلق سے ترکوں سے مسلمانان ہند کا قلبی لگاؤ رہا۔ ایران سے بھی مسلمانان ہند کے قدیم تمدنی و معاشرتی تعلقات قائم رہے۔ پھر یہ وجہ بھی تھی کہ ایرانیوں کا مذہب ترکوں اور عام مسلمانان ہند سے مختلف تھا۔ مگر البانیہ ان اختلافات سے پاک رہا۔ اور اس کی حیثیت ترکوں سے علیحدہ ہو کر کبھی مستقل طور پر ہندوستان میں تسلیم نہیں کی گئی۔ البتہ جب سے خوش رو تعلیم یافتہ اور بیدار مغز مدبر احمد زوغو نے اس ملک پر اقتدار کر کے اسے بلقان کے حدود سے باہر تسلیم کرایا۔ اس کی جانب بھی مسلمانان عالم کی نگاہیں اٹھ گئیں۔ اور لوگ فطری طور پر اس غیر معروف اور بھولے ہوئے ملک کے حالات جاننے کے مشتاق ہوئے۔ اور وقتاً فوقتاً اس پر پرمعلومات مضامین چھپنے لگے۔ اسی سلسلہ میں "میگزین" کے ایک تازہ نمبر میں البانیہ کی عورتوں کی بیداری پر ایک دلچسپ اور پرمعلومات مضمون شائع ہوا ہے۔ اس کی تلخیص "ناظرین ندیم" کی دلچسپی کا باعث ہوگی۔ مقالہ نگار لکھتا ہے

"البانیہ کی عورتیں ایک عرصہ سے مردوں کے دوش بدوش آنے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔ بالآخر البانیہ کے بیدار مغز فرمانروا احمد زوغو نے مسلمانان البانیہ کی ہائی کونسل

Marfat.com

نیما عورتوں کے مذہبی حقوق کے مطابق فیصلہ صادر فرماتے ہوئے عورتوں کو چہرہ اور ہاتھ کھلا رکھنے کا حکم دیا اور نقاب یا کوئی دوسرا لباس جس سے پردہ قایم رہ سکے، استعمال کرنے کی ممانعت کی اس کے ساتھ عورتوں کے طرز معاشرت کو بلند کرنے، ان کی مجلسی برائیوں کو دور کرنے، اور انہیں تعلیم و تربیت کے زیور سے آراستہ کرنے پر خاص توجہ کی۔ اور چند سالوں میں اسے حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔

انہوں نے پورے ملک میں بے شمار علمی درسگاہیں کھلوائی ہیں۔ چنانچہ سلطنت نے ۳۵-۱۹۳۴ء میں تعلیم پر تقریباً ۲۲۲،۸۹۲،۱۹ ڈالر صرف کئے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اسکولوں میں پانچ برس سے بیس برس کے سن تک کے طالب علموں کی تعداد ۱۰،۵۲۹ تھی، یا یوں کہئے کہ کل آبادی کا ۴۲ فیصدی طبقہ زیر تعلیم تھا۔ اس نے ان تمام درسگاہوں کی امداد و ترقی اور ان میں خواتین کے حقوق کے تحفظ اور فلاح و بہبود کے لیے خاص احکام نافذ کئے۔

ان سب امور کے علاوہ البانیہ کی خواتین نہایت بہادر شمار کی جاتی ہیں اور کسی عورت کی ذرا سی بے حرمتی کا شائبہ بھی موت کا منہ دکھاتی ہے۔ اس سخت سزا کو اکثر لوگ پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے عورتوں کی حفاظت کے قوی امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ جب ایک تنہا عورت کسی خطرناک راستہ سے گذر رہی ہو تو وہ ایک مرد کی حفاظت کی اتنا ہی مستحق ہے جتنا کہ ایک رائفل ایک مرد کی حفاظت کے لیے ہو سکتا ہے۔ کوئی اوباش عورت کی عزت کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچا سکتا ہے۔ البانیہ والوں کا ایک مقولہ ہے "وہ ہاتھ جس سے کسی عورت کو صدمہ پہنچے، کسی کم ظرف اور بزدل ہی کا ہو سکتا ہے وہ شخص سوسائٹی میں کسی عظمت و احترام کا مستحق نہیں ہے"۔

بادشاہ کی تینوں بہنیں اور ہر امپیریل ہائینس اپنی روشن خیالی، سیاست دانی اور معاشرتی و مجلسی خدمات و اصلاحات کے لیے سارے البانیہ میں مشہور ہیں وہ عوام کے جلسوں کی رونق اپنی شرکت سے دوبالا کرتی ہیں اور ملک میں علم و تربیت کی توسیع و اشاعت میں بیش بہا خدمات انجام دیتی ہیں اور خصوصاً عورتوں کو ان کے دختری فرائض اور مادرانہ شفقتوں اور ذمہ داریوں سے آگاہ کرتی ہیں اور انہیں، عورتوں بچوں کی تعلیم و تربیت کا شروع ہی سے خیال رکھنے اور اپنے شوہروں کے ساتھ عملی زندگی میں حصہ لینے کی ترغیب دیتی ہیں۔

شاہی فرمان کے رو سے عورتیں پردہ اُٹھا چکی ہیں اور ملک کی خدمت میں مردوں کے دوش بدوش شریک ہیں کسی عورت کو ان مقامات میں جہاں مذہبی آزادی مفقود ہے، جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اب جب سے بادشاہ کی تینوں بہنیں گورنری کے عہدہ پر فائز ہوئی ہیں، عورتوں کی آزادی پر مہر ثبت ہو گئی ہے۔ یہ صوبے جو ان عورتوں کی گورنری میں ہیں مذہبی معتقدات و روایات کے لحاظ سے قدامت پسند نہیں۔ جو طبقے قدامت پسندی کے حامل تھے۔ ان کے

Marfat.com

مخالفانہ جوش و خروش سرد پڑ چکے ہیں۔ اور حالات بہت کچھ پہلے سے بدل گئے ہیں۔

بادشاہ کی دو بھتیجیاں بھی جو تعلیم کی تکمیل کی غرض سے یورپ بھیجی گئی تھیں۔ وہ بھی اپنی دماغی استعداد و صلاحیت کے لحاظ سے خاصی شہرت رکھتی ہیں اور اسی طرح الیانیہ کے شاہی خاندان کی دوسری خواتین بھی تعلیم نسواں کی ترقی کے لیے مصروف رہتی ہیں۔

الیانیہ کی عورتیں فطرۃً "خودی" بننا پسند کرتی ہیں۔ وہ اپنے حقوق کے حاصل کرنے کیلیے ایک حد تک بادشاہ کی ناراضی کا بھی کچھ خیال نہیں کرتیں۔ جیسا کہ الیانیہ کی ایک کمسن بیوہ نے اپنے لڑکے کا نام زدخور رکھا، اور جب حکومت کی طرف سے اس کے اپنے لڑکے کا نام بدلنے کا حکم آیا کہ اس کا نام لیتے وقت شاہی ادب کا پاس نہیں رہ سکتا تو اس نے نام تبدیل کرنے سے انکار کر دیا۔

جنوری ۱۹۳۰ء

Marfat.com

ایران

رضا شاہ پہلوی کے دَورِ حکومت میں

از جناب سیّد محبوب احمد صاحب وارثی بی۔اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

جنگِ عظیم سے پیشتر ایران کی تصویر اگر آپ نے دیکھی ہے اور جنگِ عظیم سے فوراً بعد کے حالات اگر آپ کو معلوم ہیں تو آپ میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے کہ اُس وقت ایران میں فی الحقیقت کوئی ایرانی حکومت نہ تھی، بلکہ ملک مختلف جنگجو فرقوں کی ذاتی مِلک بنا ہوا تھا۔ زندگی کے ہر شعبے میں انحطاط اور پستی کا عکس صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تعلیمی پستی۔ مالی کمزوری اور اقتصادی زبوں حالی کے علاوہ فوج کی ابتر حالت خاص طور پر ناقابلِ اطمینان تھی۔ بادشاہ وقت کو اپنی رنگ رلیوں سے فرصت نہ تھی۔ رعایا کو ملک کی فلاح و بہبود کی فکر نہ تھی۔ فوج کی ذہنیت خراب ہو چکی تھی۔ ملک کی حفاظت کا خیال ملک کے باشندوں کے دماغ سے نکل چکا تھا۔ ملک کی تجارت، صنعت، حرفت، یہاں تک کہ ملک کے سرمایہ پر بھی غیر ملکیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ صرف نام نہاد حکومت باقی رہ گئی تھی، جس کی باگ ڈور ایک عیش پسند اور بے عمل بادشاہ کے ہاتھ میں تھی۔ غرضکہ ایران ایک چراغِ سحری تھا ہوا کے ایک جھونکے کا انتظار تھا اور بس۔

خدا خدا کر کے سنہ ۱۹۱۸ء میں جنگِ عظیم ختم ہوئی۔ تقریباً تین سال صلحناموں کی شرائط کے مطابق "مالِ غنیمت" کی تقسیم میں صرف ہو گئے۔ ایران کے حصّے میں نقصان کے سوا کچھ نہ آیا۔ بالآخر قدرت کو ایران کی قسمت پر ترس آیا اور ایران کی فوج کے ایک وفادار، جانباز اور عاقبت اندیش سپاہی کو ایران کی اصلاح اور از سرِ نو تعمیر کی خدمت پر مامور کیا گیا۔

اس ضمن میں اس سپاہی کی سوانح حیات کا مختصر تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ دنیا جانتی ہے کہ اس سپاہی کا نام اُس وقت صرف محمد رضا تھا۔ لیکن اب دنیا اُسے رضا شاہ پہلوی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ رضا شاہ پہلوی کی صحیح تاریخ پیدائش ہنوز معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سنہ ۱۸۷۳ء میں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ آپ کے والدِ بزرگوار ایک معمولی کاشتکار تھے اور ان کی اوائل زندگی غریب کسانوں اور جاہل کاشتکاروں میں بسر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک معمولی مدرسے میں ہوئی، جس کی مدّت نہایت قلیل بیان کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس ابتدائی تعلیم کے بعد انہوں نے کسی اسکول یا کالج میں کبھی باضابطہ تعلیم حاصل نہ کی۔

شباب کی پہلی منزل میں قدم رکھتے ہی وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے ایران کی فوج میں داخل ہوئے۔ اور اُس وقت تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے، جب تک قدرت نے ان کو دوسری اہم اور شاندار خدمت تفویض نہ کی۔ جنگِ عظیم نے ایران کو جو نقصان پہونچائے تھے اُن کا احساس ایران کے نوجوانوں کے دلوں میں پیدا ہوا اور انہوں نے ایران کی اصلاح کی

Marfat.com

تھا۔ نوجوانوں کے دلوں میں احساس تو پیدا ہو گیا لیکن اس احساس سے ملک کو مستفید کرنے کے لئے ایک قائد کی ضرورت تھی۔ قدرت نے اس ضرورت کی تکمیل کے لئے رضا شاہ پہلوی کو منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ نوجوانوں کی نگاہیں آپ کی جانب اٹھیں اور انہوں نے آپ کی قیادت میں اپنا کام شروع کیا۔

ضرورت تھی کہ سب سے پہلے بادشاہ وقت کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا جائے۔ کیونکہ اس بادشاہ کو تخت سے اتارے بغیر اُنہیں اپنے مقصد میں کامیابی ممکن نہ تھی۔ چنانچہ ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء کو صرف ڈھائی ہزار فوج نے رضا شاہ پہلوی کے زیر کمان شب کے وقت ایران کے دارالسلطنت پر حملہ کیا اور ایک قطرہ خون بہائے بغیر آسانی کے ساتھ دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا۔ تین سال تک رضا شاہ پہلوی اپنی قلیل فوج اور ملک کے نوجوانوں کی امداد سے ایران کے بادشاہ کا کامیاب مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر ۲۵ اپریل ۱۹۲۴ء کو ایران کی پارلیمنٹ (مجلس ایران) نے احمد شاہ قاچار کو تخت سے اُتار کر زمام حکومت رضا شاہ پہلوی کے سپرد کر دی۔

قبل اس کے کہ رضا شاہ پہلوی کے عہد حکومت میں ایران کے اصلاحات اور ترقیوں کا ذکر کروں مناسب سمجھتا ہوں کہ رضا شاہ کے مشن سے آپ کو واقف کر دوں۔ یہ مشن مجھ سے نہیں بلکہ خود رضا شاہ کی زبانی سُنئے۔

۵ جنوری ۱۹۳۳ء کو ایک ملاقات کے دوران میں اپنی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے مشہور انگریز سیاح روسیٹا فوربس کو رضا شاہ پہلوی نے ذیل کا جو بیان دیا تھا اس سے اُن کے مشن کا صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے:-

"میرے ملک کو سب سے پہلے غیر ملکیوں اور بدیسیوں کی امداد کے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا طریقہ سیکھنا فوری ہی ضروری تھی ہے کہ چند سال بعد امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے غیر ایرانیوں کی تقرری کی ضرورت باقی نہ رہیگی۔ اور ہمارے ملک کے باشندے اس بار گراں کو آپ سنبھال لیں گے۔ آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم لوگ ایک بڑی سلطنت کے چشم و چراغ ہیں۔ اور ہمارے تجربات اُن صدیوں سے ہمیں ورثہ میں ملے ہیں جب ایشیا تمام اقوام عالم کی رہنمائی اور رہبری کر رہا تھا۔

ہمارے ملک کے باشندے عرصہ دراز تک غیر ملکیوں کی معاونت کے سہارے زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب وہ اپنے جوہر کو پہچانیں اور اُن میں آزادی فکر اور آزادی عمل کا صحیح جذبہ پیدا ہو۔

ہر ملک کی تہذیب جداگانہ ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا ہوں کہ ایرانی انگریزوں کی اندھی تقلید شروع کر دیں۔ ایرانیوں کو مقلد ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ خود شاندار روایتوں کے حامل ہیں۔ میں اپنے ملک کے باشندوں کو بہترین ایرانی بنانے کا آرزومند ہوں۔ میں اُنہیں نہ بالکل مغربی دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ سراسر مشرقی۔

ایران اپنے گھر کی ملکہ ہے۔ اُسے استحقاق حاصل ہے کہ وہ اپنی دولت میں اضافہ کرے۔ اور اس کی حفاظت خود اپنی قوت بازو سے کرنے کی طاقت پیدا کرے۔"
(ڈیلی میل مورخہ ۱۶ر جنوری ۳۳ء)

اصلاحات

فوج رضا شاہ پہلوی نے ایک سپاہی ہونے کی حیثیت سے سب سے پہلے فوجی اصلاحات کی ضرورت محسوس کی۔ ذاتی تجربات کی بنا پر اُنہیں فوج کی از سر نو تنظیم میں کوئی خاص دشواری محسوس نہ ہوئی۔ ۱۹۲۵ء میں رضا شاہ پہلوی نے ایران کی مجلس قانون ساز میں ایک فوجی قانون پاس کرایا جس کے رُو سے فوج کے جملہ انتظامات وزارت جنگ کے سپرد کر دیئے گئے۔ اور فوج کی تعداد میں اضافہ کرنے کی خاطر ملک میں فوجی تعلیم اور فوجی خدمات جبری قرار دی گئیں۔ لیکن یونیورسٹی کی تعلیم یافتہ لوگوں کو بری کر دیا گیا۔ فوجی افسروں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ایک کالج بھی قائم کیا گیا۔ جس میں ہنوز افسروں کو جدید ترین فوجی تعلیم دی جاتی ہے۔ خلیج ایران میں بحری فوج کا ایک دستہ تیار کیا گیا جس کے پاس جدید ترین بحری سامان جنگ موجود ہیں۔ ہوائی حملوں سے بچنے کے لئے ملک کی ضرورت کے مطابق ایران نے ہوائی بیڑے بھی تیار کر لئے ہیں جو ایرانی ہوا بازوں کی نگرانی میں نہایت مستعدی اور دلیری کے ساتھ اپنی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ جنگ چھڑنے سے پہلے ہی ایران کے پاس تقریباً پانچ لاکھ باضابطہ اور مسلح فوج موجود تھی جس کی دیکھ بھال خود رضا شاہ پہلوی کیا کرتے ہیں۔

Marfat.com

تعلیم | احمد شاہ قاچاری سابق شہنشاہ ایران کے دورِ حکومت میں ملک میں عام جہالت کا دور دورہ تھا۔ ملک کے باشندوں کو تعلیم حاصل کرنے کا نہ خود شوق تھا اور نہ حکومت کو اس کا خیال تھا۔ حکومت کے مختلف شعبوں میں غیر ملکی تعلیمیافتہ اشخاص کثرت سے کام کر رہے تھے اور ملک کے باشندے جہالت کے باعث نانِ شبینہ کے محتاج تھے۔ ملک کی تجارت، صنعت و حرفت ہنر غرضیکہ ہر چیز پر بدیسیوں کا تسلط تھا کیونکہ وہ لوگ تعلیمیافتہ تھے۔ اور ایرانی تعلیم سے نابلد تھے۔ ملک میں جہالت اس شدت کے ساتھ کارفرما تھی کہ یہاں محض دو ایک اسکول کالج کھولنے سے ملک کی عام جہالت ہرگز دور نہ ہو سکتی تھی اسلئے رضا شاہ پہلوی نے ایک مکمل اسکیم کے ذریعہ ملک میں عام تعلیم رائج کی۔ ابتدائی تعلیم ہر مرد اور عورت کے لئے جبری اور لازمی قرار دی گئی۔ اور مزدور پیشہ لوگوں کی ابتدائی تعلیم کے لئے ہر شہر اور قصبے میں شبینہ مدرسے قایم کئے گئے۔ اس کے علاوہ ملک کے مختلف مقامات پر حکومت کی جانب سے متعدد اسکول اور کالج قایم کئے گئے۔ جب ان سے بھی ملک کی ضرورت پوری ہوتی نظر نہ آئی تو حکومت نے ایرانی نوجوانوں کو وظیفے دیکر یورپ کے مختلف ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کیلئے بھیجا۔ ایرانی طالبعلم ہر سال کثیر تعداد میں حکومت سے وظیفے لیکر مختلف ممالک میں مختلف علوم و فنون سیکھنے جایا کرتے ہیں۔ موجودہ جنگ شروع ہونے سے پیشتر ایران کے تقریباً پندرہ سو طلبا جن میں لڑکیاں بھی شامل ہیں یورپ کے مختلف ممالک میں مختلف قسم کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ آج ایران کے ۲۴ صوبوں میں مرد اور عورت یکساں طور پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

۱۹۲۱ء میں ایران میں ۶۲۱۔ اسکول تھے۔ جن میں ۵۵ ہزار طلبا تعلیم پا رہے تھے۔ لیکن اسکولوں کی تعداد اب تقریباً ۵ ہزار تک پہونچ چکی ہے اور طلبہ کی تعداد ۲۷۵۶۸۰ ہے۔ ان اسکولوں میں ہر قسم کی جدید تعلیم دیجاتی ہے۔

عام تعلیم کے ساتھ حکومت کی طرف سے جسمانی تعلیم کا بھی نہایت اعلیٰ انتظام ہے۔ جسمانی ورزش کے لئے ہر جگہ اسکول اور اکھاڑے حکومت کے خرچ سے قایم ہیں۔ جہاں ورزش کے جدید ترین سامان موجود ہیں اور ورزش کی تعلیم کے لئے اساتذہ بھی مقرر کر دئے گئے ہیں۔

ایران میں عام تعلیم رائج کرنے کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ تعلیم کے ذریعے ایرانیوں کے دلوں میں وطن کی محبت کا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ ہر تعلیمیافتہ ایران کی ترقی کا دل سے خواہشمند ہو، اور اپنی خواہش کی تکمیل کی کوشش کرے۔ چنانچہ ایرانی طلبہ کی سب سے پہلی بڑی جماعت کے فرانس روانہ ہونے کے وقت رضا شاہ پہلوی نے طلبہ کو جو پیغام دیا تھا، اُس سے بھی اس مقصد کا پتہ لگتا ہے :-

> "تمہارے پہونچنے سے پیشتر میں تمہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ فرانس ایک ایسا ملک ہے جہاں حُبّ الوطنی کی سب سے زیادہ قدر ہے۔ تمہیں فرانسیسیوں سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ اور جس طرح وہ اپنے ملک سے محبت کرتے ہیں اُسی طرح تمہیں بھی ایران سے محبت کرنا چاہئے۔ مجھے امید ہے کہ فرانس سے واپس آکر تم ایران پر نثار ہونا اپنی زندگی کا مقصدِ اولین اور اپنی تعلیم کا ماحصل تصور کروگے"

قوانین | اس باب میں رضا شاہ پہلوی نے سب سے پہلے سرمایہ داری کے قانون میں اصلاحات کی۔ ملک کے مروجہ قانون کے مطابق غیر ملکیوں کو ایران میں اپنا سرمایہ لگانے سے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ اس آزادی اور ملک کی مالی ابتری سے فائدہ اٹھا کر غیر ملکیوں نے اپنے سرمایہ کا جال ایران کے ہر گوشہ میں بچھا رکھا تھا، اور وہ دن دور نہ تھا جب کہ تجارت، اور صنعت و حرفت پر قابو پانے کے بعد غیر ملکی سرمایہ دار حکومت پر بھی قبضہ جما لیتے۔ چنانچہ اس خطرہ کو محسوس کرتے ہوئے ۱۹۲۸ء میں سرمایہ داری کا قانون پاس کیا گیا، جس کے رو سے غیر ملکی سرمایہ داروں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ اور ملک اس خطرہ سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گیا۔

ضابطہ دیوانی کا نیا قانون پاس کر کے لگان کے اصول متعین کر دئے گئے۔ اور قانون شریعت کو ملک کی ضرورت کے مطابق باضابطہ طور پر ملک میں رائج کیا گیا۔ جنگ عظیم سے پیشتر ایران میں شخصی آزادی کے نام سے بھی لوگ واقف نہ تھے۔ نئے

Marfat.com

تعزیرات ایران نے ملک میں پہلی شخصی آزادی قایم کی اور شہریوں کے حقوق و فرائض بھی متعین کر دئے۔

مختلف تجارتی قوانین پاس کر کے ملک کی تجارت اور صنعت و حرفت کو پستی کے غار سے نکال کر ترقی کی راہ پر لگا دیا گیا، جس پر آج وہ نہایت تیزی کے ساتھ گامزن ہیں۔ تجارتی قوانین نے ملک کی اقتصادی حالت کو بھی درست کر دیا ہے۔

ایران کی مرکزی حکومت کے نیم جان ہونے کے باعث ملک کے اندرونی انتظامات اور بیرونی معاملات پر مہلک اثر پڑ رہا تھا۔ چنانچہ ایک قانون کے ذریعے مرکزی حکومت کے اقتدار کو از سرِ نو قایم کیا گیا۔ اس قانون کی مدد سے ایران کے اندرونی انتظامات بھی درست ہو گئے۔ اور بیرونی ممالک نے بھی ایران کی آزادی اور بڑھتی ہوئی طاقت کو تسلیم کر لیا۔

صنعت و حرفت

ایران میں جنگ عظیم سے پہلے صنعت و حرفت کو ترقی دینے کا خیال بھی موجود نہ تھا۔ اسی فیصدی باشندے کاشتکار ہونے کی وجہ سے زراعت ہی کو آمدنی کا واحد ذریعہ جانتے تھے۔ صنعتیں ملک میں موجود تھیں لیکن حکومت کی عدم توجہی کے باعث ملک کو اُن سے کوئی فائدہ حاصل نہ تھا۔ سابق شاہ ایران کے تخت سے کنارہ کش ہونے کے بعد حکومت نے اس شعبے کی امداد کو بھی اپنا فرض جانا چنانچہ آج ایران میں چالیس نئی فیکٹریاں قایم ہیں جو ملک کے سرمایہ اور ملک کے باشندوں اور حکومت کی امداد کی وجہ سے دن دُونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہیں۔ کپڑے اور روئی کے کارخانے خاص طور پر ترقی پذیر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ روئی کا سب سے بڑا کارخانہ ضلع ماژندران (ایران) میں واقع ہے۔

ریلوے

خلیج ایران سے شروع ہو کر ملک کے انتہائی کناروں تک پھیل چکی ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً دو ہزار کیلومیٹر تک پہونچ چکا ہے۔ اس کے سرمایہ میں کسی غیر ملکی کا کوئی حصہ نہیں ہے اور نہ اس کے نظم و نسق میں کسی غیر ملکی کا ہاتھ ہے۔ ایران کی ریلوے دس سال کی مسلسل محنت کے بعد تیار ہوئی ہے۔ اس کی تیاری پر ایران نے ۲۸۵۰۰۰۰۰ (دو کروڑ پچاسی لاکھ پاؤنڈ) خرچ کئے ہیں۔ اس ریلوے نے سفر کی سہولتیں بہم پہونچانے اور تجارت کو فروغ دینے کے علاوہ ایران کی سیاسیات پر بھی نہایت اچھا اثر ڈالا ہے۔

مالیات

سنہ ۱۹۲۴ء سے ملک کی مالی حالت میں ترقی کے آثار نظر آنے لگے۔ سالانہ بجٹ کی ترتیب و تشکیل اس انداز سے کی گئی کہ روزانہ کے ضروری اخراجات کے علاوہ مختلف شعبوں کی ترقی و توسیع کے کثیر اخراجات بھی ملک کی آمدنی سے پورے ہو جاتے ہیں بلکہ ۱۹۲۲ء سے ملک کی آمدنی میں اضافہ شروع ہوا اور آج اضافہ ۲۵ فیصدی تک پہونچ چکا ہے۔

ایران کی موجودہ آمدنی تقریباً ۱۵۲۷۵۱۸۰۰۰ (ایک ارب ۵۲ کروڑ ۷۵ لاکھ اٹھارہ ہزار) رائل ہے۔ ۸۰ رائل کا ایک پونڈ ہوتا ہے یعنی ۲۷ کروڑ روپے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ ایران کی موجودہ ترقی رضا شاہ پہلوی کی علو ہمتی، روشن خیالی اور تدبر کی مرہونِ منت ہے۔ اور بجز رضا شاہ کوئی دوسرا شخص اُس کا مستحق نہیں ہے۔ لیکن یہ خیال جتنا عالمگیر ہے اتنا ہی غیر معتبر بھی ہے۔ رضا شاہ پہلوی ایران میں اصلاحات کے رائج کرنے کے موجد نہیں بلکہ متبع ہیں۔ درحقیقت ایران اگر رضا شاہ پہلوی کا مرہونِ منت ہے تو کمال اتاترک کا بھی ممنونِ احسان ہے کیونکہ رضا شاہ پہلوی نے ایران میں جتنے اصلاحات جاری کئے وہ اتاترک کے کارناموں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اتاترک کے کارنامے ان کی زندگی کے لئے نمونہ ثابت ہوئے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ رضا شاہ نے جو کچھ سیکھا وہ کمال اتاترک سے سیکھا۔ آج ایرانی زندگی کے ہر شعبے میں اتاترک کے کارناموں کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ تہذیب۔ معاشرت۔ سیاست غرضکہ ہر شے میں کمالی ترکی کا گہرا رنگ نظر آتا ہے۔ طہران اور انقرہ میں مشابہت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ تمیز کرنا دشوار نظر آتا ہے۔

ایران کی موجودہ ترقی کے میدان میں مردوں کے پہلو بہ پہلو عورتیں بھی سرگرم عمل ہیں۔ یہ مخلوط طریق عمل ایران کی آیندہ ترقیوں کے لئے ایک فالِ نیک ہے۔ طبقہ نسواں کی بیداری آیندہ نسلوں کی بیدار مغزی کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں ایران ترقی کے آخری زینے طے کر کے اپنے ہمسایوں کے مدمقابل ہو جائے گا۔

دستوری اصلاحات

ایران کے دستوری اصلاحات کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ موجودہ دستور ایران کے مطابق ایران کا بادشاہ صرف پہلوی خاندان کا رکن ہو سکتا ہے۔ ایران کی بادشاہت موروثی ہے۔ بادشاہ کا بڑا بیٹا ولی عہد سلطنت

Marfat.com

دنا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ایرانی ماں کی بطن سے پیدا ہوا ہو۔ اگر بادشاہ کی کوئی اولاد نرینہ نہ ہو تو ولی عہد کا انتخاب بادشاہ کی نامزدگی کے مطابق نیشنل اسمبلی کیا کرتی ہے۔ ہر بادشاہ کو تاجپوشی کے وقت قرآن ہاتھ میں لیکر یہ حلف اٹھانا پڑتا ہے کہ وہ اپنے دور حکومت میں ایران کی آزادی کو برقرار رکھے گا اور دستور کی پابندی کرتے ہوئے مذہب کی حفاظت اور ملک کی فلاح و بہبود کے لئے ہر ممکن کوشش کو عمل میں لائے گا۔ بادشاہ کے اختیارات لامحدود ہیں اور دستور کے مطابق "ایران کا بادشاہ کسی جرم کا ذمہ وار قرار نہیں دیا جا سکتا ہے"

بادشاہ ایران کو ایران کی بحری، بری اور ہوائی فوجوں کا سالار اعظم تصور کیا جاتا ہے۔ اس کا ہر حکم واجب التسلیم ہے اور اس کے اختیارات کا استعمال اُس کی مرضی پر موقوف ہے۔

بادشاہ کے علاوہ امور سلطنت کی انجام دہی کے لئے وزراء کا تقرر بھی لازمی ہے۔ وزراء کی تقرری بادشاہ خود کرتا ہے۔ لیکن ہر وزیر کا مسلمان اور ایرانی النسل ہونا لازمی ہے۔ ہر وزیر اپنے شعبے کے انتظامات کا ذمہ دار ہے۔ اور نیشنل اسمبلی کو اختیار حاصل ہے کہ وہ عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر کے کسی ایک وزیر یا تمام وزراء کو مستعفی ہونے پر مجبور کر دے۔ عدم اعتماد کے ووٹ کے علاوہ اسمبلی کو وزراء پر مقدمہ چلانے کا بھی اختیار حاصل ہے۔ لیکن ایسے مقدموں کی سماعت عام عدالتوں میں نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۲۶ء تک ۸ وزراء اور ۳ نائب سکریٹری پر مشتمل ایک کابینہ تھی۔ لیکن اب کابینہ میں ۱۲ وزراء ہیں۔ وزیر اعظم کا انتخاب رضا شاہ پہلوی کیا کرتے ہیں۔ اور دیگر وزراء کو وزیر اعظم منتخب کرتا ہے۔ ہر وزیر کے ذمہ ایک علیحدہ شعبہ ہے۔ جس کے نظم و نسق کا وہ خود ذمہ دار ہے، اور نیشنل اسمبلی بھی اس کو اپنے شعبے کا جوابدہ تصور کرتی ہے۔

دفتر خارجہ کے مختلف شعبے ہیں۔ پہلا شعبہ اسلامی ممالک مثلاً ترکی۔ افغانستان۔ عراق، مصر، اور حجاز کے تعلقات کا ذمہ دار ہے۔ دوسرا شعبہ روس۔ پولینڈ۔ اور بلقان کے معاملات سے متعلق ہے۔ اور تیسرا شعبہ یورپ۔ ایشیا اور امریکہ کے معاملات کا ذمہ دار ہے۔

دستور کے مطابق ایران میں دو ایوانوں کا قیام ممکن ہے لیکن ملک کی ضروریات کے لحاظ سے ایک ایوان ہے جسے نیشنل اسمبلی کہتے ہیں۔ اس کے اراکین کی تعداد فی الحال ۱۳۶ ہے۔ لیکن بوقت ضرورت ۲۰۰ تک ہو سکتی ہے۔ اسمبلی کی میعاد حیات صرف دو سال ہے۔ ۳۰ سال سے ۷۰ سال تک کی عمر والے اسمبلی کے رکن منتخب ہو سکتے ہیں۔ اسمبلی کے اختیارات بہت وسیع ہیں۔ نئے قوانین کا پاس کرنا اور پرانے قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنا اسمبلی کے اختیارات خصوصی میں شامل ہیں۔ ملک کی آمدنی و اخراجات کا سالانہ بجٹ اسمبلی میں پیش ہونا لازمی ہے۔ ملک کی آمدنی کا کوئی حصہ اسمبلی کی منظوری کے بغیر خرچ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

ایران میں جمہوریت صحیح معنوں میں رائج ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بادشاہ کے اختیارات بھی نامحدود ہیں۔ ایران کی اصلاحات ترکی کی اصلاحات کی تصویر ہیں لیکن ایران کے دستور اساسی میں برطانیہ کے دستور اساسی کی روح کارفرما ہے۔

ایران میں مسلمانوں کی آبادی اس وقت تقریباً ۱۵۰۰۰۰۰۰ (ایک کروڑ پچاس لاکھ) ہے۔ اور ترکی کی مانند ایران نے بھی مذہبی رسومات کی قیود و بند سے آزادی حاصل کر لی ہے۔ لیکن اسلامیت پردہ برقرار ہے۔ اور یہی موجب شکر ہے۔

مدینہ۔ ستمبر ۱۹۳۰ء

Marfat.com

وہ بادشاہ جو بیک وقت عاشق اور جرنیل ہے

رضا شاہ پہلوی کی داستانِ محبت

مشاہیر عالم کے سوانح حیات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عشق و محبت کا لطیف جذبہ انکی کامیاب زندگی کا ایک ضروری جزو بنا رہا ہے۔ دنیا نپولین کے کارناموں کے ساتھ اس واقعہ کو کبھی نہیں فراموش کر سکتی کہ یورپ کا یہ فولادی انسان اپنی بے نظیر قوت ارادی کی حلاوت کے باوجود سینٹ ہیلینا میں جوزیفائن کے پیکر تصور کے آگے سر نیاز خم کئے نظر آتا تھا۔ دنیا کا دوسرا نپولین مصطفےٰ کمال سیاسی مصالح کی بنا پر لطیفہ خانم کو نظروں سے دور کر دینے پر مجبور ہوتا ہے لیکن درہ دانیال سے اتحادیوں کی جرمن شکن فوجوں کو پسپا کر کے بھگا دینے والا انسان لطیفہ کے عشق کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتا۔ ثریا بیگم کے معاملہ میں مغربی خبر رساں ایجنسیوں کا پروپگنڈا اور ملاؤں کی شرارت امان اللہ کے دل میں ثریا کی طرف سے کوئی بدظنی نہیں پیدا کرتی، افغانستان کو آزاد کرانے والا انسان افغانستان کے تخت پر لات مار کر ثریا کے دامن رفاقت میں پناہ لیتا ہے۔

دنیا کے جس مشہور آدمی کی زندگی میں تلاش کرو گے تمہیں عشق و محبت کے ایسے واقعات ضرور مل جائیں گے جو اُسکے کارنامہ میں ایک اہم باب کی حیثیت رکھتے ہونگے۔

آج دنیا رضا خاں پہلوی کو صرف ایران کا بادشاہ، ایران کا منجی، ایران کا صحیح ڈکٹیٹر جانتی ہے لیکن کم لوگوں کو علم ہوگا کہ ایران کے اس منجی کے پہلو میں ایک ایسا دل ہے جس میں ایک طرف عزم و ارادہ، ہمت و شجاعت اور ایران کو فاروقی ایران بنا دینے کے تمام ذرائع بدرجہ اتم موجود ہیں، اور دوسری طرف عشق و محبت کا نہ مغلوب ہونے والا جذبہ لہریں مار رہا ہے۔

رضا خاں غریب والدین کی اولاد ہے اس نے ابتدائی عمر کسانوں میں گزاری ہے، افلاس و غربت نے اس کو خاطر خواہ تعلیم سے محروم کر کے فوج میں بھرتی کرا دیا۔ رضا خاں نوجوان اور بہادر تھا۔ وہ ایک عرصہ تک ایرانی کاسک فوجی دستہ میں معمولی سپاہی کی حیثیت سے کام کرتا

Marfat.com

رضا خاں کے پہلو میں فطرت سے شریف اور محبت آگیں دل ودیعت ہوا تھا - وہ ابھی کاسک رجمنٹ میں ملازم تھا کہ اسکی آنکھیں ایک دہقانی دوشیزہ سے لڑ گئیں 'کیوپڈ' کا زرین تیر دونوں کے دلوں سے پار ہو گیا اور طرفین سے محبت کی پینگیں بڑھنے لگیں' جس کا نتیجہ باہمی شادی کی صورت میں ظاہر ہوا - محبت میں جدائی لازمی جزو ہے اور قاعدہ ہے کہ یہ جدائی محبت کے عہد وصال سے پہلے اپنی صورت دکھاتی ہے - لیکن رضا خاں کوئی معمولی انسان نہ تھا کہ یہ معمولی قاعدہ اس پر منطبق ہوتا' مفارقت نے اپنی صورت دکھائی' لیکن کب؟ جبکہ محبت کا منتہائے نظر وصال' حاصل ہو چکا تھا' شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد رضا خاں کی دہقانی محبوبہ اسکو داغ مفارقت دیکر عالم باقی کی طرف کوچ کر گئی ، رضا خاں کو اس کا سخت صدمہ ہوا' اسکا دل ہل گیا لیکن امتداد زمانہ نے رضا خاں کے دل سے مرحومہ کی یاد بھلا کر اسکی توجہ دوسری طرف مبذول کرادی اور رضا خاں کو "دل بازی" کا ایک دوسرا مشغلہ پھر ہاتھ آگیا -

اب کے اس نے اپنے ایک اعلیٰ افسر کی حسین و تعلیم یافتہ دختر بلند اختر سے شادی کرلی' نئی شادی کے بعد رضا خاں کو وہ تمام مسرتیں پھر حاصل ہو گئیں جو دہقانی محبوبہ کی مفارقت سے مفقود ہو چکی تھیں ، رضا خاں کو یہ شادی بہت زیادہ راس آئی - وہ نئی محبوبہ کی رفاقت میں نہایت مسرت و ترقی کی زندگی گزارنے لگا - یہ خاتون رضا خاں کے لئے بیحد نیک نہاد اور وفادار ثابت ہوئی ، رضا خاں کے فتوحات میں اس کا بھی نمایاں ہاتھ نظر آتا ہے - آج یہی بیدار مغز' خاتون "ملکہ پہلوی" کہلانے کا شرف رکھتی ہے ملکہ پہلوی سے کئی اولادیں ہوئیں ان میں سب سے بڑی ایک لڑکی ہے جس کی عمر ۲۲ سال کی ہے' ولیعہد حکومت بھی جس کی عمر ۱۶ سال ہے اسی روشن دماغ خاتون کے بطن سے ہے - ملکہ پہلوی کا عالیشان محل شاہ پہلوی کے کوشک سے کسی قدر دور ہے' شاہ ایران اس محل میں روز حاضری دیتا ہے -

رضا خاں جب معمولی عہدوں سے ترقی پاکر وزیر جنگ بن گیا تو اس نے اپنی چہیتی بیوی کی رضامندی سے پھر ایک شاہی خاندان کی لڑکی سے شادی کرلی' لیکن یہ شادی نامبارک ثابت ہوئی اور رضا خاں کئی سال کے بعد اپنی منکوحہ کو طلاق دیدینے پر مجبور ہوا - رضا خاں کا اقبال عروج پر تھا - ایران کے ہر ذرے نے اس کا ساتھ دیا - وہ وزیر جنگ سے ایران کا بادشاہ بن گیا - عمر کی زیادتی کے ساتھ محبت کا جذبہ سرد نہیں ہوا - "تخت طاؤس" حاصل کرنے کے بعد ہی اس کے بحر قسمتی میں ایک "تلاطم" آیا اور وہ ایک حسین و جمیل دوشیزہ کو دل دے بیٹھا' ملکہ پہلوی نے بھی بہادر شوہر کے بڑھتے ہوئے جذبات کو دیکھتے ہوئے دوشیزہ حسینہ کے ساتھ شادی پر خوشنودی ظاہر کرکے اپنی بیدار مغزی اور وفا شعاری کا ثبوت دیا - شاہ ایران نے آئین شریعت کے مطابق حسینہ سے شادی کرلی -

یہی حسینہ اب "ملکہ ایران" کہلاتی ہے' اسکی عمر اسوقت ۲۶ سال کی ہے' یعنی اسکی عمر شاہ ایران کی بڑی لڑکی سے کچھ سال کم ہے - شاہ ایران اس بیوی کیساتھ

Marfat.com

نہایت محبت و مسرت کی زندگی گزار رہا ہے اور اسے اپنے خاص محل "قصر پہلوی" میں جگہ دے۔ "ملکہ ایران" کی موجودگی سے "ملکہ پہلوی" کے اعزاز و مراتب میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دونوں میں نہ صرف بہترین تعلقات قائم ہیں بلکہ، "ملکہ ایران" "ملکہ پہلوی" کا احترام کرتی ہے، اور شاہ پہلوی بھی ملکہ پہلوی کا بہت زیادہ لحاظ و پاس خاطر کرتا ہے۔

شاہ پہلوی کی عمر ۵۶ سال کے قریب ہے، ایران اسکی قیادت و حکومت میں نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ ایران سے غیر ملکی اقتدار کا جنازہ نکل چکا ہے، قدامت پرستی کی سڑی لاشیں ہمیشہ کے لئے دفن کردیجا چکی ہیں، اور ایران اب وہ ایران نظر آرہا ہے جس کا خواب فردوسی نے دیکھا تھا۔

ثاقب عظیم آبادی

دسمبر ۱۹۳۳ء

Marfat.com

تلخیص و تبصرہ

ٹیونس کی کشمکش

از

جناب پروفیسر محمد مسلم صاحب ہزاری باغ

۹ر اپریل گذشتہ کو ٹیونس میں سخت بلوہ ہوا ایک فرانسیسی پولیس افسر مقتول ہوا دو فوجی قانون نافذ کر دیا گیا ۱۰ اپریل کو ایک اطالوی اخبار "تیویر" میں ایک اہل قلم الیز ابتھ مونرو کا ایک معنی خیز مقالہ شائع ہوا اس کی تلخیص ٹیونس کی موجودہ کشمکش کے سمجھنے کے لیے بصیرت افروز ہوگی۔ اس میں اس نے فرانس کو متنبہ کیا ہے کہ تیونیشیا کے اشتراکی بلوے بحیرہ روم کے توازن کے لیے ویسے ہی خطرناک ہیں جیسے سرخ (اشتراکی) اسپین کے۔ اس نے توجہ دلائی ہے کہ تیونیشیا میں اطالوی باشندوں کی کثرت تعداد کا لحاظ کر کے اٹلی تیونیشیا کے امن و اماں کے معاملہ سے براہ راست سروکار رکھتا ہے۔

اطالوی اخبارات فسطائیت (فیسزم) کی مدح سرائی و قصیدہ خوانی کا موقع حاصل کرنے کے لیے کسی پر بوچھار کرنے کی فکر میں رہتے ہیں چنانچہ آج کل فرانس کے درپے ہیں۔ تیویر کا یہ مقالہ اٹلی کے عام خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔ فرانس کے پے در پے ہڑتالوں اور آئے دن وزارتوں کی تغیر و تخریب، شکست و بست کی خبروں سے اکثر اطالوی کہا کرتے ہیں کہ فرانس دم توڑ رہا ہے اور وہ وقت قریب ہے کہ اس کے مقبوضات بیما سے انھیں کا فی معقول جائے گا

یہ دونوں خبریں ایک تیونیشیا کے بلوے اور اطالوی اخبار کا مقالہ سوال یہ پیدا کرتی ہیں کیا یہ فسادات تیونیشیا میں ایسی صورت حال پر دلالت کرتے ہیں جس سے اٹلی اپنا کام نکال سکے؟

تیونسی بلوائی بلووں کے موقع پر جو نعرے لگاتے تھے ان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کی بے چینی کے اسباب کچھ نئے نہیں، مثلاً "ملک قومی اور دستوری حکومت چاہتا ہے"، "اہل ٹیونس اختیارات و حقوق کے طلبگار ہیں"۔ قریب قریب انہی جذبات میں مصر نے اہل مصر و شام کو بلووں پر تحرک کیا اور وہ اپنے مطالبہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تیونیشیا میں یہ کوئی نئی حرکت نہیں۔ تیونسی جماعت اعتدال پسند جسے دستورینا کہتے ہیں گذشتہ دس سال سے اس کا اظہار کر رہی ہے۔ یہ اسی تحریک آزادی کا ظہور ہے جو مراکش سے خلیج فارس تک

Marfat.com

(باشندئے الجیریا) تمام اسلامی دنیا میں موجزن ہے

شمالی افریقہ کے تینوں فرانسیسی مقبوضات میں تیونیشیا پر قابو رکھنا سب سے زیادہ سہل ہے، اس لیے کہ اس کی آبادی[1] سب میں کم ہے سب میں گنجان ہے، منتشر نہیں، اور طاقت کے استعمال سے جلد سر ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی بعض اسباب سے جو الجیریا اور مراکش میں مفقود ہیں یہ سب سے زیادہ طوفانی ہے

اولاً اس کا رخ مشرق کی طرف ہے، گو نقشہ پر نظر کرنے سے ایک ناواقف سمجھیگا کہ یہ بحیرہ روم کے مغرب ہے حالانکہ مشرق میں ہے۔ اہل تیونیشیا اپنے ہمسایہ الجیریا کی سیاست پر نظر رکھنے کے عوض مصر کی جنبشوں پر گوش بر آواز رہتے ہیں۔ وہ مصری اخبارات پڑھتے، قاہرہ سے لاسلکی رشتہ جوڑتے اور ان مشرقی جنبشوں اور ہیجانوں سے متاثر ہوتے رہتے ہیں جن کا وجود نہ الجیریا میں ہوتا ہے نہ مراکش میں۔ شہر تیونس میں تعلیم یافتہ طبقہ کی ایک کثیر تعداد ہے جو قاہرہ والوں سے کم مہذب و تعلیم یافتہ نہیں اور اس طبقہ کو یقین ہے کہ تیونیشیا شام و عراق سے زیادہ حکومت خود اختیاری کے لیے تیار و حقدار ہے۔ اس لیے وہ ایک معاہدہ کے لیے مُصر ہے اگرچہ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ فرانس اس کے سیاسی محل و موقع کے سبب سے شام کی طرح مراعات دینے کو مشکل سے آمادہ ہوگا۔ اسے یقین ہے بسیرطہ (تیونیشیا کے بندرگاہ) پر سے اپنا قبضہ اٹھا نہیں سکتا۔

ان مشرقی تاثرات پر مقامی خصوصیات بھی کارفرما ہیں۔ وہاں مثل مشہور ہے "مراکشی شیر ہوتا ہے، الجیری مرد اور تیونسی عورت"۔ تیونسی اپنا زنانہ پن زیادہ تر تیز زبانی سے دکھاتے ہیں۔ وہ اپنی ذہانت فریاد و فغاں پر صرف کرتے ہیں جس میں وہ بڑے ماہر ہیں۔ وہ کوئی تعمیری خیال نہیں پیش کیا کرتے۔ ان کا دماغ صرف بے چینی اور اظہار غم میں کمال دکھاتا ہے ---- بہرحال ان کی شکایات بے بنیاد نہیں۔ فرانسیسیوں کو اقرار کرنا پڑیگا کہ ان کے شاہی مقبوضات یا نوآبادیوں میں تیونیشیا سب سے سیاہ دھبہ ہے اور یہ کہ ان کی سب سے بڑی غلطی تیونیسیوں کو اس پیمانہ پر تعلیم دے دینا ہے کہ وہ سرکاری عہدوں کے قابل ہو گئے ہیں مگر ایسے تمام عہدے صرف فرانسیسیوں سے معمور کئے جاتے ہیں۔ پھر ایک ہی سی خدمات و فرائض کے لیے خواہ وہ ٹرام کی ڈرائیوری اور منشی، سپاہی گیری کیوں نہ ہو فرانسیسی کو تیونیسی سے بہت زیادہ تنخواہ دی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ایک تیونیسی جو ایک فرانسیسی کے ساتھ تعلیم پاتا اور ایک ہی امتحان، ایک ہی درجہ میں پاس کرتا ہے اخباروں میں چیخ اٹھتا ہے اور مظاہروں میں اشتہاری تختوں پر اعلان کرتا ہے "حقوق کی پامالی بے انصافی!"

پھر فرانس کی ہر تبدیل وزارت کے ساتھ پالیسی کا تغیر کم پریشان کن نہیں ہوتا۔ گذشتہ تیس سال میں تیونیشیا نے عجیب عجیب انقلابی نیرنگیوں کا مشاہدہ کیا ہے۔ کبھی (موسیو پیروتن کے دور میں) دستوریئین کے اخبارات بند کئے گئے اور ان کے لیڈروں کو صحارا میں جلاوطن کیا گیا اور کبھی (ایم گیلوں کے دور میں) ان کی تالیف قلوب کی گئی۔ موسیو نود جاہل عرب ہڑتالیوں کے پاس جا جا کر انہیں یوں تلقین کرتے جیسے وہ پیرس کے مزدور ہوں۔ اس پستی و بلندی سے ان کے دماغ کا مختل ہو جانا حیرت کی بات نہیں۔

---

[1] تیونس کی مجموعی آبادی بائیس لاکھ ہے۔ اس میں بربر، عرب اور ترک شامل ہیں یورپی آبادی پونے دو لاکھ ہے جس میں صرف اطالوی ایک لاکھ کے لگ بھگ ہیں ان کی صحیح تعداد پچانوے ہزار کے قریب ہے۔ "مسلم"

Marfat.com

یومیسیا میں پچانوے ہزار اطالویوں کی موجودگی فرانس کی سیاسی گتھیوں میں ایک مزید گرہ ہے۔ مگر اس سے مسلمانوں کے ساتھ اس کے طرزِ عمل میں کوئی دشواری نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ اس سے وہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ کیونکہ اگر چہ فرانسیسی اکثر اطالوی نفتہ انگیزوں پر عوام مسلم کے بھڑکانے کا الزام رکھتے ہیں، تصویر کا ایک رخ اور ہے۔ مسلمان اگر فرانسیسی حکومت سے نفرت رکھتے ہیں تو اطالوی اقتدار سے عداوت۔ وہ حکومت خود اختیاری کا مطالبہ ضرور کرتے ہیں مگر وہ اسے فرانسیسی حکومت کے زیر پناہ چاہتے ہیں۔ بجز اس کے کبھی وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہوں، جیسا کہ آج کل ہو رہے ہیں، تو فرانسیسی حکومت سے پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ اعتدالِ ہوش و حواس میں وہ صاف محسوس کرتے ہیں کہ وہ کسی قسم کی حکومت تنہا سنبھالنے کی قوت نہیں رکھتے اور فرانس کے سایہ کو اٹلی کے پنجہ سے کمتر عذاب سمجھتے ہیں۔

وہ کسی طرح فرانس کے مقابلہ میں اطالویوں سے اتحاد و اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے۔ دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ حکومتِ فرانس کا میسرہ (حریت پرور طبقہ) میمنہ (حامیانِ حکومت) کے مقابلہ میں ان کے ساتھ ہمدردی کا سلوک کرتا رہا ہے۔ اس لیے وہ ہمیشہ حریت پرور جماعت کے اقتدار کے منتظر و امیدوار رہا کئے ہیں۔ دوسرا سبب بھی ویسا ہی قوی ہے۔ لیبیا کے حالات سے وہ باخبر رہے ہیں۔ ان کو علم ہے کہ اٹلی اپنی نوآبادیوں پر آہنی ہاتھوں سے فرمانروائی کرتا ہے بربریکا کو سر کرنے کے لیے جو ذرائع اس نے استعمال کئے ہیں ان کو بھی یہ بھولے نہیں ہیں۔ گزشتہ موسم بہار میں ٹرام میں ایک پرجوش جماعت سیاسیات پر بحث کر رہی تھی۔ یکایک عربی گفتگو کے درمیان میں فرانسیسی نعرہ بلند ہوا "فرانس زندہ باد!" میں نے اس جوش کا سبب دریافت کیا۔ جواب ملا کہ یہ نعرہ زن جوان کسی ضرورت سے لیبیا گیا ہوا تھا اور ابھی لوٹ کر آیا ہے۔

ٹیونسی حریت خواہ آج کل اٹلی کو موقع دینا چاہ رہے ہیں مگر یہ وقتی موج اور جوش کا نتیجہ ہے، غداری نہیں۔ فی الحال دستوریئین فرانس سے حقوق حاصل کرنے میں تشدد کے استعمال کے مسئلہ پر دو فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ سڑکوں کا موجودہ مظاہرہ و ہنگامہ و فساد متشدد فرقے کا فعل ہے اور جوں ہی اٹلی نے ان پر نگاہِ کرم ڈالی یہ ہاتھ ملنے لگیں گے۔

اخبار تیوپر کا الزام مندرجہ بالا بالکل بے بنیاد نہیں۔ بعض دستوری صاف صاف اشتراکیت کا اعلان کرتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ مغربی جماعتوں اور فرقوں کے سیاسی عقائد و تعلیم شمالی افریقہ کے مسلمانوں میں کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کمیونزم (اشتراکیت)، فیسزم (فسطائیت) یا کوئی "ازم" بھی محض پردہ یا نقاب ہے۔ جہاں کسی ملکی حق کا سوال پیدا ہوا یہ نقاب اتر جاتا ہے اور وہ مغرب کے مقابلہ میں خالص عرب، پیروِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم بن جاتے ہیں خواہ حریف فرانس ہو یا اٹلی یا دونوں۔

یکم جون سنہ

تلخیصات

موجودہ جنگ کا اہم محاذ — جبرالٹر

اور

اُسکی سرگذشت

از جناب مظفر گیلانی

تازہ خبر ہے۔ جرمنوں نے حکومت اسپین پر دباؤ ڈالنا شروع کیا ہے کہ وہ محوری دول میں شریک ہو جائے۔ اور جرمن فوج کو اپنے ملک سے گذرنے کی اجازت دے تاکہ جبرالٹر پر حملہ کیا جائے۔ جرمنوں کو احساس ہو گیا ہے کہ اب وہ وقت آگیا ہے کہ بحر متوسط کے اس دروازہ کو بند کر دیا جائے تاکہ برطانیہ کے جنوبی افریقہ و جنوبی امریکہ کے سلسلہ رسل و رسائل پر طیاروں اور آبدوز کشتیوں کے اڈے قائم کئے جائیں۔ برطانوی بیڑے کو مغربی متوسط سے نکال دیا جائے۔ اور لڑائی کے اصلی میدان مصر کو آسانی سے سر کیا جائے۔ دوسری طرف جبرالٹر کے دفاعی انتظامات میں ابھی حال میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ نو فٹ چوڑا اور بارہ فٹ گہرا ایک بند بنایا گیا ہے۔ جو جبرالٹر کے پورے شمالی علاقہ میں پھیلا ہوا ہے چٹانوں کے نیچے ایسی پناہ گاہیں تیار کی گئی ہیں جو سطح سمندر سے بھی نیچی ہیں توپخانہ اور طیارہ شکن توپوں میں غیر معمولی اضافہ کیا گیا ہے۔ اور کوئی روز ایسا نہیں گذرتا جس روز سامان جنگ اور سامان خوراک کا بڑا ذخیرہ یہاں نہ آتا ہو۔ جبرالٹر بحر متوسط کی کنجی ہے، گمان ہے کہ آیندہ چند دنوں میں یہاں سب سے بڑی لڑائی ہوگی۔ اور عجب کیا کہ اس پر اس جنگ کے فیصلہ کا بہت کچھ دارومدار ہو۔

امید ہے ذیل میں جبرالٹر کے یہ مختصر حالات دلچسپی سے پڑھے جائیں گے ——— (ندیم)

جبرالٹر کی عظیم الشان پہاڑیاں ایک نہایت ہی غیر رومانی انسان کے لئے بھی اپنے اندر ایک خاص کشش

Marfat.com

رکھتی ہیں۔ جن کے ہر نظارے میں گذرے ہوئے بہادروں کی ہزاروں جانفشانیاں بیدار نظر آتی ہیں۔ کیونکہ صرف یہی نہیں کہ اس کی تاریخ گذشتہ محاصروں اور جنگی کارناموں نے دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے۔ بلکہ نزدیک ہی خلیج ٹرافلگر بھی ہے جہاں انگریزوں نے اپنی پوری بحری قوت خرچ کر کے فرانسیسیوں کے خلاف عظیم الشان فتح حاصل کی تھی۔

زمانہ قدیم میں جبرالٹر کو مونس کالپ (MONS CALPE) کہتے تھے جو ابھی تک کالپ ہنٹ (CALPE HUNT) کی اصطلاح میں رائج ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس خاص قسم کے شکار کا موجد ولنگٹن ہے جس نے بہت سے شکاری کتے انگلینڈ سے .... لاکر اس خاص قسم کے شکار کو ایجاد کیا اور چونکہ یہ ایجاد مونس کالپ میں ہوئی تھی اسلئے کالپ ہنٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔

ان پہاڑیوں پر پہلے پہل مسلمانوں نے ۷۱۱ء میں طارق ابن سعید[1] کی ماتحتی میں قبضہ کیا اور اسکا نام جبل الطارق رکھا جو اب موجودہ جبرالٹر کی شکل میں تبدیل ہو گیا ہے[2]۔ اس کے بعد اسکا محاصرہ سب سے پہلے سپین والوں نے ۱۳۰۹ء میں کیا۔ اور مسلمانوں کو شکست دے کر اپنے قبضہ میں کر لیا اس کے بعد سے اس کے گیارہ محاصرے ہوئے یہاں تک کہ ۱۷۰۴ء میں سر جارج روک ( ) نے اس کو انگریز اور ڈچ سپاہیوں کی متحدہ مدد سے تین روز کے محاصرہ کے بعد اپنے قبضہ میں کر لیا۔ ۱۷۱۳ء میں جبرالٹر کلیتہً انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا لیکن اس کے ساٹھ برس کے بعد اس کا آخری اور سب سے بڑا محاصرہ ہوا جسے فرانس اور اسپین کی ایک زبردست متحدہ فوج نے کیا۔ لیکن برطانوی سپاہیوں نے جو اس کی حفاظت کر رہے تھے اور جن کی تعداد حملہ آوروں کے مقابلہ میں بہت ہی کم تھی۔ بڑی جانفشانی اور بہادری سے مقابلہ کیا اور آخر کار دشمنوں کو شکست دی۔ اس وقت سے جبرالٹر انگریزوں کے لازوال قبضہ میں ہے۔

جبرالٹر کا موجودہ سامان مدافعت بڑی بڑی جنگی بندوقوں اور توپوں سے کیا گیا ہے۔ ان جنگی اسلحوں کو پہاڑ کی چوٹی پر لیجانا آسان کام نہ تھا۔ سڑکیں جو پہاڑ کی چوٹی تک بڑی مشکل سے بنائی گئی ہیں۔ نہایت تنگ ڈھلوان ہیں۔ ہر ہر قدم پر موڑ ہیں جنہوں نے راستہ کو اور بھی مخدوش بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت برطانیہ نے اس ڈرائیور کو جس نے ان جنگی اسلحوں کو لاری کے ذریعہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں تک پہنچایا۔ O.B.E کے خطاب سے سرفراز کیا۔

جبرالٹر کی دوسری قابل دید چیز وہاں کے "آب رسانی کا محکمہ" ہے۔ پہاڑ کی مشرقی جانب ۸ ½ ... ایکڑ زمین کو لوہے اور سیمنٹ کے ذریعہ ایک بہت بڑے پانی کے خزانہ کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جہاں ایک انچ بارش ہونے سے (.....) ساٹھ لاکھ گیلن پانی جمع ہو جاتا ہے۔ یہ زمین ایک نہایت ہی ڈھلوان پہاڑ پر واقع ہے اسلئے پانی کے جمع ہونے میں بہت آسانی ہوتی ہے۔

جبرالٹر کا شہر پہاڑ کی مغربی جانب[1] ہے۔ مکانات عموماً چھت دار اور سمندر کے کنارے بنائے جاتے ہیں۔ اکثر مکانات چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے اوپر بھی واقع ہیں۔ شہر کے بڑے بازار میں ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے۔

---

[1] "ندیم" طارق بن ن... نے جبل الطارق کو جنگی قلعہ کی اہمیت اسلامی عہد میں حاصل ہوئی۔ اس دور میں یہاں عظیم الشان مستحکم قلعے تعمیر کئے گئے عبدالمومن نے اپنے دور حکومت میں اسکا نام جبل الفتح رکھا۔ یہاں محل اور قلعے تعمیر کرائے اور خود کئی ماہ قیام کیا۔ اور ایک شہر آباد کر دیا جو آج تک موجود ہے۔

[2] "ندیم" عبدالمومن نے اسی شہر کو آباد کیا تھا۔

خاصکر "بازار" کے روز تو اتنی بھیڑ ہوتی ہے کہ چلنا دشوار ہوجاتا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ دیہات کے لوگ اسپین سے ترکاریاں، پھل اور پھول وغیرہ فروخت کرنے کثرت سے آتے ہیں۔ اس بازار میں ایک خیالی دنیا میں بسنے والا انسان اپنے کو آسانی سے بمبئی میں تصور کر سکتا ہے۔ کیونکہ اکثر دکانوں کے نام ہندوستانی ہیں۔ چونکہ تجارت پیشہ ہندوستانی وہاں کثرت سے موجود ہیں۔ جو کارچوبی گلکاری اور چکن وغیرہ کا کام کرتے ہیں۔ مشرق کی جانب یہ "بڑا بازار" "یورپ روڈ" سے جاکر مل جاتا ہے۔ جو کہ "یورپ پوائنٹ" کو چلا گیا ہے۔ جہاں سے بحر روم کا ایک خوشنما منظر نظر آتا ہے۔ جبرالٹر کی ایک اور قابل دید چیز وہاں کے (   ) خوبصورت باغات ہیں جنہیں مشرق و مغرب سردی اور گرمی کے پھول یکساں طریقہ سے لگتے ہیں۔ انہیں باغات میں جنرل ایلیٹ (   ) کے نام کی ایک یادگار رکھی ہے جس نے اس عظیم الشان محاصرہ میں جبرالٹر کو بڑی جانفشانی سے دشمنوں کی دسترس سے بچایا تھا۔ نزدیک ہی ٹرافلگر کا قبرستان ہے جس میں اس مشہور محاصرے کے اکثر بہادر سپاہیوں کی قبریں ہیں ——— جبرالٹر کا عجائب خانہ جس کا افتتاح ۱۹۳۰ء میں ہوا تھا ایک بہت ہی قدیم عربی مکان میں قائم ہے۔ یہ عجائب خانہ پرانے زمانہ کے سب سے دلچسپ آثار سے بھرا ہوا ہے اسی عجائب خانہ کے نیچے ایک مشہور عربی حمام ہے جو عربوں کے حماموں کا ایک بہترین نمونہ سمجھا جاتا ہے۔

جبرالٹر سے اسپین، پرتگال تا بحر مراکش وغیرہ کی سیاحت نہایت ہی آسانی سے موٹر یا ریل کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔ یہاں ہر قسم کی دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔ بائیسکوپ شکار گھوڑ دوڑ پولو گالف ٹینس اور کرکٹ وغیرہ کھیلنے کے سامان یورپ کے دوسرے بڑے شہروں کی طرح کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہوٹل بھی کافی تعداد میں موجود ہیں عموماً اچھے ہوٹل "بحری بندرگاہ" (   ) کے قریب ہیں جو پیرس اور لندن کے ہوٹلوں سے کسی طرح آرائش میں کم نہیں ——— جبرالٹر موسم گرما میں بسر کرنے والوں کے لئے ہر قسم کی دلچسپی کے سامان موجود ہیں، خوشنما مناظر خوشگوار آب و ہوا اعلیٰ سوسائٹی اور دلچسپیوں کا ایک ہجوم۔ غرض تعطیل کا زمانہ دلچسپی سے انسان وہاں بڑے مزے میں گذار سکتا ہے۔ لیکن مئی، جون ۱۹۴۱ء میں جبرالٹر کا نظارہ کیسا ہوگا۔ یہ آئندہ واقعات ہی بتا سکتے ہیں ———

مئی ۱۹۴۱ء

جہانِ اسلام

نوخیز عراق
اور
اس کا پہلا بحری بیڑہ

از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی کیپٹاگر اورینٹل لائبریری۔ پٹنہ

جنگ عظیم کے بعد ترکوں کے پنجۂ اقتدار سے الگ ہونے پر عربی ملکوں کو جن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑا وہ باخبر حضرات پر پوشیدہ نہیں۔ شریف حسین بن علی کی مجوزہ عربی شہنشاہیت دفعۃً چھوٹی چھوٹی نیم خود مختار ریاستوں میں بٹ گیا۔ شرق اردن کا علاقہ امیر عبداللہ کے زیر نگیں کیا گیا۔ تو مملکت فلسطین شاطران فرنگ کی نذر ہوئی۔ فلسطین پر برطانوی اقتدار کے ساتھ ساتھ صیہونیت کا عذاب مسلط ہو گیا۔ شام جس کی آبادی بیس لاکھ بھی نہیں ہوگی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ جمہوریہ لبنان، جبل الدروز، بلاد العلویین، اذقیہ اور سوریہ کے نام سے پانچ حکومتیں فرانس کے زیر اثر قائم ہوئیں۔ اور بزعم خود یہ سوچ کر سکندرونہ کا خالص عربی علاقہ اصل باشندوں کی مرضی کے خلاف اور ان کے مسلسل احتجاج کے باوجود ترکوں کے حوالے کر دیا گیا۔ جہاں آج مسلمانوں اور عربوں پر چنگیزی روح مسلط کی جا رہی ہے۔

کہنا یہ ہے کہ جنگ عظیم کے بعد عربوں کے حصہ میں انتشار اور مصیبتوں کے سوا کچھ نہ آیا۔ تمام سابق عثمانی مقبوضات کے تتر بتر ہوئے سارے علاقوں میں اگر کہیں بیداری اور زندگی کے ساتھ ذرا سکون اور اطمینان کے آثار نظر آتے ہیں تو وہ عراق ہے۔ یہ خیال نہ ہو کہ عراق کو یہ سکون و اطمینان محض غیروں کی نوازش سے میسر آیا ہے بلکہ یہ سپوتوں کی شجاعت و وحدت اور ان کے آزمودہ کار سربراہ امیر فیصل بن شریف حسین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جنگ عظیم کے بعد پہلے پہل امیر فیصل کو دمشق کا تخت و تاج عطا ہوا اور وہ شاہانہ کروفر کے ساتھ بنو امیہ کے دارالسلطنت میں منصب حکومت پر متمکن ہوئے۔ لیکن دمشق فرانس کے حصہ میں پڑ چکا تھا۔ جنرل گورو دس ہزار فوج کے ساتھ دمشق میں داخل ہوا اور میسلون کے مقام پر وحشت انگیز معرکہ میں شام کے ہونہار و سجیلے جوان [illegible] شامیوں سے جو بچ رہے تھے کام آئے۔ مجبوراً تخت خالی ہوا۔ امیر فیصل نے عراق میں قسمت آزمائی کی۔ نصیب نے یاوری کی۔ [illegible] عراقیوں کی مسلسل [illegible] سے تنگ آ گئے تھے۔ امیر فیصل کی بادشاہی مان لی گئی۔ سرکار برطانیہ اور عراق کے باشندے دونوں مطمئن ہو گئے۔

شاہ فیصل نے حکومت کچھ اس ڈھنگ سے کی کہ شاطر برطانیہ بھی رام رہا اور رعایا بھی خوش رہی۔ انگریزی سرکار سے پے بہ پے معاہدے

۱۔ [illegible] ۱۹۴۰ کی ایک خبر سے چار [illegible] زادوں کے نام لئے گئے ہیں۔ جس کے علاوہ جو کچھ ہے ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

۲۔ [illegible] سے لے کر [illegible] کے ساحل تک ایک قومی عربی حکومت کا خواب [illegible]۔ الامبراطوریۃ العربیۃ کا خواب دکھایا گیا تھا۔

۳۔ جنگ عظیم سے پہلے فلسطین میں شامل تھا۔ اب [illegible] کا حصہ شرق اردن کہلاتا ہے۔

۴۔ اس تحریک کو صحیح طریق سمجھنے کے لئے ملاحظہ ہو:

(۱) [illegible]: دی [illegible] اسلام (اردو ترجمہ [illegible])
(۲) [illegible]: اسلام اِن دی ورلڈ
(۳) مسعود عالم ندوی: عربوں کی قومی تحریک۔ [illegible] سنہ ۱۹۳۹ء
(۴) [illegible]: دنیائے اسلام [illegible]
عربی جاننے والوں کے لئے مآخذ [illegible] امیر شکیب ارسلان: الثورۃ العربیۃ الکبریٰ (امین سعید) بہت کافی ہے

Marfat.com

ہوئے اور اکتوبر ۱۹۳۲ء کے معاہدہ کی رو سے عراق کی آزادی باضابطہ تسلیم کر لی گئی۔ عراق مجلس اقوام کا ممبر ہوا۔ عراقیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ قومی، صنعتی، تجارتی اور تعلیمی دن دونی رات چوگنی ترقی کرنے لگی۔ پوری قوم شراب حیات سے پرکیف نظر آنے لگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب کچھ ہوا، مگر تقدیرات کا دولہا یعنی شاہ فیصل اپنے وطن سے دور، ملک جان آفریں کو سپرد کی (سوئزرلینڈ ۱۹۳۳ء) باغبان کا تمنا اور مراد تھی باغ کو ہرا بھرا نہ دیکھ سکا۔ قدرت کو یہی منظور تھا۔ ہوا اس سال غازی (شاہ غازی) نے تخت و تاج کی زینت بنا۔ حکومت کا کاروبار اپنے حال پر قائم رہا۔ نئے نئے منصوبے بنے اور عملی جامہ پہن کر باشندوں کی فلاح و بہبود کا باعث ہوئے۔ زمانہ نے ایک اور کروٹ لی۔ عراقیوں کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز غازی بھی گذشتہ سال اپنے باپ سے جا ملا۔ اور اب تخت عراق پر نغا فیصل (ثانی) اپنے دادا کی یاد تازہ کر رہا ہے۔

اس دوران میں مختلف وزارتیں بنیں اور بگڑیں۔ کبھی یسین ہاشمی مرحوم اور جعفر عسکری کا دور دورہ رہا، تو کبھی سلیمان حکمت اور بکر صدقی کا۔ اور آج پھر شاہ فیصل کے دست راست نوری سعید عراق کی سیاست کا پشتیبان ہے۔ مگر ان وزارتوں کی آمد و رفت کا ملک کی خوشحالی اور آئندہ کے منصوبوں پر کوئی اثر نہ پڑا۔ تمام کام بنے بنائے پروگرام کے مطابق چلتے رہے اور چل رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج عراق کو اپنی معمولی آبادی اور حقیر فوج کے باوجود فوجی لحاظ سے مصر پر برتری حاصل ہے۔

عراق اس وقت عربی تحریک اور اتحاد عرب کی آرزوؤں کا محور ہے۔ یہاں کی ہر چیز عربیت لئے ہوئے ہے۔ مصر میں آپ کو بنکوں اور بڑی دکانوں پر بنتے فرانسیسی زبان میں لکھے نظر آئیں گے، عراق میں صرف عربی کا چلن ہے۔ مصر میں قومی روح مفقود تھی اب کچھ ابھر رہی ہے۔ عراق کا بچہ بچہ امنگوں سے معمور اور سپاہیانہ جذبہ رکھتا ہے۔ مصر میں باایں ہمہ کبھی کبھی طہ حسین جیسے قلب و نظر کے اندھوں کی زبانی فرعونیت کی صدا سنائی دیتی ہے۔ عراق میں یہ بیہودگیاں نہیں۔

یوں تو عراق کی عربیت ہر چیز سے نمایاں ہے، پر عراق کے جنگی جہازوں کے نام سن کر آپ بھی داد دیں گے اور اس جذبہ کی تعریف کریں گے۔ شاہ فیصل مرحوم نے اول ہی روز یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایک طاقتور بحری بیڑہ کے بغیر خلیج فارس میں عراق کی پوزیشن مستحکم نہیں ہو سکتی۔ پر بے وقت اور ناگہانی موت کے باعث وہ اپنی آنکھوں سے اپنے خواب کی تعبیر نہ دیکھ سکے۔ قدرت کو کچھ ایسا منظور تھا کہ شاہ غازی کے زمانہ میں بھی یہ تجویز مکمل نہ ہو سکی۔ آخر نغے فیصل (ثانی) کے دور حکومت میں فیصل اول کے شیریں خواب کی تعبیر نظر آئی۔ اور چار جنگی جہازوں کا پہلا بحری بیڑہ عراق کے دار الحکومت کے سامنے دجلہ کی موجوں سے ہم کنار ہوا (رجب ۱۳۵۸ھ)۔ جماعت فتوۃ کے نوجوانوں نے پرجوش نعروں سے استقبال کیا۔ جہازوں نے جواب میں ہارون الرشید کے محبوب شہر کو اکیس توپوں کی سلامی دی۔ بغداد کی چھاؤنی نے بھی مہمان محبت کے طور پر گیارہ توپوں کی سلامی پیش کی۔

تاریخی زوال و انحطاط کے اس دور میں یہ عربوں کا پہلا بحری بیڑہ ہے کل چار جنگی جہازوں سے مرکب ہے جن کے نام یہ ہیں:۔

(۱) الجاس: عبداللہ بن قیس الجاسی جنھوں نے ۲۸ھ میں جزیرہ قبرس فتح کیا۔ معاویہ نے شام کی فتح کے بعد یہ مسلمانوں کی دنیا میں پہلی بحری فتح تھی۔ یہ فتح حضرت عثمانؓ کے عہد میں ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے امیر معاویہؓ کے پیہم اصرار کے باوجود بحری حملہ کی اجازت نہیں دی۔ انکی وفات کے بعد حضرت عثمانؓ نے اجازت دی اور ممتاز صحابہ کی معیت میں عبداللہ بن قیس حاکم ہو کر روانہ ہوئے اور مظفر و کامران رہے دشمنوں نے دب کر صلح کی اس کے بعد انہوں نے کوئی پچاس بحری حملے کئے اور ہمیشہ کامیاب رہے۔ (ابن خلدون جلد ۲ حصہ ۲ ص ۱۲۰۱ مطبوعہ مصر)

نیز ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون: باب قیادۃ الاساطیل اور طبری: حوادث ۲۸ھ حضرت عمرؓ کے متعلق یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ سمندر سے ڈرتے تھے علاء حضرمی نے ایران پر جو بحرین کی راہ سے بحری حملہ کیا تھا وہ ناکام رہے (طبری: حوادث ۱۷ھ) اس لئے فاروق اعظم بحری حملہ کی اجازت دینے میں متامل تھے۔

(ملاحظہ ہو: عربوں کی جہاز رانی از علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ)۔ (الضیاء جمادی الاخری ۵۳ھ)

(۲) جنادۃ: جنادہ بن امیۃ الازدی، اس مشہور اسلامی بیڑے کے کپتان جس نے ۵۳ھ میں جزیرہ رودس فتح کیا۔ جنادہ مشہور تابعی اور حدیث کے راویوں میں ہیں حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ سے روایت کی ۸۰ھ میں وفات پائی۔
(جنادہ کے بحری کارناموں کے لئے ملاحظہ ہو: بلاذری: باب فتوح الجزائر)

۱؎ مصر میں فرعونیت کی تحریک کبھی بہت زوروں پر تھی جیسے آج ہندوستان میں بعض بھارت کی احیاء کی تحریک۔ انہی حلقوں میں رہی ہے اسی طرح کچھ پہلے مصر میں بھی فرعونی دور پر فخر کیا جاتا تھا اور عام عربی ادب سے الگ مصری ادب ڈھالنے کی کوشش کی جا رہی تھی الحمد للہ کہ اب یہ تحریک جان توڑ رہی ہے۔
۲؎ فتوۃ ایک قومی تحریک ہے جو کم و بیش نازی تحریک کے نمونہ پر چل رہی تھی جذبہ مر وطن اور قوم کی خدمت پر زور دیتی ہے۔
۳؎ الفتح (مصر) ص ۳۹ میں غالباً غلطی سے ۱۳۵۷ھ چھپ گیا ہے۔

۴؎ اس وقت اصل عربی مضمون پیش نظر نہیں عربی ترجمہ طابع کے نام سے الضیاء میں مسلسل شائع ہوا تھا مجبوری میں اسی کا حوالہ دیا گیا

(۳) عبدالرحمٰن: عبدالرحمٰن بن حبیب گورنر افریقیہ جنھوں نے صقلیہ پر نہایت کامیاب حملہ کیا اور مظفر و منصور روٹے (سنہ ۱۳۵ھ)
(تاریخ صقلیہ از سید ریاست علی ندوی۔ ۔۔۔) ابن خلدون ج ۲ ص ۲۰۲)

(۴) ذات الصواری: ذات السواری اس مشہور بحری معرکہ کا نام ہے جو سنہ ۳۱ھ میں عرب اور روم کے درمیان فلکس پہاڑی کے سامنے وقوع پذیر ہوا تھا۔ اہل فرنگ اسے معرکہ فلکس ہی کہتے ہیں۔ رومیوں کا قائد خود ہرقل کا بیٹا قسطنطین تھا جس کا بیڑہ عربوں نے زیر و زبر کر دیا تھا تاآنکہ اس نے روم کے پایۂ تخت (قسطنطنیہ) میں پناہ لی۔

صاری کشتی کے چپو کو کہتے ہیں سا الدقل الذی ینصب فی وسط السفینۃ۔ لسان العرب و تاج العروس۔ اس کی جمع صواری آتی ہے۔ اس جنگ میں کشتیوں کے لنگر ایک دوسرے کے ساتھ باندھ دئے گئے تھے کہ ہم کر سکیں۔ رومیوں نے بھی کشتیاں اسی طرح اکٹھی کر لی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ عربوں کے ہاں اس معرکہ کا نام ذات الصواری پڑ گیا (طبری: حوادث سنہ ۳۱ھ) ابن خلدون کہتا ہے کہ صواری کی کثرت کے باعث عبداللہ بن ابی سرح نے یہاں رات بسر کی اور اہل عرب نے اس کا نام ذات الصواری رکھ دیا۔ (ابن خلدون جلد دوم حصہ دوم ص ۱۳۰) مطبوعہ مصر۔

تجرفی فی رمایت ورین فیفمی معدوم ہوتی ہے۔

ان ناموں سے آپ کو عراق کی امنگوں اور عربی نخوت و غیرت کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

آج جبکہ قوت کا دیوتا غیظ و غضب میں ہے یہ مسکین چار جہاز کس شمار میں ہیں؟ ہاں ان کے نام بڑے ہیں، شاید کہ دن پلٹ آئیں اور بقول استاذ الاساتذہ حضرت مولانا شبلی مرحوم و مغفور:

عجب کیا ہے یہ بیڑہ غرق ہو کر پھر ابھر آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

مولانا مرحوم کا شعر خود بخود زبان قلم پر آ گیا۔ اسلامیت کے نفوس کا یہ بیڑا غرق ہو کر پھر نئے سرے سے سمندر کی گود میں اچھل کر آ رہا ہے۔ دعا ہے کہ ساحل مراد تک بخیر و خوبی پہنچے۔

(بہار نمبر سنہ ۱۹۴۰ء)

ایک الفتح ۱۹۱ میں اناطولی (سین سے) چھپ گیا ہے جو صحیح نہیں۔ ایک الفتح ۱۹۱ میں سنہ ۲۱ھ درج ہے جو غالباً طباعت کی غلطی ہے۔
تفصیل کیلئے دیکھو طبری حوادث سنہ ۳۱ھ طبع یورپ سلسلہ جلد اول صفحہ ۲۸۶۵-۲۸۷۰

تلخیص و تبصرہ

دنیا کا سب سے پرانا شہر

از پروفیسر ای اے سپائیسر[1]، شعبہ مشرقیات، جامعہ پنسلوانیا

مترجمہ جناب پروفیسر محمد مسلم خستہ ایم اے سینٹ کولمبس کالج ہزاری باغ

دنیا کا سب سے پرانا شہر زمین سے کھود کر نکالا جا رہا ہے۔ اس کے کھنڈر عراق میں دریائے دجلہ کے قریب مشہور شہر نینوا سے پندرہ میل شمال واقع ہیں۔ اس کا نام تپہ گورا (TEPE-GAWRA) ہے۔ تپہ کے معنی ہیں پہاڑ یا ٹیلہ اور گورا کے معنی ہیں بڑا۔ اب تک یہ معلوم نہیں کہ اس کے باشندے اسے کس نام سے پکارتے تھے۔ جب میں اس خطہ میں کئی سو ٹیلوں کا آثاریاتی پڑتال کر رہا تھا۔ میری توجہ اس ٹیلہ کی طرف مبذول ہوئی۔ مٹی کے ٹوٹے برتنوں کو زمین سے نکلتے ہوئے ہم تپہ گورا کے ڈھلوان پہاڑ تک جا پہنچے جہاں مٹی کے منقش برتنوں کے ٹکڑے اور عہد عتیق کے اوزار برآمد ہوئے۔

کھدائی سے پہلے یہ مٹی کا ایک نوکدار مخروطی ٹیلہ تھا۔ ستر فٹ سے زیادہ بلند۔ اب تک ہم نے سولہ بستیاں کھود نکالی ہیں اور کم سے کم چھ اور باقی ہیں جن کا اندازہ ہم نے آزمائشی خندقوں کی کھدائی سے لگایا ہے۔

جس خطہ میں زندگی کی سہولتیں اور عافیتیں دستیاب ہوں وہاں سے انسان بالکل اجڑا نہیں کرتے۔ قومیں اور نسلیں یکے بعد دیگرے وہاں بستی ہی رہتی ہیں۔ مشرق ادنیٰ کے قدیم شہر عموماً ایسی ہی جگہوں پر تعمیر کئے گئے ہیں جہاں کوئی اچھا کنواں یا ایسا چشمہ ہے جس کے پانی پر زیادہ مدت تک بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ اور جہاں غنیم کے اچانک حملوں سے شہر کی حفاظت کی جا سکے۔ ایسی جگہوں پر کبھی زلزلہ یا جنگ یا آتش زدگی سے شہر تباہ بھی ہو گیا ہے تو باقی ماندہ مخلوق

---

[1] Prof. E.A. Speiser, Pennsylvania University.

یا نئے آنے والے منہدم عمارت کے ڈھیروں کو سطح کرکے یا نئے غاروں کو بھر کر انھیں کھنڈروں پر نئی سڑکیں، عمارتیں، مندر وغیرہ تعمیر کر لیتے ہیں۔ اس طرح ایک ہی سرزمین پر تہ بہ تہ شہر برآمد ہوئے ہیں۔

ٹیپ گورا کی ایک ایسی ہی بہت قدیم سطح پر جس کی عمر چار ہزار قبل مسیح یا زائد تک پہنچتی ہے ہمیں ایک تنور ملا جس میں ایک ظرف تھا اور اس پر ڈھکن پڑا تھا اس کے اندر سالن کی ہڈیاں موجود تھیں۔ کوئی حادثہ کھانے میں مخل ہو گیا۔ شہر تباہ ہو گیا۔ دوسرے شہر اس پر تعمیر ہو گئے اور یہ تنور نیچے دبا کا دبا رہ گیا۔ یہ ظرف ٹیپ گورا کے بارھویں طبقے سے نکلا۔ ہم ایسی ایسی بارہ بستیاں سولہ طبق تک کھود چکے ہیں۔

جوں جوں ٹیپ گورا کی کھدائی طبق بطبق نیچے پہنچتی جاتی ہے تاریخ دراز تر اور دور تر ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ آٹھواں شہر جس کی تاریخ سنہ تین ہزار پانسو قبل مسیح یا زائد تک پہنچتی ہے کھدائی کے وقت دنیا کے قدیم ترین شہر کے نام سے پکارا گیا تھا۔ لیکن اب تو بارھویں سے سولھویں طبقوں تک ہم پہنچ چکے ہیں جو سنہ چار ہزار قبل مسیح کی آبادی کا پتہ دے رہے ہیں۔ دنیا کا سب سے قدیم شہر جس کا اب تک ہمیں علم ہوا ہے ساڑھے چار ہزار برس قبل مسیح تک پہنچتا ہے۔ سنہ تین ہزار قبل مسیح سے قبل کی تاریخیں اضافی و اعتباری ہیں۔ لیکن ساتواں طبق یقینی طور پر آج سے پانچ ہزار برس کی تعمیر ہے۔ سولھویں طبق کی تعمیر کی تاریخ بے شبہ سنہ ساڑھے چار ہزار قبل مسیح تسلیم کی جا سکتی ہے۔

ہم ان قدیم ترین شہریوں کے ترقی پذیر بلکہ جدید طرز تعمیر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ٹیلہ کے نیچے ہمیں ایک نہایت قدیم شہر کے برآمد ہونے کی امید تھی مگر یہ امید نہ تھی کہ ایسی اچھی تعمیریں ہوں گی۔ آٹھویں طبقہ میں جو سنہ ساڑھے تین ہزار قبل المسیح کے لگ بھگ کے آثار ہیں سڑکیں کسی مہندس کے باقاعدہ نقشہ سے بنی ہوئی ہیں۔

یہ قومیں عہد تاریخ سے پہلے بستی تھیں۔ سنہ تین ہزار قبل مسیح سے پہلے عراق میں فن تحریر کا پتہ نہیں۔ جو بات زیادہ تعجب خیز ہے وہ یہ کہ قدیم باشندگان شہر برنجی (تانبے پیتل کی دریافت) سے پہلے آباد تھے۔ ان شہروں میں سنہ تین ہزار قبل مسیح سے پہلے دھاتوں کے پگھلانے اور اوزار ڈھالنے کا ہنر ان کو معلوم نہ تھا۔ اس عصر سے پہلے تانبا نہایت نادر الوجود تھا۔ لہذا سنہ چار ہزار قبل مسیح سے پہلے کی قوموں سے نفیس پبلک عمارت کی تعمیر، دلکش زیورات کے استعمال اور موسیقی اور دوسرے فنون لطیفہ سے واقفیت کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔ تاہم ان بارہ سے سولہ طبقوں کے باشندے ان تمام تکلفات سے آشنا و لذت یاب تھے۔ ہماری پہلی حیرت اس وقت شروع ہوئی جب ہم تیرھویں طبق کی کھدائی کر رہے تھے اور ایک ایک اینٹ کر کے صاف کرنے پر شہر میں ایک وسیع سطح چبوترہ سا نکل پڑا۔ اس پر خوشنما موقع پر تین مندر بنے ہوئے تھے۔ ہر ایک بجائے خود فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھا۔ ہم نے بنیادیں اور دیواروں کے بیشتر حصے صاف کئے تو عمارتوں کی استرکاری باہر سے سفید اور اندر سے سرخ اور گلابی دکھائی دی۔ اندرونی دیواریں ستونوں اور دیواروں سے ابھرے ہوئے نصف پایوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ اگر یہ ہزاروں برس بعد کی تعمیریں بھی ہوتیں تو حیرت انگیز ہی ہوتیں ان تینوں مندروں میں جو غیر معمولی خصوصیت ہے وہ یہ کہ معماروں نے ان کو ایک جھنڈ میں تعمیر کیا ہے۔ دنیا میں خوش منظر موقع کی رعایت اور تناسب کا یہ سب سے قدیم کامیاب نمونہ ہے! الخ۔ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ علم تک یہ دنیا میں سب سے قدیم عمارت عامہ "اول بیت وضع للناس" ہے

ان کا ایک دیوتا یا شاید دیوی ہمیں آٹھویں طبقہ میں مدفون ملی۔ یہ پکائی ہوئی مٹی سے بنی ہوئی مورتی تھی جس پر رنگ چڑھے ہوئے تھے اور بیٹھی ہوئی ہئیت میں تھی جیسے لکشمی سرسوتی وغیرہ۔ اس میں نقصان آگیا تھا مگر بہت زیادہ نہیں۔

اُن کی موسیقی کے بارے میں ہم اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے پاس آلات موسیقی تھے جو آج تک کے علم کے لحاظ سے قدیم ترین آلات موسیقی ہیں۔ گڈریوں کی بانسری ہے ہڈی کی بنی ہوئی۔ ایسی ایک بانسری ہم نے زمین سے کھود کر نکالی جسے ریک چھوٹا لڑکا مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

ان قوموں میں ایجاد کی صلاحیت موجود تھی انہوں نے تیز اور شوخ نقاشی ایجاد کی ہے۔ ابھی مجھے کھدائی کے مقام سے یہ خبر ملی ہے کہ سولھویں طبق میں ایک کمرے میں پلاستر پر خوش رنگ نقاشیاں برآمد ہوئی ہیں۔ ان کے مٹی کے کوزوں اور گلدانوں پر نظر فریب نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ پیالوں کے ڈول کے تناسب اور ان پر نقاشی میں انہوں نے لطیف ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ تیپ گورا کے ان صناعوں نے مناظر کی نقاشی کا قدیم ترین نمونہ پیش کر کے ہمیں فنون لطیفہ کی تاریخ میں ایک نئے خیال سے دوچار کر دیا ہے۔ ہمیں ایک ٹوٹا ہوا بہت بڑا گلدان ملا۔ جب ان کے ٹکڑے ملا کر جوڑے گئے تو ہم نے دیکھا کہ اس کی ڈھالوان سطح پر بارہ مناظر بارہ حلقوں میں نقش تھے۔ ان مناظر میں سے دو دجلہ اور فرات کی وادیوں میں شکاریوں کی تصویریں ہیں جو درندوں کا تعاقب کر رہے ہیں۔ ان کو رکابیوں پر ہندسی شکلیں بنانے کا شوق بھی تھا۔

ہمارے برادرِ قدیم تیپا یعنی کوھویں شہر کے کھنڈروں میں جو مٹی کے منقش برتن نکلے ہیں وہ ابتدائی ناقص نمونے نہیں ہیں بلکہ چینی جیسی صفائی اور لطافت میں نہایت اعلیٰ ہیں۔ ہمیں حیرت اور جستجو تھی کہ وہ ان کو بناتے کس طرح تھے مگر خوش قسمتی سے ہمیں اس کا حل دستیاب ہو گیا۔ ایک گول سات فٹ قطر کی چمنی مل گئی جسے کھودتے ہوئے ہم نے زیر زمین بند خانے دریافت کئے۔ یہ ذرا مسل آوا تھا۔ اس چمنی کے ذریعے وہ ان بند خانوں میں مٹی کے ظروف کے پکانے کے لیے آگ کی گرمی کو محفوظ و معتدل اور درجہ حرارت پر پورا قابو رکھتے تھے۔ اس لئے اب تک ہمیں جہاں تک معلوم ہے بند آوے بنانے والوں اور استعمال کرنے والوں میں یہ سب سے پہلی یا قدیم ترین قوم تھی۔

ان کے زیورات میں موتی تھے جو ہزاروں کی تعداد میں برآمد ہوئے ان میں کچھ سونے کے تھے جن کا سب سے پرانا نمونہ بارھویں شہر میں ملا کچھ لاجوردی تھے۔ ہمیں خوبصورت تراش کی مہریں بھی ملیں۔

عرضِ مترجم

پن سلوانیا کی یونیورسٹی کی طرف سے عراق میں آثار قدیمہ کی دریافت کا کام عرصہ سے جاری ہے اور مقالہ نگار مستند ذمہ دار ماہر فن ہے۔ اس مقالہ سے واضح ہے کہ آج سے تقریباً ساڑھے چھ ہزار سال پیشتر دنیا کے ایک حصہ میں انسانی آبادی ہی نہیں بلکہ معتنابہ تہذیب و تمدن موجود تھا جس کے مدارج طے کرنے میں ہزارہا ہزار سال لگے ہوں گے۔ پھر ایک مدت مدید دور وحشت میں گذری ہو گی۔ حیوانات کی ہڈیاں بھی دس بیس ہزار پیشتر دنیا کے وجود کی خبر دے رہی ہیں۔ جدید علمائے طبقات الارض و فلکیات کرۂ زمین کی عمر کا اندازہ دس کروڑ سے دو ارب سال تک لگاتے ہیں۔

دوسری طرف علمائے مذاہب اپنی کتابوں سے دنیا کی عمر کا حساب مختلف اور عجیب عجیب لگاتے ہیں۔ توراۃ قدیم یونانی ترجمہ کے مطابق دنیا ولادت مسیح سے چھ ہزار سال پیشتر اور طوفان نوح سے سوا دو ہزار سال پیشتر خلق ہوئی

یہود کی روایت علی الترتیب چار ہزار اور ایک ہزار چھ سو چھپن بتائی ہے۔ سامریہ والے یہودی علما طوفان نوح اور خلق عالم کے درمیان ایک ہزار تین سو سات سال کا فصل بتاتے ہیں۔

مشہور و مستند مورخ ابو جعفر محمد بن جریر الطبری اپنی تاریخ الرسل والملوک میں علمائے یہود کا دعویٰ نقل کرتے ہیں کہ حضرت آدمؑ کی پیدائش سے لے کر ہجرت نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام تک ایک ایک بادشاہ اور نبی کی ولادت و وفات کا حساب کر کے ۴۶۴۰ برس کی مدت ہوتی ہے۔ اس حساب سے آج دنیا کی عمر پورے چھ ہزار برس ہے۔

یونانی کلیسا کے عیسائیوں کا قول ان کی توراۃ سے خلق آدم سے ہجرت نبوی تک ایک ایک بادشاہ اور نبی کی ولادت و وفات کا حساب کر کے ۵۹۹۲ سال نقل کرتے ہیں۔ اس طرح دنیا کی موجودہ عمر ۷۲۰۵ ٹھیرتی ہے۔

اسی طرح وہ علمائے مجوس کا قول نقل کرتے ہیں کہ ان کے آدم گیومرث سے ہجرت نبوی تک کی مدت ۳۱۳۹ سال ہوتی ہے اس تقدیر پر دنیا کی موجودہ عمر ساڑھے چار ہزار سال ہوتی ہے۔

اگرچہ قرآن مجید ایسے خرافات سے پاک ہے مگر عجمی فطرت موشگافی کی بدولت ہمارے تفاسیر و احادیث بھی کسی سے پیچھے نہیں رہیں۔ اور انھیں پر فہم قرآن کا مدار سمجھا جاتا ہے۔ کم قد صحیح الزمان من ابتدائہ الی انتہائہ یعنی دنیا کی عمر پر بحث کے سلسلے میں اپنے متقدمین کی دورائے نقل کی ہے چھ ہزار اور سات ہزار سال ان علمائے متقدمین نے بعض مجمل یا رموز یا مبہم احادیث سے جو صریحاً استعارہ کی زبان میں ارشاد ہوئی ہیں اور بعض آثار سے یوں استدلال کیا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی طرف یہ قول منسوب ہے کہ "دنیا کی عمر ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک سات ہزار برس ہے چند سو سال اور باقی ہیں جن کی کوئی حد خاص معین نہیں۔ دوسری روایت کعبؓ کی ہے کہ دنیا کی عمر چھ ہزار برس ہے جس میں سے ۵۶۰۰ برس گذر چکے یعنی چار سو برس باقی رہ گئے۔ اسی معنی کی متعدد روایات نقل کی ہیں۔ مگر آج زمانہ تقریباً ساڑھے تیرہ سو برس آگے بڑھ کر ان رواۃ کے اقوال کی اگر ان کے ہیں بدیہی تکذیب کر رہا ہے

ان آثار سے گذر کر احادیث نبوی کی تاویلات قابل لاحظہ ہیں۔

۱۔ آپ کا ایک ارشاد یوں منقول ہے اجلکم فی اجل من کان قبلکم من صلوٰۃ العصر الی مغرب الشمس یعنی تمہاری اور تمہارے اسلاف ماضی کی مدت فنا میں اتنا ہی فرق ہے جتنا عصر اور مغرب کے درمیان۔ اسی معنی کی متعدد احادیث لفظوں کے فرق سے مروی ہیں۔ حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے ایک روز آپ نے غروب آفتاب کے قریب خطبہ دیتے ہوئے فرمایا والذی نفس محمد بیدہ ما بقی من دنیاکم فیما مضٰی منہا الا کما بقی من یومکم ھٰذا فیما مضٰی منہ وما ترون من الشمس الا الیسیر یعنی قسم ہے پروردگار کی دنیا کی عمر سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ اتنا ہی ہے جتنا آج کے گذرے ہوئے دن کا یہ حصہ یعنی آفتاب کی ذرا سی جھلک، جو تم دیکھ رہے ہو

۲۔ دوسری مشہور حدیث نبوی جس سے استدلال کیا گیا ہے یہ ہے بعثت والساعۃ کھاتین واشارہ بالسبابۃ والوسطیٰ یعنی حضور صلعم نے اپنی انگشت شہادت اور بیچ کی انگلی ملا کر بتایا مجھ میں اور قیامت میں بس یہی فرق ہے

اب ان مقدمات کی بنا پر منطقی عمارت قابل دید ہے ۱۔ عصر و مغرب کا درمیانی فصل دن کا قریب قریب

Marfat.com

۱۔ حصہ ہوتا ہے۔ کلمہ اور بیچ کی انگلیوں میں بھی تقریباً یہی فرق ہے

۲۔ قول ابن عباسؓ کے مطابق دنیا کی عمر سات ہزار برس مان لیجئے۔

۳۔ قرآن مجید کے ارشاد کل یوم کان مقدارہ الف سنة مما تعدون کی رو سے اللہ میاں کا ایک ایک دن ہمارے ایک ایک برس کے برابر ہے کیونکہ وہ خود جتنے بڑے ہیں اسی مناسبت سے ان کے دن اور گھنٹے ہیں

۴۔ ایک ایک ہزار برس والے سات خدائی دن کے سات ہزار برس کا ۱/۱۴ یا نصف ہوتا ہے

نتیجہ دنیا کی بقیہ عمر ۵۰۰ برس باقی رہی عہد نبوی سے یہی طریق استدلال دنیا کی چھ ہزار برس عمر والی روایت میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ اور حضرت ابوہریرہؓ سے بھی ایک روایت اسی نتیجہ پر پہنچاتی ہے کہ دنیا کی کل عمر چھ ہزار سال ہے

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ اسلاف کا قرآن، سنت و صحف مطہرہ سے سائنٹفک حقائق اخذ کر کے امت کو ان کی سچائی پر یقین دلانا دین کی کوئی خدمت بھی تھی؟ متکلمین کا اس قسم کا میلان طبع ہمیشہ رہا ہے اور آج بھی ہم اکثر من چلوں کو دیکھتے ہیں کہ دنیا جہاں کے انکشافات ایجادات فلسفیانہ نظر سے قرآن مجید سے ثابت کرنے کو تیار ہیں

اگر ناداتوں نے قرآن مجید کو صرف طلسم بنا رکھا ہے، ایک قسم کھاتے لعنت بھیجنے، گلے میں باندھنے جنات اتارنے، ارواح بھگانے کا منتر سمجھ رکھا ہے تو دوسری طرف ہمارے علما بھی اسے سائنس و فلسفہ کے حقایق کی کتاب بنا کر اس کا غلط مصرف لینے کے لیے آمادہ رہے ہیں

میں یہ نہیں کہتا کہ آپ دنیا کی عمر کم سے کم دس کروڑ یا دس ہزار برس تسلیم کر لیجئے یا تیب گورا کی تمر چھ ہزار برس یا دو ہزار برس وحی آسمانی کی طرح صحیح مان لیجئے۔ اس میں کمی بیشی حساب کا سہو و خطا، غلط فہمی ممکن ہے۔ مگر قرآن مجید سے دنیا کی عمر نکالنا یا ہوائی جہازوں، آبدوز کشتیوں، لاسلکی اور ریڈیو کا وجود ثابت کرنا کس درجہ گمراہ کن ہے۔ اعوذ باللہ ان اکون من الجاهلین

ستمبر ۱۹۳۸ء

سامَرّاء

از جناب مولانا حکیم سید احمد اللہ صاحب ندوی رفیق دائرۃ المعارف حیدرآباد

سامرا عہد اسلامی کا ایک خوبصورت اور عظیم الشان شہر تھا جو دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر بغداد سے بالائی سمت میں ۳۰ فرسخ (۹۰ میل) کی مسافت پر آباد کیا گیا تھا۔

اس شہر کے کئی نام تھے جن کی وجہ تسمیہ مختلف بیان کی گئی ہے مشہور نام یہ ہیں سامرا، سرمن رأی، سا من رأی اور سترا، ان میں سامرا قدیم نام ہے۔

جب سامرا کی اسلامی آبادی کی داغ بیل ڈالی جانے لگی تو اس مقام پر پہلے سے ایک قدیم آبادی موجود تھی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سام بن نوح کے لئے بسائی گئی تھی۔ اس مناسبت سے اس کا نام فارسی زبان میں سام رہ رکھ دیا گیا، دوسری روایت یہ ہے کہ یہ مقام سام بن نوح کی رہگذر میں واقع تھا جب وہ گرما کے مسکن کو چھوڑ کر سرمائی اقامتگاہ کی طرف جاتے تو اسی راہ سے وہ گزرتے تھے، اس لئے اس جگہ کا نام سام راہ قرار پایا۔ چند کو کثرت استعمال سے سامرا ہو گیا اور جب اس مقام پر اسلامی شہر بسایا گیا تو اس کی رونق اور خوبصورتی کی بنا پر اس کا نام "سر من رأی" رکھا گیا، جس کے معنے ہیں "جس نے دیکھا وہ خوش ہوا" لیکن جب یہ شہر ویران ہو گیا تو "سا من رأی" پکارا جانے لگا، جس کا مفہوم ہے "جس نے دیکھا وہ ناخوش ہوا" اور بعد ازاں اس کا قدیم نام سامرا از سر نو زبانزد خاص و عام ہو گیا اور اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔

تغیر کی وجہ

ارباب تاریخ بیان کرتے ہیں کہ عباسی خلیفہ معتصم کی فوج شمار میں اس قدر زیادہ ہو گئی تھی کہ شہر بغداد اس کے رہنے کے لئے ناکافی ہو گیا تھا اور یہ بے باک فوج بغداد کی سڑکوں سے جب گزرتی تو گھوڑوں کے ازدحام سے چھوٹے چھوٹے بچے، نابینا اور ضعیفوں کی ایک جماعت کچل کر مر جاتی تھی، ان جاں گسل واقعات سے متاثر ہو کر چند ارباب خیر خلیفہ معتصم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یوں گویا ہوئے:-

"اے خلیفہ! تیری فوج سے لوگوں کو سخت ایذائیں پہنچ رہی ہیں اس لئے تو بغداد سے منتقل ہو جا ورنہ ہم لوگ تجھ سے جنگ کریں گے۔" خلیفہ نے پوچھا "تم لوگ کس طرح مجھ سے جنگ کروگے؟" لوگوں نے جواب دیا "ہم تیرے ساتھ صباحی تیروں سے جنگ کریں گے۔" معتصم نے پھر پوچھا "صباحی تیر کیا ہوتے ہیں؟" ان لوگوں نے کہا "ہم تیرے لئے بد دعا کریں گے" معتصم نے کہا "بے شک مجھ میں اس فوج کے مقابلے کی تاب نہیں ہے۔" غرض خلیفہ معتصم نے رعایا کی اس واجبی شکایت کو محسوس کر کے بعجلت تمام بغداد سے منتقل ہونے کا ارادہ کر لیا، اور ایک نیا اسلامی شہر آباد کرنے کے خیال سے سامرا کے ایک خوشگوار اور پر فضا مقام پر پہنچ کر خیمہ زن ہو گئے۔

تعمیر کا حکم

۲۱۹ھ میں خلیفہ معتصم نے الوالوزیر احمد بن خالد کاتب کو حکم دیا کہ وہ ایک

Marfat.com

لاکھ دینار لیکر سامرا، جائے اور وہاں کوئی مناسب مقام تجویز کرکے ایک شہر بسائے، چنانچہ ابوالوزیر اس وقت صرف پانچ ہزار دینار اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوا اور کہا کہ اگر مزید دینار کی ضرورت ہوگی تو پھر لے لونگا اس کے بعد وہ سامراء پہنچا وہاں عیسائیوں کی ایک خانقاہ اور اس سے متصل ایک باغ تھا، ابوالوزیر نے دونوں کو پانچ پانچ ہزار درہم میں خرید لیا، اور عیسائیوں سے ان کی بیع کا قبالہ لکھوا کر بغداد واپس آگیا اور قبالہ خلیفہ کے حوالہ کردیا۔

سنہ ۲۲۰ھ میں خلیفہ معتصم بغداد سے عازم سامراء ہوئے اور نہر قاطول پر خیمے نصب کراکے اتر پڑے، یہ نہر خلیفہ ہارون رشید نے سامراء کے مضافات میں کھدوائی تھی اور اسے قاطول کے نام سے موسوم کیا تھا، معتصم اس مقام سے رفتہ رفتہ اوپر کی جانب بڑھتے چلے گئے اور آخر اس جگہ پہنچے جسے ابوالوزیر نے ان کیلئے عیسائیوں سے خرید لی تھی اور سنہ ۲۲۱ھ میں یہاں قصر اور دیگر مکانوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع کرایا، اور خلیفہ کے حکم سے عوام الناس اور لشکریوں نے بھی اپنے اپنے مکانات یہاں تعمیر کئے، رفتہ رفتہ یہ اسلامی شہر دنیا کا سب سے بڑا شہر ہوگیا۔ اور اب اس کا نام بجائے سامراء کے "سُر من رای" مشہور ہوا، اور مدتوں یہ شہر عباسی حکومت کا دارالخلافہ بنا رہا۔

آبادی کا پھیلاؤ

سامراء کی اسلامی آبادی طول میں ۲۴ میل سے زیادہ تھی، چنانچہ حسن بن احمد مہلبی اپنی کتاب عزیزی میں اس شہر کی پیمائش کا اپنا ذاتی واقعہ بیان کرتے ہیں جو اس کی ویرانی کے بعد کی تھی وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک روز میں سُرمن رای کی ایک سڑک پر اسکے ایک سرے سے نماز صبح کے وقت سے چلنا شروع کیا اس سڑک کی دونوں جانب مکانات اس طرح قائم تھے گویا معماران کو تعمیر کرکے ابھی فارغ ہوئے ہیں، بجز اسکے کہ دروازوں اور چھتوں کا نشان باقی نہیں تھا لیکن دیواریں بالکل نئی معلوم ہوتی تھیں، ظہر کے بعد تک میں برابر چلتا رہا وسط شہر میں جب پہنچا تو یہاں کچھ مکان آباد نظر آئے جو ایک چھوٹے گاؤں کی جیسی آبادی باقی رہ گئی تھی، دوسرے روز اس مقام سے نماز صبح کے وقت سے پھر چلنا شروع کیا اور ظہر کے وقت تک چلتا رہا تاہم مکانوں کے آثار کی حد سے باہر نہ جا سکا۔

اگر مہلبی کی رفتار فی ساعت دو میل اوسط لگائی جائے اور نماز صبح سے ظہر کے وقت تک کم از کم ۶ ساعتیں فرض کی جائیں تو دو روز کے بارہ گھنٹوں میں ۲۴ میل تک وہ برابر شہر کی حد طول کے اندر ہی چلتے رہے۔

جامع مسجد

جس وقت لوگوں کے مکانات اور شاہی قصر تعمیر ہو رہے تھے ساتھ ہی ساتھ ایک جامع مسجد بھی بازاروں کی طرف تعمیر کی گئی، لیکن جب معتصم اور ان کے فرزند واثق کا عہد حکومت ختم ہوگیا اور متوکل مسند آرائے خلافت ہوئے۔ تو انہوں نے ایک دوسری جامع مسجد تعمیر کرائی، جس کی تعمیر میں زر خطیر صرف ہوا اور حکم دیا کہ اس جامع مسجد کا منارہ بہت اونچا بنایا جائے تاکہ وہ میلوں سے نظر آئے اور موذن کی آذان کی صدائیں دور دور تک پہنچیں، جب یہ جامع مسجد فرمان شاہی کے مطابق مکمل ہو گئی تو لوگ پہلی جامع مسجد کو چھوڑ کر اس نئی جامع مسجد میں نماز پڑھنے لگے، اس مسجد میں دریائے دجلہ سے دو نہریں کاٹ کر لائی گئی تھیں، جو شہر سامراء کی بڑی بڑی سڑکوں کے بیچوں بیچ سے گزرتی ہوئی پہنچی تھیں ان میں ایک نہر ہمیشہ رواں

رہتی تھی اور دوسری موسم گرما میں۔

شاہی قصور

اس اسلامی شہر میں ہر ایک خلیفہ نے اپنے اپنے عہد میں عالیشان قصر اور بڑی بڑی عمارتیں بنوائیں، مگر خلیفہ متوکل کا عہد تعمیری عہد تھا ان کے زمانۂ خلافت میں بکثرت قصر اور عمارتیں بنیں جن کی تفصیل یہ ہے :-

	نام عمارت	مقدار رقم جو تعمیر میں صرف ہوئی
۱	قصر العروس	تین لاکھ درہم
۲	قصر المختار	پچاس ہزار درہم
۳	قصر الوحید	بیس ہزار درہم
۴	قصر الجعفری	ایک لاکھ درہم
۵	قصر الغریب	ایک لاکھ درہم
۶	قصر الشیدان	ایک لاکھ درہم
۷	قصر البرج	ایک لاکھ درہم
۸	قصر الصبح	پچاس ہزار درہم
۹	قصر الملیح	پچاس ہزار درہم
۱۰	قصر بستان الایتاخیہ	ایک لاکھ درہم

	نام عمارت	مقدار رقم جو تعمیر میں صرف ہوئی
۱۱	قصر التل	پچاس ہزار درہم
۱۲	قصر الجوسق	پانچ لاکھ درہم
	یہ ایک سنگلاخ میدان میں بنایا گیا تھا	
۱۳	جامع مسجد	ایک لاکھ پچاس ہزار درہم
۱۴	قصر برکوان	دو لاکھ درہم
	یہ قصر شاہزادہ معتز کے لئے بنایا گیا تھا	
۱۵	قصر القلائیہ	پچاس ہزار دینار
۱۶	قصر الغرد	دس ہزار درہم
	دریائے دجلہ کے کنارے پر تعمیر کیا گیا تھا	
۱۷	قصر الماحوذہ	پانچ لاکھ درہم
۱۸	قصر البہو	ڈھائی لاکھ درہم
۱۹	قصر اللؤلؤۃ	پچاس ہزار درہم

شہر کی تباہی

خلیفہ معتصم اور واثق کے عہد سے المنتصر بن المتوکل کے آخری عہد تک "سرمن رای" کی آبادی اور رونق دن بدن بڑھتی گئی لیکن جب مستعین سریر آرائے خلافت ہوئے تو ترکوں کو ملکی نظم و نسق میں زیادہ اقتدار حاصل ہو گیا یہاں تک کہ وہ خلیفہ کے عزل و نصب کے بھی مالک ہو گئے۔ ان ترک امراء کی عصبیت نے ملک کے اندر شدید اختلاف پیدا کر دیا۔ جس کی وجہ سے عباسی حکومت میں رخنہ پڑ گیا اور اس کا برا اثر سرمن رای کی خوشحالی پر پڑا۔ اس شہر کے عروج کا آفتاب نصف النہار پر پہنچ کر ڈھلنے لگا اور اس میں کمزوری اور انحطاط کے آثار شروع ہو گئے۔ امیر المومنین المعتضد باللہ وہ آخری خلیفہ تھے جو سیاسی مصلحت کی بناء پر "سرمن رای" کی اقامت ترک کر کے بغداد منتقل ہو گئے، اور بغداد دوبارہ دار الخلافہ قرار پایا۔ خلیفہ وقت کے نقل مکانی سے تمام اعیان سلطنت، وزراء اور علماء بھی سرمن رای سے منتقل ہو گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس وسیع، خوبصورت، پررونق اور عظیم الشان شہر کے سربفلک قصور شاہی عالیشان عمارتیں اور رعایا کے مکانات مکینوں سے یکدم خالی ہو گئے، اور چشم زدن میں شہر سنسان اور ویران ہو گیا اور ہر طرف ہو کا عالم نظر آنے لگا۔ اور دروازوں کے قیمتی جنگلے اور چھتوں کی نفیس شہتیریں اکھیڑ اکھیڑ کر بغداد پہنچا دی گئیں، صرف کرخ سامراء کی آبادی جو شہر سے فاصلہ پر تھی اپنی اصلی حالت پر محفوظ رہ گئی اور دوسرا مقام مشہد جہاں سرداب واقع ہے ویرانی سے بچ گیا۔

Marfat.com

تاریخی مقامات سامرا میں امام علی عسکری اور اپکے فرزند حسن عسکری کے مزارات ہیں، اور خلفاء میں سے واثق، المتوکل، المنتصر بن المتوکل، المعتز، المہتدی اور المعتمد بن المتوکل کی قبریں ہیں، اور ایک سرداب (تہ خانہ) جس کے متعلق جماعت شیعہ کا عقیدہ ہے کہ امام مہدی اسی تہ خانہ میں روپوش ہوگئے ہیں اس سرداب کے اوپر ایک قبہ تعمیر کر دیا گیا ہے جو جدید تعمیر میں سے ہے۔

سامرا کی موجودہ حالت ولایت بغداد میں ۶۵ میل کے فاصلہ پر دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر ٹیلے پر ایک چھوٹا شہر آباد ہے اور ضلعی کا صدر مقام ہے جس کی مردم شماری میں بائیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے، تھوڑی فوج بھی یہاں رہتی ہے، بغداد سے ریلوی لائن گئی ہے، شہر کی چاروں طرف فصیل ہے، لوگ مفلوک الحال ہیں، یہاں ہر سال بارہ ہزار سے زیادہ شیعہ زائرین امام علی الہادی اور امام حسن عسکری کی قبروں کی زیارت کو آتے ہیں، شہر سے جانب شمال تقریباً نصف میل کے فاصلے پر ایک منارہ ہے جس کی بلندی ۱۲۳ فٹ ہے، اس شہر میں مدرسہ، قصر اور دیگر عمارتوں کے آثار اب تک موجود ہیں۔

جولائی ۳۴ء

Marfat.com

(مولانا) عبدالسلام ندوی

ایک الم انگیز یاد

غرناطہ کے جشن فتح پر ایک عرب سیاح کے تاثرات

شام کی علمی سوسائٹی "المجمع العلمی العربی" کے صدر شیخ محمد کرد علی نے سنہ ۱۹۲۲ء کے موسم سرما میں اسپین کی سیاحت کی تھی۔ واپسی پر اپنے مشاہدات و تاثرات بعض ضروری تاریخی اضافوں کیساتھ "غابر الاندلس وحاضرہا" کے نام سے شائع فرمائے۔ کتاب کا ترجمہ عرصہ ہوا مکمل کر چکا ہوں لیکن اشاعت کی نوبت ابتک نہ آئی۔

ملک کے مختلف حصوں کی سیاحت کے بعد سیاح بڑی تمناؤں اور آرزوؤں کے ساتھ غرناطہ میں داخل ہوتا ہے شہر میں قدم رکھتا ہے تو کانوں میں جرس کی آواز آتی ہے دریافت کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ فتح غرناطہ کی یاد میں آج جشن مسرت ہے اور یہ آواز اس بزم سرور کے انعقاد کا اعلان ہے۔ ان الفاظ کو سنکر عرب سیاح کے قلب پر جو تاثرات طاری ہوتے ہیں ذیل میں انہیں کی ترجمانی کی گئی ہے امید ہے کہ یہ ذکر کرد علی کی طرح ہمارے دلوں کو بھی مجروح کئے بغیر نہ رہے گا۔

عبدالسلام ندوی

سال پر سال گزرتے رہے اور دل میں اندلس کی محبوب سرزمین کی زیارت کا شوق بڑھتا رہا کہ وہاں کے عمارات و آثار اور معابد و مصانع کا مشاہدہ و معاینہ ہوتا کہ افادہ و استفادہ اور تدبر و تفکر کا موقع ملے لیکن جب حالات مساعد ہوئے کہ اندلس میں عزت کے دنوں کے بعد وہاں کے پتھروں اور سنگریزوں میں پھر کر عبرت و نصیحت حاصل کیجائے۔ اور اس دیار میں عربوں کے کارناموں سے واقفیت بہم پہنچائی جائے۔ تو پہنچتے ہی ایسی ناگوار و تلخ چیز سا۔ جس نے ذکر و تذکیر کی ساری پاکیزگی کو مکدر کر دیا۔

میں غرناطہ میں ۲ فروری ۱۹۲۲ء کو پہنچا یہ وہی تاریخ ہے کہ جس دن بنی احمر کا آخری فرمانروا ابو عبداللہ غرناطہ سے نکلا تھا

Marfat.com

اسی دن عیسائی فاتحین کے ہاتھ میں احکام سلطنت منتقل ہوئے۔ میں شہر میں داخل ہوا تو جرس کی مسلسل آوازیں آرہی تھیں۔ یہ اس جشن مسرت کا اعلان تھا۔ جو ہر سال اسی دن اہل اسپین عموماً اور اہل غرناطہ خصوصاً اس خوشی میں منایا کرتے ہیں کہ آج ہی کا وہ مبارک دن تھا جب اسپین کی سرزمین عربوں کے وجود سے پاک ہوئی

اس دن یہ لوگ مختلف قسم کے جلسے کرتے اور محفلیں رچاتے ہیں اس تقریب مسرت میں شیخ غرناطہ کی طرف سے ایک عام دعوت بھی دیجاتی ہے۔ امریکہ کے آزاد کرانے والے جنرل واشنگٹن کے نام پر انہوں نے الحمراء کے قریب ایک مقام بنا رکھا ہے وہیں یہ مجلس دعوت منعقد ہوتی ہے اس دعوت میں شہر کے تمام معززین شریک ہوتے ہیں اور مست ہو ہو کر عربوں کے مقابلہ میں اپنے آبا و اجداد کی فتح و کامرانی پر مسرت و شادمانی کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ منظر دیکھ کر مجھے وہ شوم و نحوس دن یاد آگیا جس دن الحمراء کے بلند ترین برج پر ہلال کی جگہ صلیب نصب کی گئی تھی یہ گویا اشارہ تھا کہ اب عرب ملک سے بیدخل ہو چکے ہیں اور اسپینوں کو آخری فتح حاصل ہو گئی ہے۔

ابو عبداللہ اپنے خادموں اور حاشیہ نشینوں کے ساتھ دشمنوں کی طلب سے پہلے ہی الحمراء چھوڑ رہا ہے۔ جبل ثلج پر گذرتے ہوئے غرناطہ کی طرف مڑ مڑ کر دیکھ رہا ہے اور رو رہا ہے ماں دیکھتی ہے تو جھڑک کر کہتی ہے کہ:۔

لا تبک ملکاً کالنساء لم یستطع ان تحافظ علیہ کالرجال جس ملک کی مردوں کیطرح حفاظت نہ کر سکا اب اس پر عورتوں کی طرح ماتم نہ کر"

غرناطہ کی یہ عید مسرت ہر سال برابر منعقد ہوتی رہتی ہے یہ سلسلہ فتح سے اس وقت تک جاری ہے اور چار سو تیس[۴۳۹] سال گزرنے کے بعد بھی ہر سال دشمنوں پر اپنی فتح و کامیابی کا ذکر کیا جاتا ہے اور اس طرح اس دن کی یاد تازہ کیجاتی ہے جو انکی دینی اور قومی وحدت کی تکمیل کا پہلا دن تھا۔ حالانکہ انھوں نے اپنی آزادی اور غلامی کے لئے نہایت ناگوار طریقے اختیار کئے اور حد درجہ ناروا افعال کا ارتکاب کیا۔ عرب انکے ملک میں فاتحانہ داخل ہوئے تھے لیکن انھوں نے ذرہ برابر بھی کسی قسم کی بدعنوانی اور تعصب سے کام نہیں لیا۔ حالانکہ قوت و طاقت کے اعتبار سے انہیں اس قسم کے مواقع حاصل تھے۔

اس جشن کے دن عورتیں مرد بچے سب اپنی روحوں کو بیدار اور دلوں کو برانگیختہ کرتے ہیں کہ وہ عہد ماضی کی یاد سے عبرت حاصل کریں اور یقین کریں کہ سنہ ۱۴۹۲ء کا غلبہ اگرچہ علم پر جہل کا تسلط تھا لیکن انتقام بہرحال فراموش نہ ہونا چاہیئے خواہ اسے آٹھ سو برس ہی کیوں نہ گذر گئے ہوں۔

کیا عربوں کے لئے مناسب نہ ہوگا کہ وہ اس آخری دن کو جس دن کہ اندلس سے انکا اخراج عمل میں آیا تھا رنج و الم اور حزن و غم کا دن قرار دے لیں جو انتباہ و عبرت پذیری کے لئے وقف ہو اس دن مرثیئے پڑھیں، تعزیت کے اشعار سنائیں اور اس دردناک مصیبت کو یاد کریں جس میں کمی نہیں بلکہ ہمیشہ افزونی اور زیادتی ہی ہوتی رہیگی۔

کہتے ہیں کہ مراکش کے اندلسی باشندوں میں آج تک دستور ہے کہ جب باپ مرنے لگتا ہے تو اپنے سابق گھر کی تمام کنجیاں اس امید پر بیٹے کے سپرد کرتا ہے کہ اگر کبھی وہ اندلس پہنچیں تو مکانات کھول کر ان میں اتر سکیں حالانکہ اس سرزمین کو چھوڑے ہوئے آج چار سو برس ہو چکے ہیں جہاں انھیں عزت و عظمت اور یمن و سعادت نصیب تھی۔ گو لوگ اسے محال سمجھکر

Marfat.com

واہیات وخرافات سے تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن اسمیں شک نہیں کہ اس سے بہتر یا دآوری کی اور کوئی شکل نہیں ہو سکتی۔

ہر وہ عرب ملک جس نے اپنی آزادی کھو دی ہے چاہئے کہ ہر سال اس مصیبت پر مجلس ماتم منعقد کرے خصوصًا ان ممالک میں جہاں فاتحین نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور مفتوحین کے مشخصات سے بھی کھیل کرنا شروع کر دیا ہے۔ اسپین کو عربوں کے اخراج ہی پر قناعت نہیں ہے بلکہ اب انکی تمنا یہ ہے کہ مراکش کا علاقہ بھی ان سے خالی کرالیا جائے۔ وہ مراکش جہاں تیرہ سو برس سے انکی بنیادیں مضبوط ہو رہی ہیں اور جہاں انکی تہذیب و تمدن کا گہرا اور انمٹ نقش قائم ہے۔

وہ عرب جو اندلسی تمدن کو کتم عدم سے عالم وجود میں لائے تھے۔ اور اس ظلمت و تاریکی کے زمانہ میں وہ شاندار اعمال انجام دئے تھے جو آج بھی عقل کے لئے ایسی حیرت و استعجاب کا باعث ہیں کہ اگر نہایت ہی قوی اور موثق شہادتیں موجود نہ ہوتیں تو دیکھنے والے کو اسکا یقین آنا دشوار تھا۔ اگر انھیں اطمینان و آزادی کی سانسیں نصیب ہوں تو کیا اس دور تہذیب و ترقی اور اس عہد نور و تابناکی میں وہ اپنے آبا و اجداد کے کارناموں کی تجدید سے بھی عاجز ہیں یورپ کی بعض حکومتیں مشرق سے نبرد آزما ہیں اور عنقریب حفاظت دیار و آثار کے نام پر انھیں غلبہ حاصل ہو جانیوالا ہے ان میں پیش پیش اسپین و پرتگال ہیں۔ وہ اسپین و پرتگال جنھوں نے کل "مستبدین" سے انتقام لیا تھا لیکن آج وہی حریت نواز ہیں کہ عربوں کی آزادی کے بارہ میں انکے کانوں میں جوں بھی نہیں رینگتی ہے۔

یورپ کی سب سے کمزور حکومت جسکے باشندوں کی تعداد کسی طرح ایک عرب ملک کے برابر نہیں پہنچتی رات دن اپنے آثار و نشانات کو یاد کرتی رہتی ہے اور اپنے آبا و اجداد کے مفاخر و محاسن اور اعمال و افعال کو بڑے فخر و مباہات سے بیان کرتی رہتی ہے وہ نہ تو اپنے "محسنوں" کے احسان کو فراموش کرتی ہے اور نہ اپنے "گناہگاروں" کے گناہوں اور جرموں کو بھولتی ہے۔

عرب اپنی قوت و طاقت کے زمانہ میں جنوبی یورپ میں داخل ہوتے تھے اور جزیرہ نما ایبریا (اسپین) صقلیہ اور سردانیہ میں مہذب و متمدن حکومتیں قائم کی تھیں۔ ان ممالک کے باشندوں کی اصطلاح میں یہ بہت بڑا جرم تھا جسکا عربوں سے ارتکاب ہوا لیکن کیا یہ انصاف کی بات نہیں کہ یہ جرم (اگر جرم ہے) ان احسانات کے بدلہ سب معاف کر دیں جو فاتحین نے علوم و معارف۔ تہذیب و تمدن، آداب و اخلاق اور فنون و صنایع کے رنگ میں ان ممالک پر کئے ہیں۔

آج ہر قوم تہذیب و تمدن کی اشاعت میں مساعی ہے اور چاہتی ہے کہ اپنے ملک پر خود ہی حکمراں ہو کیا وہ عرب جنھوں نے اندلس میں وحشت و بربریت اور جہالت و خرافات کے بجائے ایک ترقی یافتہ تمدن اور محکم نظام حکومت قائم کر دیا تھا۔ اس درجہ تک پہنچ گئے ہیں کہ کیا وہ ان چھوٹی چھوٹی مغربی حکومتوں سے بھی پست ہیں جو یکے بعد دیگرے آزادی کی برکات سے مستفید ہو رہی ہیں؟

نومبر ۱۹۳۲ء

کراچی

(از جناب درخشاں صاحب ابدالی مقیم کراچی)

یہ شہر جو کبھی ماہی گیروں کا چھوٹا سا قریہ تھا "اب ہندوستان کا ہوائی دروازہ، ایک اعلیٰ بندرگاہ، سندھ کا دارالسلطنت اور حکومت پاکستان کا پایہ تخت ہے۔ بحیرہ عرب کے ساحل پر ہونے کی وجہ سے غیر ملکی مالوں کی درآمد برآمد کی منڈی اور پنجاب و سندھ کی تجارت کا مرکز ہے۔

قدیم کراچی نے ترتیب مثلث نما خلیج کے سرے پر دریائے لیاری پر واقع ہے، سنہ ۱۷۲۹ء میں اس قصبہ کی بنیاد پڑی، قدیم کراچی کے قلعہ کے آثار "میٹھادر" اور "کھارادر" آج بھی موجود ہیں، چونکہ یہ شہر "کلاچی" نام کے ایک زمیندار کے بنائے ہوئے تالاب کے کنارے آباد تھا اس لئے اس کا نام "کلاچی جو گھاٹ" پڑا اور آج بھی کراچی ہے؛

قدیم کراچی کا رقبہ صرف ۴۲ ایکڑ تھا اور آج کا کراچی ۲۰ مربع میل کو محیط ہے اور توسیع کے لئے لامحدود اراضی موجود ہے۔

سنہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کی بنا پر کراچی کی آبادی ۶ لاکھ تھی مگر اس وقت بڑھ کر آبادی ۱۰ لاکھ ہو گئی ہے۔ یہاں کے باشندے ہر نسل و قوم سے تعلق رکھتے ہیں، عرب، ایرانی، حبشی، یوروپین اینگلو انڈین، پارسی، یہودی، قومیت و مذہبیت کے افراد کراچی کی سڑکوں پر چلتے پھرتے ہیں۔ ایرانیوں کے ہوٹل اور چائے خانے یہاں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ گزشتہ دوسری جنگ عالمگیر نے بر میوں کو کراچی میں پناہ گزینی پر مجبور کیا، چنانچہ یہاں برمی پناہ گزیں بھی ملتے ہیں۔ حبشیوں کا محلہ بھی بسا ہوا ہے، یہودیوں کی بھی خاصی تعداد ہے۔ یہاں ہر مذہب و ملت کی عبادت گاہیں موجود ہیں۔

کیماڑی۔ پرانا شہر۔ اور صدر۔ کراچی کے یہ تین حصے ہیں، ہوا بندر، کلفٹن، کیماڑی (کراچی کی بندرگاہ) جزیرۂ منوڑہ۔ ملیر جو سبزیوں اور باغوں کے لئے مشہور ہے، منگا پیر جہاں گرم چشمے ہیں اندر ایک بزرگ کا مزار ہے، اس کو کراچی کا راجگیر سمجھنا چاہئے، یہ یہاں کی سیر گاہیں ہیں۔ یہاں کہا جاتا ہے کہ برسات کا وجود ہی نہیں تھا، مگر اب کچھ حالات موسم بدل گیا ہے۔ ہلکی برسات ہوتی ہے۔ سردی کم مگر چند دنوں جب کوئٹہ کی ہوا چلتی ہے تو سردی سخت پڑتی ہے اور گرمیوں کا موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ کراچی میں ہمہ وقت ہوا کے چلتے رہنے سے گرمی کی تکلیف نہیں ہوتی، لو اور گرم ہوا کا وجود نہیں، شاید ایک آدھ دن حبس کی سی تکالیف ہو تو ہو۔ شبنم میں

Marfat.com

سونے کی مئی جون میں بھی ضرورت نہیں پڑتی، راتیں خنک ہوتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ یہاں کی آب و ہوا میں خشکی ہے مگر ہے مرطوب۔

شہر میں چیف کورٹ کی عمارت، سندھ اسمبلی ہال، کسٹم آفس، عجائب خانہ، چڑیا خانہ، آرام مسجد، کراچی میونسپل کارپوریشن گورنمنٹ ہاؤس، فریر ہال یہاں کی قابل دید عمارتیں ہیں۔

اسی ذیل میں غلام حسین خالق دینہ ہال کا نام بھی آتا ہے، بندر روڈ پر گزرتے ہوئے جب ایک نوارد کی اس پر نظر پڑتی ہے تو علی برادران کے مشہور تاریخی مقدمہ کراچی کی یاد آجاتی ہے۔ علی برادران کے تاریخی مقدمہ سماعت اسی ہال میں ہوئی تھی۔ یہ ہال شہر کی جلسہ گاہ اور پبلک لائبریری ہے۔ یہاں ہر دوسرے تیسرے کسی نہ کسی نوع کا جلسہ ہوتا رہتا ہے۔

یہاں کی آبادی زیادہ تر فلیٹوں پر مشتمل ہے، جمشید کوارٹر میں بنگلوں کی بہار ہے، مکانات زیادہ سے زیادہ پنج منزلے ہیں۔ جگہ جگہ پارک ہیں، جو تفریح گاہ کے علاوہ جلسہ گاہ کا بھی کام دیتے ہیں۔ میکلوڈ روڈ میں انگریزی کمپنیوں کے شاندار دفاتر ہیں۔

سٹی اور چھاؤنی اسٹیشن شہر کے یہ دو ریلوے اسٹیشن اور ڈرگ روڈ ہوائی مستقر ہیں۔ اسٹیشن کی عمارت کچھ زیادہ شاندار نہیں۔

یہاں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور اب اردو کا مستقبل بہت روشن ہے۔ نہ صرف پاکستان کی سرکاری اور تعلیمی زبان اردو ہونے ہی کی وجہ سے، بلکہ ہندوستان کے ارباب علم و فن کے کراچی آجانے کی وجہ سے کراچی میں اردو بہت زیادہ فروغ پا رہی ہے اور پانچگی

سندھی تو خیر صوبائی زبان ہی ہے، کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی طرح یہاں بھی

انگریزی کافی در خور ہے ایک "کلاک" لو اور "کلاک" پہلے عوام کا روزمرہ ہے اور مسالے بیچنے والوں کی صدا یہ ہے کہ "آگیا مسالے والا، آگیا" "بیسٹ" "والا، آلو لو آلو" "ٹماٹو لو" انگریزی میں مافی الضمیر ادا کرنے والے اور کم از کم اس کا سہارا لینے والے تو زیادہ ملیں گے، سندھی کے علاوہ "مکرانی" زبان عوام میں رائج ہے۔

پنجابی الفاظ بھی سنے جاتے ہیں۔

"چاچا (چچا)" "بابوجی" "اور "لالہ" کسی کو باعزت طور پر مخاطب کرنے میں رائج ہیں، اور "سائیں" کے لفظ سے تخاطب تو بڑی عزت افزائی ہے۔ ہر نووارد کو تعجب سے اس وقت جب وہ کسی سے راستوں کے لئے رہنمائی کا طالب ہو، یہاں کے چلنسار الفاظ "باجو (بازو)" اور "چھیڑے پر" (کنارے اور سرے پر) سے گھبراہٹ ہوتی ہے، ہوٹلوں

Marfat.com

اور دو کالونوں میں) "سالنہ" اور "مخلاص" کی گردان بھی خوب ہی رہتی ہے۔

یہاں کی معاشرت پر انگریزیت بری طرح چھائی ہوئی ہے۔ معزز گھرانوں میں صوفوں کی بہار ہے اور سڑکوں پر تیلوئیں متحرک نظر آتی ہیں۔ برافگندہ نقابی بھی نمایاں ہے اگرچہ چوٹی کے گھرانوں میں شدت کے پردے کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ سینماؤں کے سامنے فرزندانِ توحید کا لہریں لیتا ہوا سمندر بھی نظر آتا ہے اور ہوٹلوں، ریسٹورنٹوں اور کیفوں میں بے فکروں کا ہجوم بھی ہر وقت دکھلائی دیتا ہے۔

سندھ کا صوبہ ۱۹۳۵ء کی اصلاحات میں قائم ہوا، ورنہ اس سے پہلے یہ صوبہ بمبئی کی عملداری میں تھا۔ یہاں کا تعلیمی نظام ۱۹۴۶ء تک بمبئی یونیورسٹی سے منسلک تھا۔ ۱۹۴۷ء میں سندھ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اس کے پہلے وائس چانسلر مسٹر اے۔ بی۔ حلیم، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق پرو وائس چانسلر ہیں۔

سرکاری اعلیٰ تعلیم گاہوں، میڈیکل کالج، لا کالج وغیرہ کے علاوہ "سندھ مدرسۃ الاسلام" مسلمانوں کی قدیم مشہور تعلیم گاہ ہے، یہ ہائی اسکول، آرٹ ڈگری کالج اور سائنس کالج پر مشتمل ہے۔ یہاں فارسی لازمی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے بچے کی تعلیم کے لئے مدرسہ کی متعدد شاخیں قائم ہیں: کالج کے احاطے میں دو مسجدیں اور ابتدائی درجوں میں قرآن وفقہ کی تعلیم کا بھی التزام ہے۔

کراچی میں عربی کی واحد تعلیم گاہ "مدرسہ مظہر العلوم" ہے، اس کے موجودہ ناظم جناب مولانا محمد صادق صاحب ہیں جو جمعیۃ العلمائے ہند دہلی میں سندھ کی نمائندگی کرتے ہیں۔

یہاں کے مسلم تعلیمی اداروں کے سلسلے میں "جامعہ اسلامیہ ویتیم خانہ" کا ذکر ضروری ہے۔ یہ سندھ کے مشہور قومی کارکن حاجی سر عبداللہ ہارون مرحوم کی یادگار ہے اور اُن ہی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ ۱۹۲۷ء ۱۳۴۶ھ میں قائم ہوا، حاجی صاحب مرحوم کا مزار جامعہ کے احاطے میں ہے، یہاں سندھی واردو کے علاوہ مڈل تک انگریزی میں تعلیم دی جاتی ہے اور صنعت و حرفت سکھائی جاتی ہے اس یتیم خانہ کے صنعتی نمائشی کمرہ میں یتامیٰ کے صنعتی نمونے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے، یہاں مذہبی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام ہے،

بوہروں، کچھیوں، اور میمنوں کے اپنے مکاتب آزادانہ چل رہے ہیں۔

پبلک لائبریریوں میں قابل ذکر انجمن ترقی اردو کراچی کا کتب خانہ ہے، شہر کا مرکزی اردو کتب خانہ یہی ہے۔ یہاں اردو کتب کا معقول ذخیرہ ہے، مدرسہ مظہر العلوم سے بھی ایک گنجینہ:

Marfat.com

منسلک ہے، چونکہ یہ مدرسہ کا کتب خانہ ہے اس لئے اصل ذخیرہ تو عربی کتابوں کا ہے، اردو فارسی کتب بھی ہیں۔ نزیر ہال کی لائبریری بھی خاصی ہے۔ مگر یہاں اردو کا ذخیرہ نہیں ہے۔ خالق دینہ ہال میں لائبریری بھی ہے، پاکستان ریسرچ لائبریری بھی قائم ہوئی ہے، انجمن ترقی اردو دہلی بھی کل پاکستان انجمن ترقی اردو" کے نام سے کراچی میں قائم ہوگئی ہے، ابتدائی انتظامات ہو رہے ہیں، اور ان سطور کی اشاعت تک امید ہے کہ وہ باضابطہ کام شروع کر دے گی۔ "بابائے اردو" ــــ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب معتمد انجمن اپنے رفقائے کار، مینیجنگ کمیٹی اور سید ہاشمی فرید آبادی کے ساتھ یہاں انتظامات میں منہمک ہیں۔

تقسیم کے بعد جو انقلابی آندھی آئی اس نے مختلف علمی اداروں کو یہاں لا بٹھایا چنانچہ جالندھر کا مدرسۃ البنات اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کا صدر دفتر جو دہلی میں تھا اب کراچی میں قائم ہے۔

دہلی کے اخبارات "انجام" "جنگ" "قومی گزٹ" "مسلمان" اور علامہ راشد الخیری کا یادگار رسالہ "عصمت" اور بعض دوسرے جرائد و رسائل اب دہلی کی بجائے کراچی سے نکل رہے ہیں۔ ڈان انگریزی روزنامہ بھی اب کراچی سے شائع ہوتا ہے، "الوحید" یہاں کا بہت قدیم سندھی روزنامہ ہے اور صوبائیت کی تبلیغ کے لئے بدنام بھی اردو اخبارات، روزنامے، ہفتہ وار، مصور و غیر مصور روز نئے نئے دکھلائی دیتے ہیں۔ ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد سے یہ رفتار ترقی پر ہے، اخبارات کا معیار بھی بلند ہو رہا ہے اسی لئے نئے اخبارات پرانے اخبارات کی جگہ لے رہے ہیں۔ رسائل جو پہلے عنقا تھے اب ان کی پیداوار بھی بڑھ گئی ہے اور ہر ماہ نئے نئے رسالے مطلع صحافت پر جلوہ گر ہوتے ہیں، مگر ابھی تشنگی ذوق باقی ہے۔ ڈان کا شاندار اردو ایڈیشن بھی نکلنے لگا ہے۔

علمی و ادبی انجمنوں کا بھی قیام ہو رہا ہے مشہور ادبا، علما اور شعرا کی موجودگی نے علمی و ادبی نشستوں کی رونق بڑھا دی ہے، مشاعروں کی لے بڑھ گئی ہے۔ دہلی کے حکما اور اہل صنعت و دستکار، بمبئی کے تجار، اجمیر، یو پی، سی پی، اور ریاستی باشندے بہ کثرت نظر آتے ہیں۔ دہلی کی "نہاری" اور مشہور "حلوہ سوہن" اور لکھنؤ کا زردہ (تمباکو) اب کراچی میں نایاب نہیں۔ غیر ملکی سیاح پہلے بھی آتے تھے، مگر دنیا کے گوشہ گوشہ سے مدبروں کی آمد جتنی اب ہے پہلے اتنی نہ تھی۔

ندیم ماہ جولائی ۴۸ء

Marfat.com

مصر کی نئی سیاسی تشکیل

(از جناب منصور کاکوی)

امریکہ کی جنگ آزادی کے بعد برطانی حکومت کی تمام تر توجہ مصر اور ہندوستان کی طرف رہی، یوں بھی سیاسی حیثیت سے مصر ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ امریکہ اور ہندوستان کی طرح مصر کے بازار میں بھی ایک عرصہ تک فرانس اور انگلینڈ میں چھیڑ چھاڑ اور کشمکش رہی۔ مصر کو ایشیا کی کنجی کہا جاتا ہے اور یہ بالکل درست ہے۔ یورپ کی سیاسیات میں "مشرقی مسئلہ" (Eastern Question) صرف ترکی سلطنت کو ختم کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ ترکی کی وسیع سلطنت آپس کی نا اتفاقی، حکمرانوں کی نا اہلی اور صدیوں کی مسلسل جنگوں کی وجہ سے دم توڑ رہی تھی اور یورپ کے گرگ باراں دیدہ موقع کے منتظر تھے جب مرکزی سلطنت کمزور ہو گئی تو ماتحت صوبے خود مختار ہوتے گئے۔ مصر کا گورنر محمد علی برائے نام سلطان ترکی کا باجگذار رہ گیا۔

۱۸۲۱ء میں یونانیوں نے سر اٹھایا، روس، فرانس اور انگلینڈ ان کی امداد کر رہے تھے۔ گرچہ محمد علی پاشا نے سلطان کی مدد بھی کی لیکن ۱۸۲۷ء میں انگریزی اور فرانسیسی بیڑے نے ترکی بیڑے کو نوارینو (Navarino) میں شکست دے کر سلطان کو یونان کی آزادی تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہیں سے مصر میں فرانسیسی اور انگریزی اقتدار کی ابتدا ہوتی ہے۔ محمد علی پاشا کا انتقال ۱۸۴۹ء میں ہوا۔ اس نے اپنے دور میں جدید تعلیم کو رواج دینے کی کوشش کی۔ طلبہ کی ایک بڑی تعداد فرانس تعلیم کے لئے بھیجی گئی۔ نئے مدرسے قائم کئے گئے اور اصلاحات نافذ ہوئیں۔ محمد علی کے بعد اس کا بیٹا اسمٰعیل جانشین ہوا۔ بیٹے نے باپ کی پیروی کی۔ مصر میں نظم و نسق حکومت کی پھر سے تنظیم کی۔ محمد علی کے بنائے ہوئے فوجی اسکول کو از سر نو جاری کیا۔ جنگی گھر تعمیر کیا۔ اور بہت سے تعلیمی ادارے بنائے۔ ریلوے لائن کی توسیع کی اور نہر سویز کے کنارے بندرگاہ تعمیر کی گئی، ان تمام اسکیموں کے لئے کثیر رقم کی ضرورت تھی، اس کے علاوہ وہ خود بھی بڑا فضول خرچ تھا اور مصر کا خزانہ خالی، روپیہ کی صرف ایک صورت تھی اور وہ قرض، دھڑا دھڑ فرانس اور انگلینڈ سے قرض لینا شروع کیا جب یہ بھی ناکافی ہوا تو سویز کمپنی کے حصے کو فروخت کر دیا۔

'ڈزرائیلی' اس وقت برطانیہ کا وزیر اعظم تھا اس نے وزارت کے ممبروں سے مشورہ کئے بغیر خدیو کے ۱۷۶۶۰۲ حصے ۲۹۷۶۵۸۲ پونڈ میں خرید لئے۔ پھر بھی مصر کی مالی حالت خراب ہوتی گئی۔ جب فرانس اور انگلینڈ کا لگا ہوا سرمایہ ڈوبتا نظر آیا تو اسمٰعیل پاشا کو ایک آئینی وزارت بنانے پر مجبور کیا گیا، ایک انگریز مشیر مالیات مقرر ہوا۔ اور ایک فرانسیسی امور عامہ کا انچارج، لیکن چند ہی مہینوں کے بعد اسمٰعیل کی سازش سے وزارت ٹوٹ گئی، سازش کا پتہ لگ گیا اور اسمٰعیل کو معزول کر کے اس کے لڑکے توفیق کو سلطان بنایا گیا۔ پھر نومبر ۱۸۷۹ء میں ایک دہری (Dual) حکومت قائم کی گئی۔ انگریزی اور فرانسیسی اقتدار مصر کے باشندوں کے لئے ناقابل برداشت تھا، بیرونی اثرات کے خلاف لوگوں میں نفرت و عداوت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ اس وقت مصر سید جمال الدین افغانی کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ گو توفیق کی ایما سے انہیں مصر چھوڑنا پڑا۔ لیکن ان کا لگایا ہوا پودا آخر نخل بار آور ثابت ہوا۔ مصر کی سیاسی بیداری جمال الدین افغانی کی شرمندۂ احسان ہے۔ تمام قابل ذکر سیاسی رہنما ان کے شاگرد اور شاگردوں کے شاگرد تھے، پان اسلامیزم کی تحریک نے آگ پر تیل کا کام کیا اور ملک میں غیر ملکی اقتدار کے خلاف جد و جہد شروع ہو گئی۔ احمد عرابی پاشا اس تحریک کا قائد تھا۔ عرابی ایک معمولی کسان کے گھر پیدا ہوا تھا لیکن اپنی غیر معمولی صلاحیت اور لیاقت سے وزیر جنگ کے عہدے تک پہنچ گیا۔ عوام نے بھی اس تحریک کو لبیک کہا، عرابی پاشا اور انگریزی فوج میں کھلی ہوئی جنگ ہوئی۔ خدیو نے فرار ہو کر اسکندریہ میں جان بچائی۔ برطانیہ نے ترکی اور فرانس سے اس شورش کو دبانے کے لئے امداد طلب کی، لیکن دونوں کے انکار کرنے پر اس مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری خود اس نے اپنے سر لی۔ سر گارنٹ ولزلی کے ماتحت ایک فوج بھیجی گئی۔ عرابی پاشا کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ اور لارڈ ڈفرن کو جو قسطنطنیہ میں برطانی سفیر تھا۔ ہائی کمشنر بنا کر مصر بھیجا گیا۔ جب

Marfat.com

شورش ختم ہو گئی تو خدیو اسکندریہ سے واپس آیا اور شریف پاشا نے وزارت ترتیب دی۔ ۱۸۸۲ء کے بعد سے مصر پر برطانیہ کا پنجہ سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔ یہ زمانہ یورپ میں بسمارک کے عروج کا تھا۔ جرمنی کی بڑھتی ہوئی طاقت فرانس اور انگلستان کے لئے ایک مستقل خطرہ بنی ہوئی تھی۔ اس لئے انگلستان اور فرانس جرمنی کے خلاف ایک متحدہ محاذ کی سخت ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ آخر ۱۹۰۴ء میں دونوں ملکوں میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے فرانس نے برطانیہ کو مصر میں اور برطانیہ نے فرانس کو مراکش میں بالکل آزاد چھوڑ دیا۔

قومی تحریک

لیکن قومی تحریک کی جو آگ برسوں قبل سلگ چکی تھی اور جو ایک بار ۱۸۸۱ء میں بھڑک بھی اٹھی تھی اندر ہی اندر بڑھتی گئی اور ۱۹۰۵ء میں مصطفیٰ کامل کی قیادت میں جدوجہد شروع ہو گئی۔ اخبار اور پلیٹ فارم دونوں سے اس تحریک کی آواز بلند ہونے لگی۔ جزیرہ نما سینائی کے بدوؤں نے بھی کچھ ہنگامہ کیا لیکن ان کو بھی سختی سے دبا دیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں مصطفیٰ کامل کی موت سے قومی تحریک میں پھوٹ پڑ گئی۔ اسی سال بطرس پاشا نے وزارت بنائی۔ بطرس پاشا کے خلاف نفرت اور حقارت کا جذبہ اتنا بڑھ گیا کہ وزارت قائم کرنے کے تیسرے دن اس کو قتل کر دیا گیا۔ اور محمد سعید پاشا وزیر اعظم ہوئے۔ ۱۹۱۱ء میں لارڈ کچنر کو مصر بھیجا گیا اور مجلس قانون ساز کو پھر سے ترتیب دیا گیا۔ اس سے پہلے دو ایوان تھے لیکن ابھی دونوں کو ایک کر دیا گیا۔ ممبروں کی کل تعداد ۸۳ رکھی گئی جس میں ۶۶ عوام کے منتخب کردہ اور ۱۷ حکومت کے نامزد کئے ہوئے تھے۔ ایوان کے صدر اور نائب صدر کی نامزدگی کا اختیار بھی حکومت کو تھا، انتظام سلطنت کی اصلاح اور کسانوں کو سود خواروں سے نجات دلانے کی کوشش بھی کی گئی لیکن قومی تحریک جو شروع ہو چکی تھی وہ بڑھتی ہی گئی۔ اس درمیان میں خدیو مصر، وزیر اعظم اور لارڈ کچنر کو قتل کرنے کی سازش کی گئی لیکن قبل از وقت اس کا پتہ لگ گیا اور سازش ناکامیاب رہی، نئے دستور کے مطابق جو اسمبلی بنی اس کے صدر سعد زاغلول پاشا ہوئے لیکن یہ دستور خدیو کو بالکل ناپسند تھا اسلئے انکی ایسی سازش کی کہ زاغلول پاشا کو مستعفی ہونا پڑا۔ زاغلول پاشا کے بعد حسین رشدی نے قلمدان وزارت سنبھالا، لیکن تحریک آزادی جاری رہی، ساتھ ساتھ وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہیں یہاں تک کہ جنگ عظیم شروع ہو گئی اور مصر کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

جنگ عظیم اور برطانی انتداب

جب جنگ عظیم شروع ہو گئی تو لارڈ کچنر کو مصر سے واپس بلا کر وزیر جنگ بنایا گیا، جنگ شروع ہونے کے قبل خدیو مصر عباس حلمی دوم قسطنطنیہ گیا ہوا تھا۔ مصر کی اسمبلی توڑ دی گئی اور ۱۸ دسمبر ۱۹۱۶ء کو حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ ——— ترکی کے اقدام سے جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس کے پیش نظر اب سے مصر برطانیہ انتداب میں رہے گا۔ ترکی کا اقتدار ختم ہو گیا اور ملک معظم کی حکومت مصر اس کے مفاد اور اس کے باشندوں کی جان و مال کی حفاظت کے لئے تمام ضروری کارروائی کریگی۔

۱۸۸۲ء کے قریب مسٹر گلیڈ اسٹون نے اعلان کیا تھا کہ برطانیہ کے عزائم ہرگز یہ نہیں ہیں کہ مصر کو اپنی سیادت میں لیا جائے لیکن ۱۹۱۴ء میں بالکل اس کے خلاف کام کیا گیا اور مصر کو برطانیہ کی محافظت میں لے لیا گیا، اس اعلان کے دوسرے ہی دن خدیو عباس حلمی کو معزول کر کے شاہزادہ حسین کامل کو خدیو مصر بنایا گیا۔ حسین کامل کی حکومت بہت کم دنوں رہی، ان کے بعد فواد تخت نشین ہوئے جو ۱۹۳۶ء کے اوائل تک حکمران رہے۔ مصر کے ہائی کمشنر سر میکموہن مقرر ہوئے اور ان کے ہاتھ میں مصر کے خارجی معاملات کا چارج دیا گیا۔ برطانیہ کی اس کارروائی سے تحریک آزادی کی شدت اور بڑھ گئی، طلبہ نے بھی اس میں خوب حصہ لیا۔ سر میکموہن کے بعد سر ریجنالڈ ونگیٹ ہائی کمشنر ہو کر مصر آئے۔ صلح نامہ ورسائی کے وقت امریکہ کے صدر مسٹر ولسن نے جو اصول (Self - deter - mination) مرتب کئے تھے، اس کا اثر مصر کے لئے بہت دور رس تھا اس اصول کے مطابق ہر ملک کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ آپ کرے، لیکن اس کے باوجود عراق، فلسطین اور مصر پر برطانیہ کا، مراکش اور شام پر فرانس کا انتداب قائم ہو گیا۔ اور (Self determination) کا اصول دھرا کا دھرا رہ گیا۔ لیکن مصر کی تحریک آزادی بڑھتی ہی گئی۔ سعد زاغلول پاشا نے "وفد" کی صورت میں لندن جا کر اپنے مطالبہ کو پیش کرنے کی اجازت طلب کی لیکن حکومت نے اجازت نہ دی، اس پر وزارت نے استعفیٰ داخل کر دیا۔ 'وفد' کی (وطنی) تحریک اتنا زور پکڑ گئی کہ مارشل لا جاری کرنا پڑا۔ زاغلول پاشا کو تین جان نثار ساتھیوں کے ساتھ گرفتار کر کے ۱۹۱۹ء میں مالٹا بھیج دیا گیا۔ قاہرہ میں مظاہرے ہوئے، جلسے کئے اور جلوس نکالے گئے، سپاہیوں پر حملہ

Marfat.com

کیا گیا۔ ریلوے لائن اکھاڑ دی گئی، تار برقی کے ستون کاٹ دیے گئے۔ دیروت اسٹیشن پر ایک انگریز انسپکٹر اور چند دوسرے فوجی افسروں کو دن دھاڑے گاڑی میں قتل کر دیا گیا۔ پورے ملک میں تحریک بجلی کی لہر کی طرح پھیل گئی۔ جامعہ ازہر کے طلبہ نے بھی خوب خوب حصہ لیا۔ اس شورش کو دبانے کے لئے لارڈ اللنبی کو فرانس سے ہائی کمشنر بنا کر مصر بھیجا گیا۔ زاغلول پاشا اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہا کر دیے گئے۔ برطانی حکومت نے اس ہنگامہ اور شورش کے اسباب معلوم کرنے کے لئے لارڈ ملز کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا، کمیشن کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی رائے دے کہ مصر کے لئے کون سا دستور بہتر ہوگا۔ لیکن مصر میں اس کمیشن کی سخت مخالفت ہوئی اور کمیشن کے ممبروں کو جان کے لالے پڑ گئے اور ایک بار تو وزرا کو قتل کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ کمیشن جہاں گیا مکمل بائیکاٹ کیا گیا۔ اس پر برطانیہ نے مصالحت کا ہاتھ بڑھایا۔ سعد پاشا اپنے سات رفقا کے ساتھ لندن آئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ مصر کو آزاد کر دیا جائے۔ لیکن سمجھوتہ کی گفتگو آگے نہ بڑھ سکی اور یہیں پر ختم ہوگئی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں عدلی پاشا کی پارٹی طاقتور تھی، برطانیہ نے اعلان کیا کہ ملک معظم کی حکومت ملز رپورٹ کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ اب محافظت مصری برطانی تعلقات کے لئے تشفی بخش حل نہیں ہے۔ ملز کمیشن کی سفارشات کے متعلق ملک معظم کی حکومت ابھی کسی قطعی فیصلے پر نہیں پہنچی ہے۔ لیکن حکومت برطانیہ خدیو کے نامزد کیے ہوئے وفد سے گفتگو کرنا چاہتی ہے کہ انتداب کے بجائے کوئی ایسا دستور مرتب کیا جا سکے جو ایک طرف برطانی مفاد کی حفاظت کا ضامن اور دوسری طرف مصر کے باشندوں کے مطالبات پورا کرے۔ ——— عدلی پاشا کی پارٹی مضبوط تھی، اس لئے انہوں نے وزارت بنائی، اور سعد پاشا کو اشتراک کی دعوت دی۔ قوم پرستوں نے نئی وزارت کی مخالفت کی، کئی مقامات پر ہنگامہ اور فساد برپا ہوا۔ جولائی سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک مصری وفد لندن گیا، اس وفد کے رہنما عدلی پاشا تھے، عدلی پاشا نے مطالبہ کیا کہ برطانیہ اپنی فوج نہر سویز کے کنارے سے ہٹالے، لیکن حکومت برطانیہ نے یہ شرط قبول نہ کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بار پھر مصالحت کی گفتگو ناکامیاب ہوئی۔ عدلی پاشا لندن سے خالی ہاتھ مصر واپس آئے اور آکر استعفا داخل کر دیا۔ مصالحت نہ ہونے سے ملک میں قومی تحریک پھر زور پکڑ گئی، زاغلول پاشا اور دوسرے لوگوں کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ قتل کے واقعات عام ہو گئے۔ اور قاہرہ کی حالت بہت نازک ہوگئی۔ لارڈ اللنبی ہاتھ میں اپنی سفارشات اور جیب میں اپنا استعفا لیکر لندن گئے۔ ۲۸ فروری سنہ ۱۹۲۲ء کو برطانیہ نے اعلان کیا کہ

(۱) مصر سے برطانی انتداب ختم ہوتا ہے اور مصر کی آزادی تسلیم کی جاتی ہے۔

(۲) حکومت مصر جب عام معافی کا اعلان کر دیگی تو مارشل لا ختم ہو جائے گا۔

(۳) جب تک دوستانہ گفتگو اور رائے سے کوئی بات طے نہ ہو اس وقت تک کے لئے حسب ذیل امور ملک معظم کی حکومت کیلئے مخصوص رہیں گے:-

(الف) مصر میں حکومت برطانیہ کے ذرائع رسل و رسائل کی حفاظت۔

(ب) بیرونی حملے سے مصر کی حفاظت۔

(ج) اقلیت اور غیر ملکی باشندوں کا تحفظ۔

(د) جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو سوڈان کی حیثیت علیٰ حالہ قائم رہیگی۔

گرچہ برطانیہ نے آئینی طور پر مصر کی آزادی تسلیم کر لی، لیکن یہ آزادی نام کی تھی (۱) نہر سویز کی حفاظت۔ (۲) غیر ملکی باشندوں کی حفاظت۔ (۳) ذرائع رسل و رسائل کی حفاظت۔ (۴) سوڈان پر برطانی قبضہ۔ اتنی حفاظتوں کے آگے مصر کی آزادی بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی۔

ابکی بار ثروت پاشا وزیر اعظم ہوئے۔ لیکن خدیو اور وزارت سے نہ بن سکی۔ ثروت پاشا کے بعد توفیق پاشا وزیر اعظم ہوئے، اسی زمانہ میں پھر تحریک شروع ہوگئی۔ تین مصری طالب العلموں نے پروفیسر ٹیوبی رابسن کو مار ڈالا۔ توفیق پاشا چاہتے تھے کہ سب سے پہلے دستور کا اعلان کر دیا جائے، اس پر خدیو سے مخالفت ہوگئی اور ان کو استعفیٰ دے دینا پڑا، مارچ سنہ ۱۹۲۳ء میں یحییٰ ابراہیم پاشا نے وزارت ترتیب دی اور اپریل سنہ ۱۹۲۳ء میں دستور کو مشتہر کر دیا۔

نئے دستور نے دو ایوان رکھے، ایک مجلس النواب (Chamber of Deputies) اور دوسرا مجلس الشیوخ (Senate) ہاؤس آف ڈیپوٹیز کے ارکان کی تعداد ۲۰۰ رکھی گئی اور ان کا انتخاب پانچ سال کے لئے رکھا گیا۔ سینٹ کے ⅖ ممبر خدیو کے نامزد اور ⅗ منتخب رکھے گئے اور وزارت کو سینٹ کے سامنے جوابدہ قرار دیا گیا۔ اسی اثنا میں زاغلول پاشا کو مصر واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں نئے دستور کے مطابق جو انتخاب ہوا اس میں وفد پارٹی کی شاندار فتح ہوئی۔ اور زاغلول پاشا پھر وزیر اعظم ہوئے۔ زاغلول پاشا نے کوشش کی کہ سوڈان کو مصر کی ملکیت تسلیم کر لیا جائے، لیکن یہ کوشش ناکامیاب رہی اور زاغلول

Marfat.com

شانے استعفیٰ داخل کر دیا۔ زاغلول پاشا کی طاقت اور ہر دلعزیزی کے سامنے خدیو کو استعفیٰ منظور کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ زاغلول پاشا پر کسی نوجوان نے قاتلانہ حملہ کیا۔ گولی تو لگی، لیکن جان بچ گئی مگر صحت خراب ہو گئی اور وہ تبدیل آب و ہوا کے لئے یورپ چلے گئے۔

یراعظم برطانیہ نے زاغلول پاشا کو لندن آنے کی پھر دعوت دی، چنانچہ زاغلول پاشا لندن گئے اور مصالحت کی گفتگو بھی کی لیکن اس بار بھی مصالحت نہ ہو سکی اور خالی ہاتھ مایوس واپس آئے۔ واپس آ کر اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ خدیو کو استعفیٰ قبول کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسی ت سوڈان کے گورنر جنرل سر۔لی۔ اسٹیک کو کسی شخص نے دن دہاڑے قاہرہ کی سڑک پر قتل کر ڈالا۔ اس واقعہ سے عجیب سنسنی پھیل گئی اور برطانیہ نے نہایت سختی سے مطالبہ کیا کہ ——— (۱) حکومت مصر غیر مشروط معافی طلب کرے۔ (۲) مجرموں کو بر داختی سزا دے۔ (۳) تمام سیاسی جلسے اور مظاہرے بند کر دے۔ (۴) ۵۰۰۰۰ پونڈ بطور تاوان ادا کرے۔ (۵) ۲۴ گھنٹے کے اندر تمام مصری فوج اور افسروں کو سوڈان سے واپس بلائے۔

حکومت مصر نے پہلی چار شرطوں کو تو مان لیا لیکن آخری شرط سے انکار کر دیا۔ اس پر حکومت برطانیہ بھی سختی کرنے پر اتر آئی۔ مصری پارلیمنٹ نے مجلس اقوام سے برطانیہ کے جور و تعدی کے خلاف اپیل کی، لیکن یہ مجلس بھی تو برطانیہ کی تخلیق تھی ——— غرضکہ ں بھی کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔

اسی اثنا میں 'اتحاد' نام کی ایک پارٹی وجود میں آئی۔ اس کا اصلی مقصد زاغلول پاشا کی طاقت کو توڑنا اور قصر شاہی کی طاقت کو بڑھانا ۔ در پردہ خود خدیو اس کی حمایت کر رہا تھا۔ جب ۱۹۲۵ء میں اسمبلی کا اجلاس ہوا تو زاغلول پاشا اور ایک سرکاری امیدوار اسمبلی کی صدارت کے لئے امیدوار کھڑے ہوئے جس کا نتیجہ زاغلول پاشا کے حسب خواہ نکلا اور سرکاری امیدوار کو اپنے منہ کی کھانی پڑی۔ وزیر اعظم ار پاشا نے خدیو کو اسمبلی توڑ دینے کا مشورہ دیا۔ اس سے گیارہ مہینے کے بعد صدقی پاشا کی ماتحتی میں انتخابی دستور کو از سر نو ترتیب دینے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ یہ کارروائی صرف اس لئے تھی کہ قواعد ایسے بنا دئے جائیں تاکہ آزادی خواہ زیادہ تعداد میں منتخب نہ ہو سکیں اور پھر پارلیمنٹ پر "قصر" کا اثر غالب رہے لیکن کمیشن کی سخت مخالفت ہوئی اور اس عام مخالفت کے سامنے شاہ فواد کو جھکنا پڑا۔ انتخاب رانے دستور کے مطابق ہوا اور وفدی بہت بڑی تعداد میں کامیاب ہوئے۔ زاغلول پاشا نے انتخاب کے قبل ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ وزارت بنانا نہیں چاہتے، اسلئے زاغلول پاشا کے لئے وزارت بنانا ناممکن ہو گیا۔ عدلی پاشا نے ایک مشترکہ وزارت ترتیب دی۔ زاغلول پاشا ایوان کے صدر رہے۔ اس وزارت میں عدلی پاشا کی حیثیت کمزور تھی۔ اسلئے انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ ابھی ثروت پاشا کی وزارت قائم ہوئی تھی کہ سرکار برطانیہ سے فوجی مسئلے پر جھگڑا ہو گیا۔ شاہ فواد ثروت پاشا کے ساتھ لندن گئے۔ گفتگو کے بعد ایک معاہدہ مرتب ہوا لیکن قبل اس کے قاہرہ میں سرکاری طور پر اس کا اعلان ہو ۲۳ر اگست ۱۹۲۷ء کو سعد زاغلول پاشا کا انتقال ہو گیا۔ نئے معاہدے کے رو سے یہ طے پایا کہ :-

(۱) اگر مصر پر حملہ ہوا تو حکومت برطانیہ مصر کی امداد کرے گی۔

(۲) اگر برطانیہ کو کوئی خطرہ پیش آیا تو حکومت مصر برطانیہ کے لئے تمام سہولتیں مہیا کریگی اور برطانیہ کے خلاف حریفانہ رویہ اختیار نہیں کریگی۔

(۳) انگریزی اصول پر مصری فوج کی تنظیم ہو گی۔

مصطفےٰ نحاس پاشا

سعد زاغلول پاشا کے مرنے کے بعد نحاس پاشا وفد پارٹی کے لیڈر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۸ء میں نحاس پاشا نے اپنی پہلی وزارت بنائی، یہ مخلوط وزارت تھی اور محمود پاشا وزیر اعظم تھے، نحاس پاشا کی پالیسی تھی کہ برطانیہ کے خلاف ایک متحدہ محاذ پیش کیا جائے لیکن یہ وزارت بھی زیادہ دن تک نہ چل سکی۔ اس کے ٹوٹنے کے بعد علی یکن پاشا وزیر اعظم ہوئے، اس درمیان میں مصر کی سیاسی حالت پھر خراب ہو گئی۔ مظاہرے اور ہنگامے ہوئے۔ نحاس پاشا پر حکومت نے رشوت ستانی کا جھوٹا الزام بھی لگایا۔ ان تمام ہنگاموں کے پس پردہ شاہ فواد کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔ ۱۹۲۸ء کا پورا سال اسی ہنگامے میں گزر گیا۔ ۱۹۲۹ء میں مزدور پارٹی کے برسر اقتدار آنے سے انگلستان کی سیاست میں نمایاں تبدیلی ہو گئی۔ مصالحت کی پھر گفتگو چھڑی۔ نحاس پاشا لندن گئے۔ سر جان ہنڈرسن وزیر خارجہ تھے۔ گفتگو کا آغاز ہوا لیکن سوڈان کے مسئلے نے ایسی پیچیدگیاں پیدا کر دیں کہ مصالحت نہ ہو سکی۔ نحاس پاشا خالی ہاتھ واپس آئے اور آ کر اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ فواد کو موقع مل گیا، تمام طاقت اپنی مٹھی میں لے لی۔ صدقی پاشا وزیر اعظم ہوئے اور مصر پر فوجی حکومت مسلط کر دی گئی۔ وفد پارٹی کے اخبارات پر پابندیاں عاید کر دی

Marfat.com

گئیں۔ اسمبلی توڑ دی گئی، جلسے جلوس اور مظاہروں کا جواب پولیس کے ڈنڈوں سے دیا گیا۔ عورت مرد بچے اور طلبہ نے اس ایجی ٹیشن میں خوب حصہ لیا۔ ملک و وطن کے لئے اپنی جانوں کی قربانیاں تک دیں۔ نحاس پاشا اور دوسرے لیڈروں نے فواد کے پاس اس نا شاہی کو بند کرنے کے لئے درخواست دی۔ صدقی پاشا نے نیا انتخاب کرانا چاہا۔ لیکن اپنی شکست کا ایسا یقین تھا کہ ایسا نہ کر سکے۔ ان کی وزارت بہت بدنام ہو گئی۔ خود ان پر پستول سے حملہ ہوا، آخر ۱۹۳۳ء میں ان پر فالج گرا اور وزارت سے علیحدہ ہو گئے۔ نئے وزیر اعظم عبدالفتاح یحییٰ پاشا فواد کے ہاتھ میں بالکل کٹھ پتلی تھے۔ نومبر ۱۹۳۴ء میں توفیق نسیم پاشا کی وزارت قایم ہوئی، قوم پرستوں نے مطالبہ کیا کہ ۱۹۲۳ء کا دستور پھر جاری کیا جائے۔ جنوری ۱۹۳۵ء میں قومی کانفرنس کا دوسرا اجلاس نحاس پاشا کی صدارت میں منعقد ہوا۔ تمام ملک کے تیس ہزار نمائندے شریک تھے۔ اسکول اور کالج کے لڑکوں نے مظاہرہ کیا، پولیس سے تصادم بھی ہوا۔ برطانی حکومت نے تشدد کا آرڈ لیکر قوم پرستوں کو دبانے کی کوشش کی۔ ملک کی حالت بد سے بد تر ہوتی جا رہی تھی کہ جنگ حبشہ چھڑ گئی، سیاسی حالات میں کایا پلٹ ہوئی۔ بحر روم میں اٹلی کا اقتدار برطانیہ کے لئے خطرہ بن گیا۔ مسولینی کی امنگوں کے آگے سویز اور برطانیہ کے مشرقی مقبوضات خطرہ میں تھے۔ ادھر قوم پرستوں کو موقع مل گیا، اپنے مطالبے پر سختی سے اڑے رہے، مصر کی تمام سیاسی جماعتیں متحد ہو گئیں۔ آخر برطانی حکومت مجبور ہوئی کہ مصر سے مصالحت کر لیجائے۔ فروری ۱۹۳۶ء میں علی ماہر پاشا وزیر اعظم ہوئے۔ لیکن فواد کے مرنے سے وزارت ٹوٹ گئی۔ اس بار نحاس پاشا وزیر اعظم ہوئے، اسی سال اگست کے مہینے میں نحاس پاشا لندن گئے۔ اور ۲۶ اگست ۱۹۳۶ء کو مصری برطانی معاہدہ مرتب ہوا۔ اور اس پر لوکارنو ہال میں فریقین کے دستخط ثبت ہوئے۔ نحاس پاشا نے زاغلول پاشا مرحوم کے قلم سے اس پر دستخط کئے۔ نیز حسب ذیل مصری اور برطانی مدبرین نے دستخط کئے۔

(۱) نحاس پاشا ——— صدر وفد پارٹی

(۲) محمود پاشا ——— صدر احرار پارٹی

(۳) مکرم عبید پاشا ——— وزیر خارجہ مصر

(۴) اسمٰعیل صدقی پاشا ——— صدر جماعت شعب

(۵) عبدالفتاح یحییٰ پاشا۔ (۶) علیٰ پاشا۔ (۷) ڈاکٹر احمد ماہر۔ (۸) ڈاکٹر حافظ عفیفی پاشا۔

(۹) محمود فہمی پاشا۔ (۱۰) حمدی سیف پاشا۔ (۱۱) واصف علی پاشا (۱۲) عثمان محرم پاشا

برطانی مدبرین :-

(۱) مسٹر انتھونی ——— وزیر خارجہ انگلستان

(۲) لارڈ ہیلی فیکس ———

(۳) مسٹر ریمزے میکڈانلڈ۔ (۴) سر مائلز لیمپسن ہائی کمشنر مصر

اس معاہدہ میں کل سولہ دفعات ہیں، اس کی رُو سے مصر پر برطانی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ معاہدہ بیس سال کے لئے تھا، دونوں ملکوں کی رضامندی سے اس میں ترمیم اور تنسیخ بھی ہو سکے گی۔ اصولی طور پر مندرجہ ذیل امور کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

(۱) دونوں ملکوں کے درمیان اتحاد رہے گا۔

(۲) کوئی فریق ایسا رویہ اختیار کرے گا جو معاہدہ کے خلاف ہو یا ایسا معاہدہ نہیں کرے گا جس سے اس کی خلاف ورزی ہوتی ہو

(۳) اگر کوئی جھگڑا پیدا ہوا تو مشورہ سے طے کیا جائے گا۔

(۴) جنگ کے موقع پر ایک دوسرے کی امداد کریں گے۔

(۵) جنگ کے وقت یا فوری ضرورت کے موقع پر مصری بندرگاہ، ذرائع، رسل و رسائل، ہوائی اسٹیشن کے استعمال کا حق برطانیہ کو ہوگا، نہر سویز گرچہ مصر کی ملکیت ہے لیکن عالمگیر رسل و رسائل کا رستہ ہے اس لئے حکومت برطانیہ مصری فوج سے تعاون کرتے ہوئے نہر سویز کی حفاظت کرے گی، نہر سویز کی حفاظت کے لئے فوجی بارکیں تعمیر کی جائیں گی۔ دس ہزار فوج اور چار سو ہوا باز اس وقت تک وہاں رہیں گے۔ جب تک کہ فریقین کو اطمینان نہ ہو جائے کہ مصری فوج اب نہر کی حفاظت کرنے کے لائق ہو گئی۔ برطانی طیارے تمام ملک میں پرواز کر سکیں گے۔ ۱۹۲۳ء میں European Bureau of Public Security Department ہو قایم ہوا تھا اب ختم ہو جائے گا۔ پانچ سال تک فوج میں یوروپین عنصر موجود رہیگا۔ مشرقی [illegible] برطانوی پرنس کی [illegible]

Marfat.com

کو پورا کرنے کے لئے اسکندریہ میں عارضی انتظام کر دیا جائے گا۔ مصر میں رائل ایئر فورس (R.A.F.) کے جو دستے مقیم ہیں ان کی تعلیم و تربیت کے لئے حکومت مصر سہولتیں مہیا کرے گی۔ اسکندریہ اور نہر سویز کے درمیان رسل و رسائل کا بہترین انتظام کیا جائے گا۔ حکومت مصر کو اپنی فوجی قوت بڑھانے اور مزید سامان حربی خریدنے کی اجازت ہوگی۔ انگریزی افسر مصری فوج کو قومی فوج بنانے میں مدد دینگے۔ مصری فوج کو سوڈان کی حفاظت کرنے میں دخل دینے کا حق ہوگا۔ اہل مصر کو سوڈان میں آباد ہونے اور وہاں تجارت کرنے کی اجازت ہوگی اور حکومت برطانیہ اس کی مدد کرے گی۔

اس معاہدہ کے بعد حافظ عفیفی پاشا مصر کے پہلے سفیر بنا کر لندن بھیجے گئے۔ اور سر مائلز لیمپسن جو قبل مصر میں ہائی کمشنر تھے برطانوی سفیر بن کر مصر آئے۔ ۲۶ مئی ۱۹۳۷ء کو مصر مجلس اقوام میں بحیثیت ایک رکن کے شامل ہوا۔ جب یہ وفد مجلس اقوام کے اجلاس میں شریک ہو کر مصر واپس آیا تو ملک میں بہت خوشیاں منائی گئیں۔ جلسے کئے اور جلوس نکالے گئے۔ نحاس پاشا کا ہر جگہ شاندار استقبال کیا گیا۔ اس کے بعد سویز کمپنی نے بھی ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے

(۱) مصر کو بجائے ۲۰۰۰۰ پونڈ ۳۰۰۰۰۰ پونڈ سالانہ ملا کریں گے۔
(۲) کمپنی پورٹ سعید سے اسمٰعیلیہ تک اپنے خرچ سے سڑک تعمیر کرے گی۔
(۳) کمپنی کی ملازمت میں مصر کا تناسب ۳۲ فیصدی ہوگا۔

مصر کی قومی اسمبلی نے ان معاہدوں کی تصدیق کر دی۔

"معاہدہ کے بعد" اور وفد کا زوال

معاہدہ کے بعد وفد پارٹی برسر اقتدار ہوئی۔ اور نحاس پاشا نے اپنی وزارت اس طرح ترتیب دی:۔

(۱) نحاس پاشا ——— وزیر اعظم۔ (۲) مکرم عبید پاشا ——— وزیر مالیات۔ (۳) محمود فہمی نقراشی، وزیر مواصلات
(۴) محمد صفوت پاشا ——— وزیر اوقاف۔ (۵) عثمان محرم پاشا ——— وزیر امور عامہ
(۶) احمد حمدی ——— وزیر زراعت۔ (۷) علی فہمی پاشا ——— وزیر حرب۔ (۸) محمود غالب بک ——— عدلیہ
(۹) واصف جال ——— وزیر خارجہ۔ (۱۰) علی زکی العرابی بک ——— وزیر معارف۔

برسر اقتدار ہونے کے بعد وفد پارٹی نے تمام اصول کو بالائے طاق رکھ کر "برادر نوازی" شروع کر دی۔ مخالف اخبارات کی زبان بندی کر دی گئی۔ جو الزامات جو وہ ثروت پاشا اور صدقی پاشا کی وزارتوں پر عاید کرتے تھے، خود ان کے شکار ہو گئے۔ اس سے ملک میں ال... تھے۔ ان حالات میں انہوں نے قصر شاہی سے ٹکر لی۔ مصر پر اب نوجوان اور ہر دل عزیز فاروق کا سکہ چل رہا ہے۔ فواد بھی ہر دلعزیز تھے، لیکن اپنی ہوشیاری اور ڈپلومیسی کی بدولت فاروق کی مقبولیت ان کے چال چلن اور اسلامیت کی وجہ سے ہے۔ نحاس پاشا نے شاہ کی منظوری کے لئے ایک دستور کا مسودہ پیش کیا۔ اس نئے دستور کا مطلب بادشاہ کے اختیارات کو کم کرنا تھا۔ اب تک مصر کے وزیر اعظم قصر شاہی کے نامزد کردہ ہوتے آئے تھے، یہ دوسری بات ہے کہ شاہ اکثریت کے لیڈر ہی کو وزیر اعظم نامزد کرتا تھا۔ یہ ایک دستور ابتدا سے چلا آتا تھا۔ لیکن نحاس پاشا نے چاہا کہ شاہ کے ہاتھ سے اس اختیار کو لے لیں۔ شاہ نے اختلاف کیا، اور وزارت گر گئی۔ نیا انتخاب ہوا۔ اب وفد کی وہ بات نہیں رہی تھی۔ نحاس پاشا کی بعض حرکتوں سے پارٹی کے اندر پھوٹ پڑ چکی تھی۔ فہمی نقراشی اور احمد ماہر نے وفد سے الگ ہو کر سعد پاشا کے نام پر "سعدی" پارٹی بنائی۔ اس پر ازہر کی طاقت انکی پشت پر۔ انتخاب کا نتیجہ وفد پارٹی کے لئے ایک حادثہ تھا۔ نحاس پاشا اور ان کے دست راست مکرم عبید شکست کھا گئے۔ وفد کے کل بارہ آدمی منتخب ہو سکے۔ نئی وزارت محمد محمود (لبرل) نے سعدیوں کی امداد سے بنائی اور دو سال کامیابی کے ساتھ چلتی رہی۔ دو تین مہینے ہوئے کہ بعض باہمی اختلافات کی بنا پر لبرل وزارت مستعفی ہو گئی۔ نئی وزارت علی ماہر پاشا (آزاد) نے سعدیوں کی امداد سے بنائی۔ اس وزارت میں مصر کے بعض ممتاز لوگ بھی۔ محمد علی علوبہ پاشا جو فلسطین کے سلسلہ میں ہندوستان بھی آ چکے ہیں اور جنہوں نے ابھی قاہرہ میں فلسطین کانفرنس بلائی تھی۔ ان کے علاوہ عبد الرحمن عزام جو انگریز کے دشمن اور قلم کے بادشاہ ہیں اور جو طرابلس کے جہاد میں اپنی شجاعت اور جوش جہاد کا ثبوت دے چکے ہیں وزارت میں اوقاف کے وزیر ہیں۔ نیز فہمی نقراشی سعدیوں کے رہنما بھی خاص شخصیت کے مالک ہیں۔

Marfat.com

دنیا کی موجودہ متزلزل حالت میں مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا بہت دشوار ہے۔ حبشہ پر اٹلی کا قبضہ ہو جانے سے برطانیہ اور مصر ایک دوسرے سے موالات کرنے پر مجبور ہیں۔ معاہدہ کے بعد سے مصر مسلسل فوجی تیاریوں میں منہمک ہے۔ ابھی ایک ریزرو فوج (الجیش المرابط) عبد الرحمن عزام، مشہور طرابلسی مجاہد کی نگرانی میں مرتب ہو رہی ہے۔

یہ تھا مصر کی نئی سیاسی تشکیل اور ارتقا کا مختصر خاکہ جو کم سے کم لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس سے ناظرین کو مصر کی سیاسی حالت کا اندازہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

ندیم: بہار نمبر سنہ ۱۹۴۰ء

Marfat.com

سلطان نور الدین بن زنگی

دولت اتابکیہ کی تاسیس اور اس کا خاتمہ

از جناب حکیم رشید احمد اللہ ندوی۔ حیدرآباد دکن

دولت اتابکیہ سلطان محمود سلجوقی نے اپنی اولاد الپ ارسلان اور فرخ شاہ کی تربیت عماد الدین زنگی ایک کردی النسل شخص کے سپرد کی تھی جس کی وجہ سے ان کا لقب "اتابک" ہو گیا تھا کیونکہ اتابک اس شخص کو کہتے ہیں جو بادشاہوں کی اولاد کی تربیت کا ذمہ دار گردانا گیا ہو۔

عماد الدین زنگی نے رفتہ رفتہ دولت سلجوقیہ میں اپنا رسوخ اور اقتدار بڑھایا اور امارت کی شان پیدا کی۔ اور پھر جب اوج نے ان کی یاوری کی تو موصل پر قبضہ کر کے انہوں نے دولت اتابکیہ کی بنیاد ڈالی اور خود مختارانہ حکومت کرنے لگے اور شہر حلب اور ملک شام کے بعض شہروں کو اپنی حدود سلطنت میں شریک کر لیا۔

نور الدین عماد الدین زنگی کے ایک فرزند کا نام نور الدین محمود تھا جن کا تذکرہ لکھنا اس مضمون کا اصل مقصد ہے۔

ارباب تاریخ کا بیان ہے کہ عدل و انصاف کے جاری کرنے، رفاہ عام کے کاموں کو وسعت دینے، غزوات اور محاربات میں ہمیشہ مشغول رہتے، اور تمام خوبیوں سے متصف ہونے میں حضرات خلفائے راشدین اور عمر بن عبد العزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے بعد سلطان نور الدین محمود کا درجہ ہے، باوجودیکہ وہ عیسائیوں کے ساتھ صلیبی لڑائیوں میں ہر دم برسر پیکار رہے تاہم فرنگی مورخین ان کے عدل و انصاف، شجاعت و بسالت، اور فہم و فراست کے نہ صرف معترف بلکہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں،

سلطان صلاح الدین ایوبی جو صلیبی جنگوں کا کامیاب مقابلہ کرنے کی وجہ سے مشہور عالم ہیں وہ انہیں کے خوان دولت کے پروردہ تھے۔

ذیل میں اسی سلطان کے کچھ حالات لکھے جاتے ہیں:-

Marfat.com

نور الدین کی بادشاہی

اس نامی گرامی سلطان کا نام نور الدین محمود، اور لقب "ملک عادل" تھا۔ اس مضمون میں آئندہ وہ اسی لقب سے یاد کئے جائینگے۔ سال ولادت ۵۱۱ھ اور سال وفات ۵۶۹ھ ہے۔ یہ ملک شام اور ملک مصر کے حکمران تھے، ان کے والد عماد الدین زنگی کی عادت تھی کہ وہ میدان جنگ اور معرکوں میں ہمیشہ اپنے فرزند ملک عادل کو ساتھ رکھتے تھے تاکہ فن حرب سے وہ اچھی طرح واقفیت حاصل کرسکیں۔

ایک دفعہ زنگی نے اپنی فوج کو ساتھ لئے ہوئے قلعہ جعبر کا محاصرہ کر رکھا تھا اور ملک عادل بھی اس جنگ میں شریک تھے، دفعتہً فرشتہ اجل نے قضا کا ایک ایسا تیر چلایا کہ زنگی کی عمر کا لبریز پیمانہ چھلک گیا یعنی اہل قلعہ کی سازش سے محافظین کی ایک جماعت دھوکے سے زنگی کے خیمے میں گھس گئی اور انہیں قتل کرکے قلعے میں بھاگ گئے جب زنگی کے قتل کی خبر مشہور ہوئی تو ملک عادل نے فوراً محاصرہ اٹھالیا اور شامی فوجوں کو ساتھ لئے ہوئے حلب چلے آئے اور یہاں باپ کی جگہ اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا، دوسری طرف ان کے بڑے بھائی سیف الدین غازی نے شہر موصل اور اس کے حوالی مقاموں پر قبضہ کرکے اپنی حکمرانی کی منادی کرادی، اسطرح عماد الدین زنگی کی قائم کی ہوئی "دولت اتابکیہ" بطور میراث دو حصوں میں منقسم ہوگئی، مگر دونوں بھائیوں میں برابر صلح و آشتی رہی اور کبھی جنگ و جدال کی نوبت نہ آئی جس کی وجہ سے ان دونوں ٹکڑوں کی چول اپنی جگہ سے نہیں ہلی، اور ملک عادل کو اس کا موقع ملا کہ وہ ان صلیبی لڑائیوں کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرسکیں جن کی ابتدا ہو چکی تھی۔

عیسائیوں سے جنگیں

۱۔ جس وقت انطاکیہ کے عیسائی بادشاہ ریمنڈ کو زنگی کے مقتول ہونے کی اطلاع پہونچی تو وہ پوری جنگی قوت کے ساتھ زنگی کی اسلامی سلطنت کو تاخت و تاراج کرنے کے لئے روانہ ہوا، اس نے اپنی فوج کے دو حصے کئے ایک حصہ حماۃ کی طرف روانہ کیا، اور دوسرے حصہ کو اپنی کمان میں لیکر شہر حلب کی طرف بڑھا اور اسلامی علاقوں میں گھس کر مسلمانوں کو تہ تیغ کرنا شروع کیا اور بہتوں کو گرفتار کرکے پابجولاں لے چلا۔ ملک عادل نے اس حملے کو روکنے اور ریمنڈ سے مقابلہ کرنے کے لئے اپنے مشہور سپہ سالار اسد الدین شیرکوہ کی قیادت میں ایک لشکر جرار روانہ کیا جس نے ریمنڈ کو شکست دی، اور جسقدر مسلمان قید ہوچکے تھے انہیں چھڑالیا، پھر شیرکوہ مظفر و منصور حلب واپس آگیا۔

۲۔ اس جنگ کے بعد تل باشر کے عیسائی حکمران جوسلین نے رہا کے عیسائیوں اور ارمنوں کو ملک عادل کی اطاعت سے روگرداں کرکے اپنے ساتھ ملالیا۔ اور ان کی بستیوں کو اپنی حکمرانی میں شریک کرنے کے لئے ان عیسائیوں کو راضی کرلیا۔

ملک عادل نے اسکی خبر پاتے ہی رہا پر فوج کشی کی، اور جب شہر رہا کے قریب اسلامی فوج پہونچی تو جوسلین نے راہ گریز اختیار کی، اسلامی فوج جب شہر میں داخل ہوئی تو شہر کی فصیلیں ڈھادیں اور سرکش باغیوں کو گرفتار کرلیا اور کچھ قتل کئے گئے اس مہم میں ملک عادل کو بہت کچھ غنیمت کا مال ہاتھ آیا، انہوں نے پھر فرنگیوں کا تعاقب کیا اور انہیں اسلامی حدود سے باہر کرکے متعدد قلعے جو ان کے قبضے میں چلے گئے تھے واپس لے لئے۔

اسی اثنا یعنی ۵۴۴ھ میں ملک عادل کے بھائی سیف الدین غازی کی وفات ہوگئی، اور ان کے دوسرے بھائی قطب الدین موصل کی حکومت پر جانشین ہوئے مگر سنجار کے امرا قطب الدین سے ناخوش تھے اس لئے ان لوگوں نے ملک عادل سے نامہ و پیام شروع کرکے سنجار آنے کی انہیں دعوت دی تاکہ یہ شہر ان کے حوالہ کردیا جائے، جب وہ اپنی فوج کے ساتھ سنجار پہنچے تو دوسری طرف قطب الدین بھی بھائی کے ساتھ جنگ آزمائی اور شہر کی مدافعت کے لئے سنجار پہونچ گیا۔ مگر بغیر کسی جنگ کے دونوں میں جلد مصالحت ہوگئی، اور ملک عادل شہر سنجار بھائی کے حوالہ کرکے حلب واپس آگئے۔

Marfat.com

۳- پھر ملک عادل نے انطاکیہ کے فرنگیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے قلعہ فارم کی طرف کوچ کیا اور وہاں پہنچ کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا، فرنگیوں کی کثیر فوج انطاکیہ کے حکمران ریمنڈ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوکے، اسلامی فوج سے نبرد آزما ہوئی، میدان جنگ میں زور وں کا رن پڑا کشتوں کے پشتے لگ گئے، اور زمین جنگ آزماؤں کے خون سے سیراب ہوکے لالہ زار بن گئی، انجام کار فرنگیوں کو اس جنگ میں سخت شکست ہوئی اور ان کے بے شمار آدمی اجل کی نذر ہوگئے اور بکثرت قیدی بنا لئے گئے، جنگ کا یہ دن دونوں فوجوں کے لئے بڑا سخت تھا، اس جنگ میں پرنس ریمنڈ بھی مقتول ہوا، اسلامی شعراء نے اس فتح کی خوشی میں بڑے بڑے قصیدے کہے۔

۴- اسی سال ملک عادل نے شیزر اور حماۃ کے قریب قلعہ فامیا کو فتح کیا جو نہایت مستحکم اور بلند مقام پر بنا ہوا تھا۔ اس قلعے کو فتح کر کے سامان جنگ، اور ذخیروں سے بھر کے اس حفاظت کے لئے اپنے ایک خاص آدمی کو مامور کیا اور یہاں سے جہاد کے ارادے سے جوسلین کے شہروں میں جا پہنچے جو حلب کے شمال میں تل باشر اور عین تاب کے ناموں سے مشہور تھے۔ جوسلین نے بھی میدان کارزار گرم کیا دونوں فوجوں میں گھمسان لڑائیاں ہوئیں، آخر کار میدان جنگ فرنگیوں کے ہاتھ رہا، مسلمانوں نے شکست کھائی، ان کے کثیر مجاہد شہید ہوئے اور بہت سے گرفتار کر لئے گئے، ملک عادل پر یہ شکست بہت شاق گذری وہ اپنی تمام آسائش اور آرام کو ترک کرکے جوسلین کو گرفتار کرنے ہی کی تدبیریں سوچنے لگے، یہاں تک کہ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے ترکمانوں کی ایک جماعت کو گھات میں چھپا دیا، اتفاقاً ایک روز جوسلین شکار کھیلنے کی نیت سے باہر نکلا، ادھر ترکمان جو پہلے ہی سے چھپے بیٹھے تھے اپنی کمین گاہ سے نکل کھڑے ہوئے اور جوسلین پر دھاوا کرکے اسے گرفتار کر لیا، اس نے ان ترکمانوں کو مال و زر کی ایک بڑی مقدار کی طمع دلائی اور قریب تھا کہ وہ اس طرح اپنی جان بچا لے جائے مگر فوراً ہی ملک عادل کی تازہ دم فوج مقام واردات پر پہنچ گئی اور جوسلین کو اپنی حراست میں لے لیا جس کے بعد تھوڑی مدت میں سب ملک عادل کے لئے تل باشر، عین تاب، عزاز، تل خالد، تورسس، راوندان، برج رصاص، حصن بارہ، کفر کفرلاثا، دلوک، مرعش، نہر جوز، وغیرہ مقامات کا فتح کرلینا آسان ہوگیا، اور اس طرح شام کا پورا شمالی علاقہ مسخر ہوگیا اور ان جگہوں پر ملک عادل کے پھریرے لہرانے لگے۔

فتح دمشق

دمشق جو ملک شام کا اہم اور مرکزی مقام تھا وہ اب تک ملک عادل کی حدود سلطنت میں شامل نہیں ہوا تھا اور اگرچہ یہاں کا حکمران مجیر الدین ابق بن محمد ایک اسلامی بادشاہ تھا مگر اس میں عیسائیوں کے حملوں کے روکنے کی بالکل قوت نہ تھی، دوسری طرف عیسائیوں کا عسقلان پر قبضہ ہو چکا تھا اور وہ فتح دمشق کی تدبیریں کر رہے تھے اور وہ اس شہر پر قبضہ کرنے کے لئے ہمیں تقر آتے تھے، تو پھر پورے ملک شام میں مسلمانوں کے قدم نہیں ٹک سکتے، اور خود شام کے مسلمان بھی بیت المقدس کے عیسائی بادشاہ بالڈون ثالث کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوف زدہ ہو رہے تھے انجام کار شام کے مسلمانوں نے ملک عادل کے پاس فتح دمشق کا پیغام بھیجا اور اپنی امداد کا ہر طرح سے اطمینان دلایا، ملک عادل اس قسم کے موقع کے منتظر ہی تھے، انہوں نے اہل شام کی پوری امداد پر اعتماد اور وثوق حاصل کرکے ۵۴۹ھ میں اپنی فوج کے ساتھ دمشق جا پہنچے

وہاں مسلمانوں کو ان کا انتظار ہی تھا ان کے پہونچتے ہی شہر کا مشرقی دروازہ کھول دیا گیا، وہ شہر میں داخل ہوئے اور اس پر قبضہ کرلیا اور مجیر الدین کو معاوضہ میں شہر حمص اور اس کے اطراف کا علاقہ بطور جاگیر دیدیا، ملک عادل نے دمشق پر قبضہ کرنے کے بعد اس کے منہدم مقاموں کو از سرنو تعمیر کرکے یہاں کی فوجی قوت بڑھا دی۔

عیسائیوں کو جب یہ خبر ملی کہ دمشق ایک

Marfat.com

کمزور مسلمان بادشاہ کے قبضے سے نکل کے ایک طاقتور اور صاحب شوکت مسلمان کے قبضے میں چلا گیا ہے تو انہیں نہایت قلق ہوا اور ان کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔

قلعہ حارم کا محاصرہ دمشق کے قبضے کے بعد سنہ ۵۱۵ھ میں ملک عادل فرنگیوں سے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے اور انطاکیہ کے قریب پہونچ کے قلعہ حارم کا محاصرہ کر لیا۔ اہل قلعہ پر اس محاصرے کا دباؤ اتنا پڑا کہ انہیں مجبوراً حارم کا نصف علاقہ دے کے ملک عادل سے صلح کرنی پڑی۔

بادشاہ قسطنطنیہ کو ملانا سنہ ۵۵۲ھ میں ملک عادل کو اطلاع ملی کہ فرنگیوں نے ان کے ساتھ جنگ کرنے کے لئے مانوئل مینیقوس بادشاہ قسطنطنیہ سے جنگی امداد کا معاہدہ کر لیا ہے، اس خبر کے پاتے ہی ملک عادل نے پوری کوششیں صرف کر کے اور زر کثیر دے کے بادشاہ قسطنطنیہ کو اپنے ساتھ ملا لیا جس کے بعد مانوئل نے فرنگیوں کی امداد سے منہ موڑ لیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرنگیوں نے جب جنگ چھیڑی تو ملک عادل کو فتح نصیب ہوئی، اور انطاکیہ کا حکمران رینوار ناط شکست کھا کے گرفتار ہو گیا، بعد ازاں ملک عادل نے دوبارہ قلعہ حارم کی طرف رخ کیا اور وہاں پہونچ کے قلعہ کا محاصرہ کیا مگر اس محاصرے میں انہیں کامیابی نہیں ہوئی، اور ناچار محاصرہ اٹھا کے واپس آ گئے، مگر اس کے بعد بھی انہیں فرنگیوں سے کئی لڑائیاں لڑنی پڑیں اور اکثر لڑائیوں میں ملک عادل کو فتح ہوتی رہی۔

معرکہ حصن اکراد سنہ ۵۵۵ھ میں حصن اکراد کے محاصرہ کے لئے ملک عادل روانہ ہوئے مگر اس جنگ میں فرنگی مینہ کی طرح سے چاروں طرف سے ان کی فوج پر برس پڑے، جس سے اسلامی فوج کا نظم درہم برہم ہو گیا اور ایسا انتشار پیدا ہوا کہ وہ ایک مرکز پر جمع نہ ہو سکی، اسلامی فوج کو سخت شکست اٹھانی پڑی اور قریب تھا کہ خود ملک عادل بھی فرنگیوں کے ہاتھ میں قید ہو جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے گرفتاری سے انہیں بچا لیا، یہ دن مسلمانوں کے لئے بڑا سخت تھا اور یہ جنگ واقعہ بقیعہ کے نام سے موسوم ہے۔

قلعہ حارم کی فتح اگرچہ حصن اکراد میں ملک عادل کی فوج شکست کھا کے میدان جنگ سے ہٹ آئی تھی تاہم باہمت ملک عادل نے اپنی پراگندہ فوج کو ایک جگہ سمیٹا اور منتشر فوجی قوتوں کو ایک مرکز پر جمع کیا اور پھر زبردست فوجی قوت کو ساتھ لئے ہوئے قلعہ حارم کی فتح کے لئے نکل کھڑے ہوئے، اسلامی اور عیسائی دونوں فوجوں میں باہم سخت نبرد آزمائی ہوئی آتش جنگ کے شراروں اور شعلوں سے میدان جنگ تنور کی مانند جل اٹھا، خون آشام تلواریں نیاموں سے نکل نکل کے انسانی جسموں سے خونی فوارے اچھالنے لگیں، نوک سناں پر ہزاروں انسانی سر آویزاں ہو گئے، اور بیشمار جنگ آزما خاک و خون میں آغشتہ ہو گئے، دفعتہً فتح کا غلغلہ اسلامی لشکر میں بلند ہوا اور قلعہ حارم پر اسلامی جھنڈا نصب کر دیا گیا، اس جنگ میں بیشمار فرنگی مارے گئے، اور کثیر تعداد میں گرفتار ہوئے، ان قیدیوں کی فہرست میں انطاکیہ اور طرابلس کے عیسائی حکمرانوں کے نام بھی درج کئے گئے۔ بعد کو انطاکیہ کے حکمران نے زر فدیہ کی گرانقدر رقم دے کے رہائی حاصل کی۔

قلعہ حارم کے فتح ہو جانے سے قلعہ بانیاس اور اس کے گرد و نواح کے فرنگی علاقے بھی بازخود ملک عادل کی حدود سلطنت میں داخل ہو گئے۔

مصر پر قبضہ اگرچہ ملک عادل کا تسلط ملک شام پر پوری طرح ہو گیا تھا مگر اب تک ملک مصر ان کی عملداری سے خارج تھا وہ مصر پر قبضہ کرنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے، اس وقت مصر کی عنان حکومت عاضد عبیدی کے ہاتھ میں تھی جو برائے نام مصر کا خلیفہ تھا اور دراصل مصر کی حکومت وزرائے سلطنت کے ہاتھوں

Marfat.com

میں تھی، جس طرح وزراء چاہتے تھے اپنے اختیارات آزادانہ کام میں لاتے تھے، مگر ان وزراء میں باہم موافقت نہ تھی بلکہ مناقشت کی آگ ہر وقت سلگتی رہتی تھی، اور آئے دن ان میں خانہ جنگیاں برپا رہتی تھیں۔

جس زمانے میں ملک عادل نے مملکت مصر کے حاصل کرنے کا خیال دل میں قائم کیا حسن اتفاق سے اسی زمانے میں مصری وزارت کا جلیل القدر عہدہ ضرغام نامی ایک شخص نے حاصل کیا اور اسکے مقابلہ میں شاور نامی ایک دوسرے شخص نے ناکام اور مغلوب ہوکے دمشق کی طرف راہِ فرار اختیار کی اور ملک عادل کے زیر حمایت پناہ گزیں ہوا، ملک عادل نے اسکی اچھی طرح خاطر مدارات کی، اور ۵۵۹ھ میں شاور کی امداد کے لئے اسد الدین شیرکوہ کی سپہ سالاری میں مصر کی جانب اپنی فوج روانہ کی شیرکوہ نے اس فوج کی مدد سے شاور کو وہاں کا حاکم اعلیٰ بنا دیا، مگر جب شاور کو مصری حکومت کا پورا اقتدار حاصل ہوگیا تو وہ ملک عادل کی اطاعت سے روگرداں ہوگیا اور فرنگیوں کی امداد حاصل کرکے شیرکوہ کو مصر سے نکال دیا، ملک عادل نے شیرکوہ کو دوبارہ ۵۶۲ھ میں فوج گراں کے ساتھ مصر روانہ کیا جس نے مصر پہونچ کے فرنگیوں کی قوت کو پاش پاش کردیا اور ساتھ ہی شاور کو بھی قتل کردیا اس کے بعد شیرکوہ ۵۶۴ھ تک ملک عادل کی طرف سے مصر کا عامل رہا تا آنکہ فرشتۂ اجل نے سنہ مذکور میں اس کا خاتمہ کردیا شیرکوہ کے انتقال کرجانے کے بعد ملک عادل نے اسکے بھتیجے صلاح الدین ایوبی کو مصر کا عامل مقرر کیا۔

قلعہ جعبر کی فتح سال رواں میں ملک عادل نے قلعہ جعبر کا محاصرہ کرکے اسے اپنے قبضہ میں کرلیا یہی وہ قلعہ تھا جہاں ان کے والد عماد الدین زنگی مقتول ہوئے تھے پھر یہاں کے والی کو اس کے معاوضے میں نواح حلب میں جاگیر عطا کی۔

موصل کا قضیہ ۵۶۶ھ میں ملک عادل کے بھائی قطب الدین موصل کے حکمران کا انتقال ہوگیا اور ان کے فرزند سیف الدین غازی اپنے باپ کے جانشین قرار پائے، مگر حکومت کے تمام اختیارات امرائے دولت میں سے ایک شخص فخر الدین عبد المسیح نے اپنے ہاتھ میں لے لئے جو ملک عادل کی نگاہوں میں اپنی مطلق العنانی اور بری سیاست کی وجہ سے مبغوض تھا، ملک عادل نے اعلان کیا کہ ہم اپنے بھتیجوں کے ملک و مال کی تدبیر کرنے کے زیادہ حقدار ہیں اسی اثناء میں موصل کے امرا نے مخفی طور سے ملک عادل کے پاس خطوط روانہ کئے جن میں انھوں نے اپنی وفاداری اور فرمانبرداری کا اظہار کیا اور انہیں موصل آنے کی دعوت دی ان خطوط کے پاتے ہی ملک عادل نے اپنی فوج کے ساتھ موصل کی طرف کوچ کیا، اور راستے میں رقہ، خالور اور نصیبین کو فتح کرتے اور ان پر اپنا قبضہ جماتے ہوئے بڑھتے چلے گئے۔ پھر وہ سنجار پہونچے اور اسے فتح کرکے اسے اپنے ایک برادرزادہ عماد الدین بن قطب الدین کو دے دیا، بعد ازاں وہ موصل پہونچے اور اس پر قبضہ کرکے اپنے برادرزادہ سیف الدین کی حکمرانی ہی میں رہنے دیا مگر اس کے قلعے کی نگرانی اپنے ایک خواجہ سرا کے سپرد کی جس کا نام کشتگین سعد الدین تھا، ان ضروری انتظاموں سے فارغ ہوکے ۲۴ دنوں کی اقامت کے بعد ملک عادل دمشق واپس آگئے اور اپنے ساتھ فخر الدین عبد المسیح کو بھی لیتے آئے جس کا نام بدل کے عبد اللہ رکھدیا، اور اُسے ایک بڑی جاگیر عنایت کی۔

ملک عادل اور صلاح الدین میں منافرت اگرچہ مصر میں صلاح الدین ایوبی کی حیثیت ابتدا میں ایک عامل کی تھی جنہوں نے اپنے چچا شیرکوہ کے انتقال کے بعد اس عہدے کا جائزہ ملک عادل کی طرف سے حاصل کیا تھا مگر رفتہ رفتہ انہوں نے مصر میں اپنا اثر و اقتدار بہت بڑھا لیا جسکی وجہ سے ملک عادل کو یہ قوی اندیشہ

Marfat.com

لاحق ہوگیا تھا کہ صلاح الدین مصر میں اپنی مستقل حکمرانی حاصل کرنی چاہتے ہیں اس لئے ملک عادل نے مصر جانے کے لئے ایک بڑی فوج تیار کی تاکہ اس کی مدد سے مصر کو اپنے عامل کے قبضے سے چھڑالیں۔

ملک عادل کی وفات

ملک عادل مصر کی طرف کوچ کرنے والے ہی تھے، کہ وہ مرض خناق میں مبتلا ہوگئے اور بالآخر ۱۱ شوال ۵۶۹ھ کو موت کا شربت پی کے آرام کی نیند سو رہے، دمشق کے قلعہ میں ان کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی، مگر بعد کو ان کی نعش دمشق کے اس مدرسے میں منتقل کی گئی جسے انہوں نے سوق خواصین میں قائم کیا تھا۔

دولت اتابکیہ کا خاتمہ

ملک عادل کی وفات کے بعد ان کا فرزند ملک صالح اسمٰعیل جس کی عمر گیارہ سال کی تھی تاج و تخت کا وارث قرار پایا مگر اس کی جانشینی کو ابھی زیادہ دن نہ گذرنے پائے تھے کہ صلاح الدین ایوبی کی بڑھتی ہوئی طاقت نے دمشق کی اتابکی سلطنت کا خاتمہ کردیا۔

ملک عادل کی خوبیاں

ملک عادل نہایت عادل، شجاع، مجاہد، فیاض، متواضع، علم دوست، علم پرور، غریب نواز، دیندار، خدا ترس، سادہ مزاج، اور بڑے سیاست داں واقع ہوئے تھے، وہ تلوار کی چھاؤں میں پلے، اور تا زیست اسی تلوار کے زور سے مسلمانوں کی جان و مال، عزت و ناموس: اور اسلامی ملکوں کی حفاظت کرتے رہے وہ ہمیشہ عدل و انصاف کے حامی اور اس کو رواج دینے میں مصروف رہے جس کے لئے انہوں نے دار عدل قائم کیا تھا جہاں وہ قاضی کے ساتھ اجلاس کرتے اور مظلوم کی دادرسی فرماتے خواہ فریاد ان کے فرزند کے خلاف ہی کیوں نہ ہوتی! اور اگر خود ان کی ذات کے خلاف دعوے ہوتا جب بھی وہ قاضی کے سامنے حاضر ہو کے اپنا بیان دیتے، وہ اپنے ذاتی مصارف طعام و لباس کے لئے حکومت کے مال سے ایک حبہ نہ لیتے بلکہ مال غنیمت سے انہیں جو حصہ ملا تھا اس سے املاک خرید لی تھی جس سے وہ اپنے ذاتی اخراجات پورے کرتے تھے، وہ حنفی فقہ کے ماہر تھے، حدیث شریف کی سماعت اور روایت کرتے تھے، ان کے نام کا خطبہ حرمین شریفین اور یمن میں بھی پڑھا جانے لگا تھا، وہ اسقدر جری اور شجاع تھے کہ بڑے بڑے خطروں میں شہادت کی نیت کرکے اپنے آپ کو ڈالدیتے تھے۔

ان کے رفاہ عام کے کاموں کو دیکھا جائے تو وہ بھی بہت ہیں، انہوں نے ملک شام کے تمام شہروں کو فصیلوں سے گھیر دیا، بکثرت حنفی اور شافعی مدرسے قائم کئے، موصل میں جامع مسجد بنوائی، تمام شہروں میں شفاخانے، سرائے، اور خانقاہوں کا جال پھیلا دیا، راستوں میں بھی شفاخانے اور سرائے کی عمارتیں بنوائیں اور ان کے اخراجات کے لئے اوقاف مقرر کردیئے، تجارتی مالوں پر جو گرانبار چنگی وصول کی جاتی تھی اسے موقوف کرادیا۔

وہ علماء، فضلاء، اور دیندار لوگوں کی بہت عزت کرتے، ان کے سامنے کھڑے ہوجاتے انہیں اپنے پاس بٹھاتے، اور ان کی کسی بات کو رد نہیں کرتے تھے وہ ارباب علم و فضل کے خطوط کا جواب خود اپنے ہاتھ سے لکھ کے دیتے تھے غرض وہ مجسم خیر تھے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو ہمیشہ ہمیشہ اپنی رحمت کی بارش سے سیراب فرماتا رہے۔ آمین، آمین، آمین۔

ستمبر ۳۹ء

Marfat.com

اسمٰعیل پاشا کے محلات کی زندگیاں

از جناب سید شاہ فخر عالم صاحب سجادہ نشین۔ بھاگلپور

اندنوں مصر کے ایہ ناز فرزند احمد شفیق پاشا ایک ایسی تاریخ لکھ رہے ہیں جس میں ایسے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن کے دیکھنے اور سننے والے اب بھی ہر جگہ کچھ نہ کچھ موجود ہیں' لیکن جودت طبع کی سحر نگاریاں کچھ ایسی ہوتی ہیں کہ دیکھی ہوئی باتوں میں بھی وہ کیف آور موعظت بھر دیتی ہیں' کہ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی باتوں کو قند مکرر کی طرح بار بار سننے کے لئے دل مچلتا ہے خصوصاً زمانہ کے لیل و نہار جب حافظہ سے کسی واقعہ کو بھلا دیتے ہیں تو کسی کا اشارہ کر دینا بھولے افسانوں کی چادروں کو تار تار کرکے اگلی صحبتوں کی یادیں خاص دلچسپی پیدا کر دیتا ہے '

اور انسان داستان پارینہ کو یاد کرکے وہ حظ و سرور پاتا ہے جو موجودہ عیش و نشاط میں عنقا ہوتا ہے' نیز گذشتہ عظمتوں کے قصے قلب مجروح کے تار کو چھیڑ دیتے ہیں' اور وہ اپنی موجودہ بیچارگیوں کے سرود پرغم میں پرنم ہو جاتا ہے' پھر سننے والوں کو اپنے دل کے رازوں اور بھیدوں کو سنانے بیٹھ جاتا ہے چنانچہ یہ تاریخ بھی دکھے دلوں کی پکار اور مجروح قلوب کی آواز کا مجموعہ ہے' خود احمد شفیق صاحب معترف ہیں کہ وہ باتیں جو کبھی بازاروں اور مجلسوں میں چپکے چپکے سنتا تھا' انکو آج انہیں صاحبان بزم کی زبانی سنکر لکھ رہا ہوں' زوجہ فریق راشد طیب پاشا شہید جنگ حبشہ اور محمد عبید بک کی حرم اور خواصان دربار اور آزاد شدہ شاہی لونڈیوں نے میرے معلومات میں وہ اضافہ کیا ہے جو ان محرومان عیش و طرب کے سوا کوئی دوسرا کر ہی نہیں سکتا تھا' پھر اس روداد حیات کا کہنا ہے جس کو خود وہ بیان کرے جو کبھی رنج و آلام سے واقف نہ تھا اور نہ مصیبت کو کبھی دیکھا تھا' اسکی زندگی کا مقصد ہنسنا اور ہنسانا اور عشرت و دلچسپیوں و شادمانیوں کا قائم رکھنا تھا' لیکن آہ آج ان کی آنکھیں ان محلوں کے دیکھنے کو ترستی ہیں جن میں کبھی انہوں نے اپنے بچپنے سے لیکر جوانی کی بہاریں گذاری تھیں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

یوں تو یہ تاریخ آج سے ۵۰ سال پہلے کے کل شعبوں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور اجتماعی' ادبی' سیاسی' معاشرتی زندگیوں کے کسی اہم واقعہ سے خالی نہیں ہے' لیکن اس وقت صرف پہلی جلد قریب اشاعت ہے' اور ان میں سے بھی صرف

Marfat.com

ایک باب "اسماعیل پاشا کے محلوں کی زندگی" الہلال مصر ماہ اپریل ۳۲ء کے ذریعہ ہمارے سامنے پہنچ سکا ہے۔ لہذا

قیاس کن ز گلستان من بہار مرا

سرائے عابدین

یوں تو اسماعیل پاشا کے بہت سے تعمیر محل تھے لیکن محل "الانس" اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور عیش و نشاط کی فراوانیوں میں کل محلوں سے بڑھا ہوا تھا، کون سی دلکشی تھی جو وہاں موجود نہ تھی اور کیا نہ تھا جس کی کمی ہو۔ پری تمثال لونڈیاں اور رقاصہ، دف نواز اور نغمہ سنجان بزم کی کب کمی تھی جو کسی کا دل گھبراتا اور ملول ہوتا۔ صبح و مساء جس وقت خدا بھی شوق کروٹ لیتا، ستار و جلترنگ کی مسحور کن نغمہ ریزیوں سے سارا محل وجد میں آجاتا، ساری کلفتیں دور ہو جاتیں۔

خصوصاً زوجہ ثالثہ کو فن موسیقی سے ایسی دلچسپی تھی کہ ہمہ وقت گانے بجانے والیاں ستار وبیلے کے تاروں کو چھیڑ چھیڑ کر کمال فن کی داد لیا کرتیں اور بیگم کے دل کو خوش کرتی رہتی تھیں۔

چونکہ کل بیگمات ساتھ ہی ایک محل میں رہتی تھیں اسلئے بادشاہ کے زیادہ تر اوقات بھی اسی محل عابدین گذرتے تھے، لیکن جب خدا نے وہ دن دکھائے کہ بوڑھی بیگم صاحبہ کے مرادوں کے دن پھرے اور شاہزادہ عالی تبار پیدا ہوئے تو تمام مملکت میں خوشیاں منائی گئیں، شادیانے بجے، حکم شاہی نافذ ہوا کہ آج سے اس اختر طالع وارجمند صالح کو ولی عہد کا لقب دیا گیا، لہذا تمام دفاتر و عدالتوں میں جشن میلاد منائی جائے، ساتھ ہی اس خوش نصیب ملکہ کو علیحدہ محل "سرائے قبہ" ملا، تاکہ وہ اپنے نورِ نظر لختِ جگر کو دشمنوں کی نگاہ بد سے بچا رکھے۔

اب رہیں تین بیگمات تو ان کے لئے محل "بلک" آراستہ کیا گیا، دلجوئی، دلکشیوں اور تفریح کے تمام لوازمات بہم پہنچائے گئے، خوامیس، فانمات، قہرمانات، کنیزیں، لونڈیاں رکھی گئیں۔ کوئی ان میں سے خزانچی مقرر کی گئیں، کوئی مشاطہ گیری کے کام پر مامور ہوئیں کوئی بزم طرب کی مطرب بنائی گئیں اور ان سب کے لئے حسب مراتب تنخواہیں مقرر کی گئیں، پیش خدمتیں اور محافظہ دی گئیں۔ گویا دن عید اور رات شب برات منائی جانے لگی۔

بادشاہ سلامت جب شام کو اس محل پر نزاہیں رونق افروز ہوتے تو چاروں طرف چہل پہل ہو جاتی، در و دیوار سے مسرت برسنے لگتی، دربان داخلہ کے منتظر رہتے اور جوں ہی بادشاہ اندر قدم رکھتے دروازے بند کر دیے جاتے، چرکسی لونڈیاں منظور نظر چھوکریاں اور ناکتخدائے محل شہنشاہ مصر کو جلو میں لے لیتیں، پیش خدمتی کے کام انجام دیتیں، چشم و ابرو کے اشارہ کی دست بستہ منتظر رہتیں۔

تھوڑی دیر فرح و انبساط کی مجلس گرم رہتی پھر خاصہ کا وقت ہوتا تو ڈائننگ ہال میں میز درست کی جاتی اور عیش پاشا ابراہیم فرانسیسی کھانوں کے ماہر و منتظم اور محمود پاشا نہی کے والد سلاطین عثمانی کے مذاق کے کھانے ریشمی خوان پوشوں سے ڈھک کر اور مہر سرخ لگا کر بھیجتے اور محمد بک نامی شاہی باورچی اور ان کے ساتھ چار خاصہ بردارنیاں خوانوں کو لیتیں، مہر کو توڑتیں اور چاندی کے برتنوں میں (سونے کے ظروف خاص خاص موقعوں پر استعمال میں آتے تھے) شاہی چاول (جس کو بھیڑ یا گائے کے سروں کو آب جوش دیکر تیار کیا جاتا تھا) روسی مرغیوں کے تودے لگا کر میز پر چن دیتیں۔ اور علیحدہ مؤدب کھڑی ہو جاتیں، بادشاہ مع اپنی بیگمات و شہزادیوں کے تشریف لاتے اور خاصہ تناول فرماتے۔

مہمانوں کا استقبال

کوئی دن ایسا نہ تھا جبکہ دو چار سیاح عورتیں اور معزز خواتین، بیگمات و حرم شاہی سے شرف ملاقات نہ حاصل کرتی ہوں آنے والی ملنے والیوں کی سواریاں ڈیوڑھیوں پر کھڑی رہتیں جن کو خواجہ سرا خوش آمدید کہتے اور باب حرم تک پہنچا کر اپنی ڈیوٹی پر چلے جاتے، پھر محافظ (دربان عورتیں) آگے بڑھتیں، برقعہ و نقاب زائرات

Marfat.com

(ملنے والیاں) سے لے لیتی اور انہیں زرین ملاقات خانہ میں بٹھا دیتی، جو فرانسیسی پردوں و فرنیچر سے آراستہ ہوتا تھا، پھر ایک کنیز بیگمات کو خبر کرتی، باریابی کا حکم ملتا تو وہ ان ملنے والی بیگم صاحبہ کو لیکر اوپر جاتی، جہاں اردگرد خوش اندام و موزوں قد کنیزیں و خواصیں زربفت کے جوڑے پاؤں میں پڑھائے، بنی ٹھنی موجود رہتیں، انہیں میں سے ایک کنیز "عصائے جواہر نگار" ہاتھوں میں لئے آگے بڑھتی اور نو وارد معزز خاتون کو حضور میں پیش کرتی، بیگمات جو نہایت بیش قیمت خوشنما رنگ کے ریشمی سائے لانبے دامنوں کے زیب تن کئے ہوتیں، وہ مسکراکر مہمانوں کی عزت افزائی فرماتیں۔ اگر ملنے والیاں غیر ملکی ہوتیں تو مترجمہ "توبسز خانم یلجارہ سنز خانم" (ترجمان کی حیثیت سے یہی دو خاتون قصر شاہی میں رہتی تھیں) آگے بڑھتیں اور ترجمانی کے فرائض ادا کرتیں۔

پھر مہمانوں کے تواضع کا اشارہ ہوتا۔ فوراً سونے کے بیش قیمت جواہر سے مرصع فنجانوں میں قہوے پیش کئے جاتے۔

یوں تو جب بھی کوئی اجنبیہ خاتون یا سیاح عورتیں سرائے عابدین کے جاہ و حشم اور خواصوں اور قہرمانوں کے رنگا رنگ وزر نگار کپڑوں کو دیکھتیں تو تصویر حیرت بنکر ہر کنیز و خواص کو ملکہ محترمہ سمجھنے لگتی تھیں، لیکن خاص خاص موقعوں و تقریبوں اور مجموں اور جشن مسرت کے لمحوں میں جب بیگمات زرنگار ملبوس اور زیورات نایاب و جواہرات آب دار کو زیب جسم و گلو کرکے نکلتیں تو دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوند پڑ جاتا۔ اس لئے کہ یہ جواہرات و الماس یورپین "ملکات" کے پاس بھی نہیں مل سکتے تھے، پھر سیاح عورتوں اور مہمانوں کے استعجاب و تحیر کو کیا پوچھتے ہیں۔

دوسرے دوسرے محل

بادشاہ سلامت تبدیلیٔ آب و ہوا اور موسم کے تغیرات کی لطف اندوزی کے لئے جب اُن محلوں میں تشریف لیجاتے جو جزائر مصر میں واقع تھے تو ہمرکاب کل بیگمات شاہی اور کنیزیں، خواصیں اور ماہ وشان محل اور منظور نظر لونڈیاں بھی ہوتی تھیں۔

لیکن حیرت ہے کہ باوجود اس کثرت ہم سفری و یکجائی قیام کے بھی قسم لے لو جو کبھی کسی بیگم کے دل میں کسی سوکن کی طرف سے ذرا بھی میل آیا ہو۔ اور خدا نخواستہ اگر کبھی کوئی سوء مزاجی و شکر رنجی ہو جاتی تو "تونا" "خلیل آغا" "باش آغا" اور خود بادشاہ ذی اقتدار کی والدہ محترمہ بیچ میں پڑکر ساری شکایتوں کو رفع دفع کرا دیا کرتیں اور اس طرح صلح ہوتی کہ پھر کسی کے دل میں کوئی خیال بھی نہیں رہتا۔ لیکن حق تو یہ ہے کہ خود بیگمات ذی مرتبت کو آپ اپنا خیال رہتا اور ہمیشہ اپنے جاہ و مرتبہ اور عزت کی نزاکت کا پاس رکھتی تھیں۔ اور جہاں پناہ بھی انہیں بیگمات کی قدر فرماتے جو عقل و فراست، سوجھ و بوجھ میں سب سے بڑھی ہوتی تھیں، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان محترمات نے آخری آخری دم تک اس وضع داری کو نباہ دیا۔ بھلا آج کون ایسی ہیں جو سوکنوں کے جھرمٹ میں رہیں اور حرف شکایت تک زبان پر نہ لائیں۔

اب اسی کو تو غور کیجئے کہ اولاد کی محرومی ایک کو نہیں تینوں کو نصیب ہوتی ہے، لیکن کیا مجال کہ کبھی کسی کی زبان سے رشک و حسد کا ایک لفظ تو سن لیجئے، یہ نہیں کہ ان تینوں کے دل اولاد کی تمناؤں سے خالی اور ذہن مطمئن تھے! بلکہ یہی چاہتیں اور ہمہ وقت خواہاں رہتی تھیں کہ کاش میری گود بھی ایک لال سے بھر پور ہو جاتی، یہ بھی کلیجہ پر سلاتی اور آنکھوں سے لگاتی، آخر مجبور ہوکر تیسری بیگم صاحبہ نے تو "فائیقہ خانم" کو "منہ بولی بیٹی" بنا لیا جنکو پڑھایا، لکھایا، صالح و نیک بنایا اور "عزت پاشا" کی زوجیت میں دیکر آنکھوں سکھ کلیجے ٹھنڈک اطمینان کی سانس لی، لیکن یہ سب کچھ ہوا پر کوئی مجلسوں سے تو بتا دے کہ کبھی اپنی چوتھی سوکن کے پیارے لخت جگر ولی عہد بہادر کو ترچھی نظروں سے بھی دیکھا ہے۔

Marfat.com

اسماعیل پاشا کی والدہ

بادشاہ سلامت کی والدہ اپنے ذوقیات و فنونِ لطیفہ کی دلچسپی میں اپنی بہوؤں سے کہیں بڑھی چڑھی تھیں، مزاج کی اتنی اچھی کہ ہر وقت ہنستی اور ہنساتی رہتیں، کیا مجال کہ کوئی ان کے سامنے منہ بسورے اور رونی صورت تو بنائے رہے۔ شکل و صورت کا کیا کہنا جبکہ بڑھاپے میں چہرے پر حسن و جمال کی وہ تابانی تھی کہ اچھی اچھی نوجوان لڑکیاں ان کے آگے ہیچ و گرد نظر آتی تھیں۔

غرضکہ فطرت نے انکو اس سن و سال میں بھی جوان دل و دماغ دیا تھا، ہر وقت وہ ان بے شمار خواصیں، قلماقنیں، کنیزیں، "محل زعفران" کو کشتِ زعفران بنائے رہتی تھیں، اور والدہ محترمہ خود بھی شریکِ انبساط رہتی تھیں۔

"گارڈن سیٹی" کی آبادی کے قریب لبِ دریائے نیل جب ایک دوسرا محل عالیشان و سربفلک تیار ہوا تو ملکہ معظمہ نے "محل زعفران" کو خیرباد فرما کر اس نئے قصر لطف و فرح کو رشکِ فردوس بنایا اور شب و روز داد مسرت و سرور دینے لگیں۔

محل کے ساتھ باغ لگائے گئے، پھولوں کی کیاریاں بنائی گئیں، جگہ جگہ بارہ دریاں اور اونچے چبوترے بنائے گئے، بینڈ بجانے والوں کا ایک جمگھٹا رکھا گیا، جو اپنے چالیس ساتھیوں اور ایک معلم کے زرق برق پتلونوں اور سرخ بانات کے کارچوبی جاکٹوں، طلائی بٹنوں اور ترکی ٹوپیوں کو اوڑھے اور بیچ میں اطلسی زرنگار نشانِ حکومت کو حرکت دیتے ہوئے صبح و شام مصروف نے نوازی رہتے تو راہگیر تک بت بن جاتے اور گھنٹوں اپنے کاموں سے غافل تصویرِ حیرت بنے "سحر سامری" کو سنا کرتے تھے۔

خصوصاً ہر وقت محل اور بھی غنا و سرود کی صدائے لطیف سے دلکش ہو جاتا جب قصر میں کوئی جشن یا یوم مسرت یا معزز مہمانوں کی پذیرائی کا اہتمام ہوتا تھا، چنانچہ ایسے موقعوں پر قریب حرم "موسیقی خانے" میں بینڈ بجائے جاتے، نادرین کے خیر مقدم کے ترانے گائے جاتے، عربی، ترکی، انگریزی طرز کے سلامی بجنے لگتے۔ ساتھ ہی اندرونِ محل کے بڑے ہال میں مصری و ترکی مطربہ ستار و بربط پر خیر مقدم کے گیت گانے لگتیں، رقاصانِ حرم ناچتی گاتیں، نقلیں کرتیں، اور مہمان کی دلچسپی و تفریح کا پورا سامان بہم پہنچا دیتیں، مطربانِ قصر و رقاصانِ دربار زربفت کے پاجامے اور ملبوسات بیش قیمت سے اپنے حسن و جمال اور شباب کی رنگینیوں میں وہ کیف آور شراب بھر دیتیں کہ مدعوئین حرم کے دل و دماغ میں جوانی و شباب کا نشہ مستولی ہو جاتا اور ہر تار نفس سے صدائے "ہا، ہا" نکلنے لگتی۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب ان ظاہری نقوش کے ساتھ آواز کے جزر و مد نیز بربط و ستار کے تاروں کی ہمنوائی کیا کیا سحر آفرینیاں نہ کرتی ہوگی۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ملکہ معظمہ "خوشیار خانم" (اسماعیل پاشا کی والدہ) خود فنِ جمیل کی ایک زندہ مرقع تھیں اور یہی وجہ تھی کہ انکا محل خوبصورت چھوکریوں اور حسین لونڈیوں و کنیزوں کی اندر کا اکھاڑا بنا ہوا تھا، اور صرف یہی نہیں کہ ہزاروں پری تمثال ماہ وشوں کو جمع کر لیا گیا تھا، بلکہ ان سب کی تعلیم و تہذیب کا بھی خاص اہتمام تھا، ایک دو نہیں متعدد مصری و ترکی نیز غیر ملکی معلمہ و اتالیق کو انہیں "غزالان حرم" کیلئے مقرر کیا گیا تھا۔

کہنے کو تو یہ ایک ملکہ کا محل تھا لیکن سچ پوچھو تو یہ قصر ایک شرقی اسکول تھا، جس میں ہر سال کافی تعداد میں چرکسی نوعمر ننھی لونڈیاں ترکی تاجروں سے خریدی جاتیں اور تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد بیگماتِ شاہی کے ہاتھوں فروخت ہوتی تھیں، وہ ان کے چہروں کی ساخت، قد کی موزونی، تہذیب و اخلاق کی درستگی کا امتحان لیتیں، اگر پسند آنے پر منہ مانگے داموں خرید لیتی تھیں اور ان میں سے بھی جو سب سے زیادہ من حیث تعلیم و تربیت اور اخلاق و سیرت، صورت و شکل میں فوقیت رکھتی اسکو نذرِ شاہی کرتیں اور انتخاب صحیح کی داد لیتی تھیں۔

Marfat.com

ملکہ معظمہ کا دسترخوان

یہاں بادشاہ کا محل یورپ و فرانس کی تہذیب کا نمونہ تھا

وہاں انکی والدہ کا قصر مشرقی روایات کا حامل تھا، وہاں اگر میز و کرسیاں تھیں تو یہاں مخمل و کمخواب کا فرش چٹائیوں کی شکل بچھا ہوتا تھا، جس کے وسط میں ایک میز ہوتی تھی۔ جس پر زرنگار چادر ہوتی، اور اس پر چاندی کے طشت جن میں سونے کے ظروف ہوتے تھے۔ اور بیگمات و شہزادیاں، مہمانیں ملنے والیاں ملکہ معظمہ کے ساتھ میز کے چاروں طرف بیٹھ جاتیں، خاصہ بردار لونڈیاں و خواصیں لباس فاخرہ میں کھڑی مورچھل ہلاتیں، پنکھے جھلتیں اور کوئی نظریں نیچے کئے اشارہ کی منتظر رہتی تھیں۔

مہمانوں کی پذیرائی

قصر محترم کے استقبال کی صورتیں اور اس کے قوانین بالکل وہی تھے جو سرائے عابدین میں آپ دیکھ چکے ہیں، لیکن یہاں نشست و برخاست کے طریقے مشرقی اور قلعی مشرقی تھے۔ وہی فرش، وہی مودبانہ نشست و برخاست ویسے ہی قہوہ و یاسمن کی لکڑیوں کے حقے (جن کے نیچے چاندی کے طشت ہوتے تھے) سے تواضع، جن کا دل چاہتا پئیں یا مودبانہ خدمات پیش کرکے رکھ دیتیں۔ اسی طرح تعظیماً کھڑے ہو کر اپنی بزرگ میزبان کا احترام کرنا اور ملکہ معظمہ کا ایسے موقعوں پر مسکرا دینا اور ہنس کر جی کا خوش کر دینا معمول تھا، چنانچہ جب معزز خواتین واپس ہوتیں تو انہیں علیحدہ ملاقاتی کمرہ میں شربت، شوربہ پیش کیا جاتا تھا اس کے بعد وداع کرنے والی لونڈیاں و کنیزیں "خارجی گیٹ" تک مشایعت کرکے مہمان کا دل باغ باغ کر دیتی تھیں۔

یہ تھا مصر کے گزشتہ شاہی محل و قصور کی زندگی کا مختصر خاکہ جو اب صرف خواب ہے یا افسانہ، نہ وہ بیگمات رہیں نہ وہ رنگ رلیاں اور نہ وہ عزا با پروزیاں رہیں۔ "کل من علیہا فان و یبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام"۔

(ندیم۔ نومبر سنہ ۱۹۳۴ء)

Marfat.com

محمد علی پاشا

از جناب مولوی عبدالرحمن صاحب ناصر عربی اے (اعظم گڈھ)

۱۷۶۹ء میں محمد علی پاشا قوالہ (KAWALA) میں پیدا ہوا۔ یہ ایک البانوی کسان کا لڑکا تھا۔ بڑے ہونے کے بعد اس نے ترکی فوج میں ملازمت اختیار کر لی اور جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو یہ فرانسیسیوں کے خلاف لڑا۔ اس زمانہ میں مصر کے اندر دو لڑائیاں ہوئی تھیں، ایک اہرام مصر کے قریب اور دوسری خلیج ابوقیر (ABOVKIR) کے ساحل پر۔ ان دونوں لڑائیوں کے بعد ترکی فوجیں مصر سے ہٹائی گئیں۔ مگر ۱۸۰۱ء میں محمد علی پاشا پھر ایک رجمنٹ کی حیثیت سے مصر آیا، اس وقت یہاں مملوکوں کی حکومت تھی۔ انگریز بھی فی الحال اس پر قبضہ نہیں کر سکتے تھے، اس لئے کہ اس وقت ان کے پاس وہاں کوئی بڑی فوج موجود نہ تھی۔ محمد علی نے آہستہ آہستہ وہاں اپنا قدم جمایا اور بالآخر قاہرہ کے شیوخ کو اپنا ہم خیال بنا کر وہاں کا پاشا یعنی حاکم بن بیٹھا اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں ایک بڑی فوج مغربی انداز پر تیار کی، چنانچہ جب ۱۸۰۷ء میں انگریزوں نے مصر پر حملہ کیا تو محمد علی نے اپنی اسی فوج کے ذریعہ، ان کو فاش شکست دی۔

۱۸۰۷ء سے لیکر ۱۸۲۹ء تک میں محمد علی پاشا نے مصر کو بالکل ایک نئے سانچے میں ڈھال دیا، سلیمان پاشا کی نگرانی میں ایک بڑی فوج تیار کی، فرانسیسی ماہروں کی رہنمائی میں دو بیڑے تیار کرائے۔ ایک بحر روم کے لئے اور دوسرا بحر احمر کے لئے۔ اسکندریہ میں ڈاک کا انتظام کیا۔ مختلف اسلحہ خانے بنوائے۔ مصر کو سارے ملک کی ملکیت قرار دیا اور زراعت اور صنعت کا اجارہ حکومت کے لئے مخصوص کر دیا۔ زراعت کو ترقی دی اور روئی، گنّے اور زیتون کی کاشت کو بڑے پیمانہ پر شروع کیا، اسکندریہ سے لیکر نیل تک نہر نکلوائی۔ اور نیل کا دہانہ کاشت کے کام میں آنے لگا۔ محمد علی پاشا کو صحت اور صفائی کا بھی بہت خیال تھا۔ چنانچہ اسکندریہ کا شہر اس نے از سر نو تعمیر کرایا اور اس کے لئے پانی کا انتظام بہت بہتر کر دیا۔

۱۸۱۸ء میں محمد علی پاشا نے وہابیوں کو حجاز سے نکالا۔ ۱۸۲۱ء میں اس کے لڑکے اسمٰعیل نے سوڈان پر لشکر کشی کی اور دو برس کی مدت میں اس پر پوری طرح قابض ہو گیا۔ ۱۸۲۳ء میں شہر خرطوم آباد کرایا، اسی دوران میں سلطان ترکی نے یونان کے خلاف اس سے فوجی مدد طلب کی، چنانچہ ۱۸۲۴ء سے ۱۸۲۹ء تک محمد علی پاشا کی فوجیں یونان میں رہیں، محمد علی پاشا چاہتا تھا کہ اس کی ان خدمات کے بدلے اسے شام، حجاز اور عراق کی حکومت دیدی جائے۔ مگر سلطان راضی نہ ہوا۔ اس پر محمد علی پاشا نے اپنے لڑکے ابراہیم کو بھیجکر فلسطین، شام، حلب اور قونیا پر قبضہ کر لیا۔ اس تمام مدت میں سلطان کی تین بڑی فوجوں نے شکست کھائی، اور جب مصری فوج بروسا کے پاس پہونچ گئی تو سلطان نے مجبور ہو کر یورپ کے بادشاہوں سے مدد مانگی۔ یہ ۱۸۳۳ء کا زمانہ تھا۔ روس کے سوا کسی نے سلطان کی اس دعوت پر لبیک نہیں کیا۔ انگلستان تو اس لئے چپ رہا کہ اس وقت اس کے یہاں ریفارم بل (REFARM. BILL) کا ہنگامہ برپا تھا۔ سلطان نے جب دیکھا کہ ہر طرف خاموشی ہی خاموشی طاری ہے اور بجز روس کے کوئی اس کی دعوت کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تو اس نے روس سے مدد لینا مناسب نہ سمجھا اور چنانچہ شروع میں اس سے مدد نہیں لی۔ مگر جب پانی سر سے گذر گیا

Marfat.com

اور مصری فوج برابر آگے بڑھتی رہی تو اس کی مدد قبول کرنے پر مجبور ہو گیا اور بالآخر اس سے مدد کی درخواست کر ہی دی، چنانچہ روسی بیڑا قسطنطنیہ کی حفاظت کے لئے آ دھمکا اور دس ہزار فوج اس کے نیچے اتار دی، برطانیہ اور فرانس کو جب اس معاملہ کی خبر ہوئی تو وہ دونوں حکومتیں بہت بگڑائیں، فرانس پہلے ہی سے محمد علی پاشا کا ہمدرد تھا اور انگلستان بہر صورت روسیوں کی اس بالادستی کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے ان دونوں نے مل کر سلطان محمود ثانی پر زور ڈالا اور کسی طرح اس کے اور محمد علی کے درمیان صلح کرا دی۔ محمد علی پاشا کو شام اور ضیا اوآنہ کی حکومت بذریعہ فرمان دیدی گئی۔ یہ سب کچھ ۵ مئی ۱۸۳۳ء کو ہوا۔

روس نے بھی اپنے احسان سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اسی سال جولائی میں روس اور ترکی کے درمیان ایک معاہدہ .... ہوا جس میں ایک خفیہ شرط یہ بھی تھی کہ ترک کسی قوم کے جنگی جہازوں کو باسفورس سے نہ گزرنے دیں گے۔ اس معاہدے کی خبر جب پھیلی تو انگریز اور فرانسیسی دونوں بہت برہم ہوئے اور دونوں نے ایک ساتھ اس پر اعتراض کیا، انگریزی وزیر خارجہ مسٹر پامرسٹن نے خفیف بندر گھڑکیوں سے کام نکالنا چاہا جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس لئے کہ فرانس کا بادشاہ لوئی فلپ کسی طرح اس وقت لڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ دوسری طرف روس بھی اس فکر میں تھا کہ کسی طرح انگلستان کے دل میں یہ بات بٹھا دے کہ "ان دونوں کی آپس میں کوئی مخالفت نہیں اور اگر دونوں ترکی اور ایشیا کے معاملات میں اتحاد عمل سے کام لیں تو دونوں کے حق میں بہت بہتر ہو گا، مگر انگریز پہلے ہی سے روسیوں کی طرف سے بدظن تھے، اس لئے ان کی ان باتوں پر اعتبار نہ کیا۔

۱۸۳۰ء میں یورپ کے مختلف ملکوں میں انقلاب کی لہر دوڑی اور اس سلسلہ میں پولینڈ کے اندر بھی بغاوت کی آگ بھڑکی جس کے بعد روس، پرشا اور آسٹریا نے سوچا کہ اس انقلابی تحریک کو دبانے کے لئے از سر نو "مقدس اتحاد" کے مردہ جسم میں روح پھونکنی چاہیے، اگرچہ "مقدس اتحاد" اپنی پرانی شکل میں قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے کہ اب فرانس کا شمار انقلاب پسند ملکوں میں ہونے لگا تھا اور دوسری طرف انگلستان کی خارجی سیاست دل سے نہ سہی تو کم از کم زبانی ہی سے تمام ملکوں کی لبرل تحریک سے ہمدردی کا اظہار کرتی تھی۔ اس بنا پر مارچ ۱۸۳۳ء میں صرف روس، پرشا اور آسٹریا نے آپس میں ایک معاہدہ کیا جس کی تجدید پھر اسی سال نومبر میں کی گئی۔ ان تینوں ملکوں نے مل کر طے کیا کہ فرانس کو دوسرے ملکوں میں انقلابی تحریک پھیلانے سے روکیں گے۔ اور اگر کوئی بادشاہ انقلاب کے معاملہ میں ہم سے یا رعایا کے خلاف کچھ مدد چاہے گا تو ہم سب اس کی مدد کریں گے۔ ترکی کے متعلق ماہروں کی ایک کمیٹی، جس کو زار نے مقرر کیا تھا، پہلے ہی یہ مشورہ دے چکی تھی کہ ترکی سلطنت کا اس کی موجودہ کمزور حالت میں رکھنا ہی روس کے حق میں زیادہ بہتر ہے"۔ چنانچہ اتحادیوں نے طے کیا کہ اب وہ عثمانیہ سلطنت کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے اور اگر وہ قائم نہ رہ سکی تو پھر متفقہ طور پر طے کریں گے کہ اس کے بارے میں کیا پالیسی اختیار کی جائے۔ اتحادیوں کا یہ فیصلہ انگلستان اور فرانس دونوں کے حق میں برا تھا۔ اس لئے چاہئے یہ تھا کہ ایسی صورت میں دونوں مل کر کوئی ایک بات طے کر لیتے۔ مگر حالات نے ایسا نہ کرنے دیا۔ چونکہ فرانس کا شمار انقلابی ملکوں میں تھا اس لئے انگریزوں کو ہر وقت اس کا ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں فرانس اس کا کام نہ بگاڑ دے، چنانچہ انگریز فرانس کی ہر تجویز کی ہمیشہ مخالفت کرتے تھے۔

۱۸۳۳ء میں انگلستان نے اسپین اور پرتگال کی حکومتوں سے ایک اتحاد کیا جس میں بعد کو فرانس بھی شریک کر لیا گیا۔ اس وقت اسپین اور پرتگال میں خانہ جنگی ہونے والی تھی، اگر دب جاتی؟ اور متذکرہ بالا اتحاد بھی وجود

Marfat.com

میں نہ آتا، تو یہ دونوں حکومتیں برباد ہو جاتیں۔ اور ان کی تجارت کو سخت نقصان پہونچتا۔

اس کے بعد انگریزی سیاست نے پھر ایک کروٹ لی اور انگریزوں نے سوچنا شروع کیا کہ آیا فرانس سے تعلقات بڑھائیں، یا پھر روس سے ملکر ترکی معاملات طے کریں اور فرانس کو چھوڑ دیں۔ اس کے ساتھ زار بھی کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح فرانس اور انگلستان کے اتحاد کو ختم کرا دے، فرانس سے اسے اصولی عداوت تھی، اس لئے وہ چاہتا تھا کہ انگلستان، فرانس کو چھوڑ کر روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔

ادھر سنہ ۱۸۳۹ء میں سلطان ترکی نے شام پر عراق کی طرف سے حملہ کرنے کا حکم دیدیا۔ چنانچہ نصیب کے مقام پر، ابراہیم پاشا کے ہاتھوں، ترکوں نے سخت شکست کھائی اور اس کے تھوڑے دنوں کے بعد احمد پاشا جو ترکی کا امیر البحر تھا، پورے بیڑے کو لے کر اسکندریہ پہونچا اور وہاں اپنے بیڑے کو محمد علی پاشا کے حوالہ کر دیا اسی دوران میں یکم جولائی سنہ ۱۸۳۹ء کو سلطان محمود کا انتقال ہو گیا۔

سلطان محمود کی جگہ اس کا لڑکا عبدالمجید تخت پر بیٹھا۔ اس کی عمر ابھی کوئی ۱۶ برس کی تھی۔ یورپ کی ریاستوں کو فکر ہوئی کہ کسی طرح ترکی کو محمد علی پاشا کے دست تصرف سے بچالیں۔ چنانچہ ان سب نے ملکر اعلان کیا کہ وہ سلطان ترکی کی سرپرستی کریں گے اور ساتھ ہی محمد علی پاشا کو بھی کہلا بھیجا کہ اب ترکی کا معاملہ صرف سلطان سے متعلق نہیں بلکہ سارے یورپ سے ہے۔ اس اعلان میں فرانس شامل نہیں تھا۔ فرانس والے محمد علی پاشا کے بڑے ہمدرد تھے اور وہاں کی رائے عامہ حکومت کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ محمد علی پاشا کی مدد کرے۔ فرانس نے چاہا کہ مغربی قوموں کا اتحاد محمد علی پاشا کے خلاف نہ ہو۔ بلکہ روس کے خلاف ہو جائے۔ اس لئے فرانس کے نمایندے نے برطانوی سفیر کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ محمد علی پاشا کے خلاف نہ ہو۔ بلکہ روس کے خلاف ہو جائے، اس لئے فرانس کے نمایندے نے برطانوی سفیر کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ محمد علی پاشا کے خلاف فی الحال کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ لیکن اگر روس اس کا سرپرست بن جائے، تو پھر برطانیہ اور فرانس ملکر غور کریں کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ مگر دوسری طرف زار نے جو گفتگو شروع کی تو اس میں برطانیہ کو زیادہ جاذبیت نظر آئی۔ زار نے کہا کہ برطانیہ مصر کے متعلق جو کارروائی کرے گا وہ اسے منظور ہوگی اور پھر اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے گا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ "صلحنامہ" انکار سکیلیس" کو منسوخ سمجھیگا مگر اس شرط پر کہ دردانیال اور باسفورس تمام قوموں کے جنگی جہازوں کے لئے بند کر دیئے جائیں۔ زار نے اس کا بھی ذمہ لیا کہ ترکی کے متعلق جو کچھ یورپ کی ریاستیں کرینگی اس پر بھی وہ عمل کرے گا، اور اپنی فوج کو مغربی مدبروں کا آلہ کار بنا دے گا۔ مگر انگریز روس کی اس "نیکی" پر انگشت بدنداں تھے اور ابھی طے نہیں کرنے پائے تھے کہ روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں یا فرانس کی طرف؟ کہ اتنے میں انہیں معلوم ہوا کہ فرانس براہ راست خود سلطان سے گفتگو کر رہا ہے۔ تو پھر انہوں نے روس، آسٹریا اور پرشا سے مل کر "چوگھے اتحاد" کی بنیاد ڈالی جس میں فرانس کو شامل نہیں کیا۔ یہ اتحاد جولائی سنہ ۱۸۴۰ء میں لندن کے اندر ہوا۔ اس میں یہ بھی طے ہوا تھا کہ محمد علی پاشا کو الٹی میٹم بھیجدیا جائے۔ فرانس والوں کو جب اس اتحاد کی خبر ملی تو وہ بہت برہم ہوئے اور ان کی حکومت نے جنگ کی تیاری کا حکم دیدیا۔ مگر فی الحال لڑنے کے لئے تیار نہ تھی۔ محض اپنے جنگی مظاہروں سے کام نکالنا چاہتی تھی۔

محمد علی پاشا اس امید میں تھا کہ فرانس اس کی مدد کریں گے۔ اور فرانسیسی اس خیال میں تھے کہ محمد علی پاشا کچھ دنوں تک اتحادیوں کا مقابلہ کرے گا۔ ابھی اسی خیالی دنیا کی سیر ہو رہی تھی کہ ۱۲ اکتوبر کو اتحادیوں نے بیروت پر قبضہ کر لیا۔ موقع کی نزاکت سے فائدہ اٹھانے

Marfat.com

ہوئے شامی، سب کے سب ابراہیم پاشا کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور بالآخر ابراہیم پاشا کو شام چھوڑنا ہی پڑا نومبر میں اتحادیوں نے عکا پر قبضہ کرلیا، اور پھر اسی مہینہ میں اسکندریہ پہ گولہ باری کی دھمکی دے کر محمد علی پاشا کو صلح کرنے پر مجبور کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایشیائی مقبوضات اس سے چھین لی گئیں، اور ترکی بیڑے کو واپس کرنے کا بھی وعدہ کرنا پڑا۔ جس کے بدلے اتحادیوں نے یہ وعدہ کیا کہ وہ سلطان سے سفارش کریں گے کہ مصر کی حکومت اس کے ہاتھ میں رہنے دی جائے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تو فرانس نے اپنی آن باقی رکھنے کے لئے محمد علی پاشا کے واسطے کچھ اور حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کی تجویز یہ کہ "تمام مغربی ریاستیں ترکی کی ضامن ہوں" منظور نہیں کی گئی۔ اور اس کے دو سال بعد روس اور انگلستان میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے درہ دانیال اور باسفورس کی تنگنائے جنگی جہازوں کے لئے بند قرار دیدی گئیں، یہ واقعہ یکم جولائی ۱۸۴۲ء کا ہے۔

(ندیم ماہ جنوری ۱۹۴۷ء)

Marfat.com

شیخ محمد عبدہٗ

از جناب سید ولایت علی اصلاحی صاحب

تقریباً سو سال پہلے شمالی وادی نیل کے ایک گاؤں میں ایک مصلح اعظم پیدا ہوا جو محمد عبدہٗ کے نام سے روشناس ہوا۔ آپ کی پرورش و پرداخت مصر کے اوسط طبقے کے لوگوں کی طرح ہوئی آپ کے بچپن میں کچھ ایسے دور بھی گذرے جو قریب تھا کہ آپ کی زندگی کے دھارے کو پھیر دیتے۔ چنانچہ آپ کے گھر والوں نے آپ کو جامع احمدی بھیجدیا۔ لیکن آپ وہاں حصول تعلیم میں کوتاہی کرنے لگے۔ آپ پر بڑی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ اس لئے آپ وہاں سے فرار ہو گئے اور ایک شہر میں جا چھپے جہاں آپ کے کچھ خویش و اقارب رہتے تھے۔ چنانچہ وہاں قدرت نے آپ کا ساتھ دیا۔ آپ کے اقرباء میں ایک شیخ صوفی تھے ان کو تربیت اطفال میں بڑی مہارت تھی وہ جانتے تھے کہ بچوں کو کس طرح سدھایا جاتا ہے، آغاز شباب میں ان کی باگ ڈور کس طرح سنبھالی جا سکتی ہے۔ جس کا نتیجہ ہوا کہ محمد عبدہٗ کی تربیت صحیح طور پر ہوئی اور حصول علم کا شوق و ولولہ پیدا ہوا۔ چنانچہ آپ نہایت ذوق و شوق سے جامع احمدی تشریف لے گئے اور نہایت محنت اور شوق سے حصول علم میں لگے رہے۔ اور ساتھ ساتھ ریاضت صوفیہ بھی کرتے رہے جس کی آپ کے شیخ صوفی نے ہدایت کی تھی۔ وہاں آپ نے اپنی زندگی کے تقریباً چار سال گذارے اس کے بعد پھر آپ قاہرہ چلے گئے تاکہ وہاں علوم دینیہ کی تکمیل کریں۔ اس وقت وہاں دو فرقوں اور صوفیوں میں باہم کشمکش چل رہی تھی چنانچہ قریب تھا کہ یہ نوجوان طالب علم ان جھگڑوں کے جال میں الجھ کر رہ جائیں۔ لیکن حسن اتفاق سے اس وقت شیخ جمال الدین افغانی مصر ہی میں مقیم تھے۔ چنانچہ آپ کی تنہا ذات تھی جس نے اس نوجوان طالب علم کو ان تمام جھگڑوں سے صاف بچا لیا۔ محمد عبدہٗ آپ کے حلقۂ درس اور صحبت میں پابندی سے حاضر ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ شیخ جمال الدین افغانی کی دو سال کی صحبت کے بعد یہ نوجوان صوفی ایک نئی خلقت سے ظاہر ہوا اور اسکی عقل و حکمت کی سنہری کرنیں پھیلنے لگیں۔ پھر شیخ محمد عبدہٗ نے میدان صحافت میں قدم رکھا اور "الاہرام"* میں مضامین لکھکر اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ چنانچہ اس نوخیز سترہ سالہ نوجوان پر لوگوں کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ پھر آپ سرکاری گزٹ "الوقائع المصریہ" کے چیف ایڈیٹر رہے اور آپ حکومت کے مختلف شعبوں کے طریقۂ کار سے واقف ہوئے اور آپ نے حکومت کے عیوب کو سمجھا تو سماجی اصلاح، آزادی، انصاف، اور جمہوریت پر مضامین لکھتے رہے۔

پھر آپ نے سیاحی شروع کر دی، یورپ کے بعض حصے اور مشرقی اسلامی ممالک کے اکثر حصوں کا سفر کیا۔ اس لئے آپ تجربے اور علم و حکمت میں یکساں بحر بیکراں تھے۔ چنانچہ حکومت نے آپ کو جج کے ... پر فائز کیا اور پھر ترقی کر کے عدالت عالیہ میں ایک ذمہ دارانہ منصب پر سرفراز ہوئے۔ آپ کے فطری کمالات اور ذہنی ارتقا کا مظاہرہ ہوتا رہا۔ اسی اثناء میں فرنچ سیکھنے لگے اور آپ نے فرنچ کا گہرا مطالعہ کیا ان کے بعد حکومت ہند نے دیار مصر کا مفتی اعظم مقرر کر دیا۔

اصلاح کا جذبہ جو آپ کے دل آلازہری میں پیدا ہوا تھا برابر ترقی کرتا رہا اور آپ اس میں مجاہدانہ کوشش کرتے رہے لیکن موت نے اتنی مہلت نہ دی کہ اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کر سکیں چنانچہ ۱۱ر جولائی ۱۹۰۵ء میں یہ خیمۂ علم و عمل دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔

آپ نے ایسے راہ اصلاح کی طرف لوگوں کو دعوت دی جو آج تک مشعل ہدایت کا کام دے رہی ہے۔ آپکی پوری سیرت لکھنے کے لئے تو دفتر کے دفتر چاہیئے اور اس وقت اس کا موقع نہیں۔ بہرحال! میں آپکے بعض اہم مقاصد کی طرف اشارہ کئے دیتا ہوں۔ پہلے پہل آپ نے عزت نفس اور خودداری کی تبلیغ کی تاکہ وہ جان لیں کہ ان کے حقوق حاکم پر بھی ہیں جیسا کہ حاکم کے حقوق ان پر ہیں۔ ایک جگہ آپ تحریر فرماتے ہیں "جس کی طرف میں بلا رہا تھا لوگ اس سے بالکل اندھے ہیں اور اس کی سمجھ سے کوسوں دور لیکن یہ ایک ایسی چیز ہے جس پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے اس کے نہ سمجھنے سے انسان کمزوری اور ذلت و خواری کا شکار ہوتا ہے وہ چیز جان لینا ہے کہ حکومت رعایا سے کس حد تک اطاعت کا مطالبہ کر سکتی ہے اور رعایا حکومت سے کس حد تک انصاف کی طالب ہو سکتی ہے میں نے مصریوں کو اسی کی ترغیب دلائی کہ وہ جان لیں کہ ان کے حقوق حکومت پر کیا کیا ہیں۔

ہم نے انہیں بتلایا کہ حکومت کتنی ہی منصف ہو غلطیاں کر سکتی ہیں اور اس کے ارباب اقتدار کبھی کبھی نشۂ حکومت میں اپنے فرائض کو

* "الاہرام" مصر کا مشہور روزانہ اخبار ہے جو آج تک جاری ہے اور جس کی اشاعت تقریباً نوے ہزار ہے۔

Marfat.com

بھول جاتے ہیں اور جب تک رعایا اپنے قول و عمل سے روگرداں نہ جائے حکومت کی کوتاہیاں دور نہیں ہو سکتیں۔" پھر ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں: "انسان کی کامرانی عقل و دین کے صحیح امتزاج پر موقوف ہے۔ عقل انسان کے لئے مادی کامرانی کے اسباب فراہم کرتی ہے اور دین روحانیت کے اسباب مہیا کرتا ہے اور برے اخلاق سے جو نظام باطل کا سبب بنتے ہیں بلند اور بالاتر کر دیتا ہے۔ دین حق اور عقل میں کوئی تضاد نہیں۔" شیخ محمد عبدہٗ کا کل فلسفہ خوشگوار مستقبل اور امید پر قائم ہے۔ ظاہر ہے کہ خوشگوار مستقبل کا خیال اور امید یہ انسان کی فطرت ہے۔ باوجودیکہ آپ کا بچپن مشکلات سے خالی نہ رہا، آپکی جوانی کشمکش و رستخیز میں گذری۔ آپ کا بڑھاپا بھی یکسر اصلاحی کوششوں میں صرف ہوا۔ پھر بھی تمام باتوں کے شیخ محمد عبدہٗ اپنی زندگی کے ہر دور میں نہایت ہی صابر و شاکر رہے۔ شیخ موصوف کے نزدیک ہر شخص کو چاہیے کہ صبر کی عادت ڈالے۔ صبر سے بڑی بڑی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں۔

شیخ محمد عبدہٗ کا خیال تھا کہ دنیا میں آج نہ کل قرآن کے اصول پر دین و علم میں آشتی قائم ہو کر رہے گی اور دنیا اس عہد کے قریب آ چکی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ناسمجھوں کو فہم اور نادانوں کو عقل کی راہ دکھائی جائے اور قرآنی اصول کی صحیح طور پر تبلیغ و تشریح کی جائے۔ محمد عبدہٗ کا فلسفہ خوشخبری اور امید کے ساتھ ایمان کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ یقین پیدا کرانا چاہتے ہیں کہ نتیجے دین اور صحیح علم کے درمیان مستقبل قریب میں مناسب امتزاج ہوگا اور اس کی بنیاد پر دنیا حقیقی کامرانی سے ہم آغوش ہوگی۔ ان کا فلسفہ یکسر امید ہے اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ انسانی روح جسم سے الگ ہو کر رضوان الٰہی سے فیضیاب ہوتی ہے۔ اس میں اچھے برے کسی کی تمیز نہیں۔ اللہ کی رحمت کا سایہ اچھے برے سب پر ہوگا۔

آج خون میں لتھڑی ہوئی انسانیت کو اس پیام امید کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

ندیم ماہ نومبر ۴۳ء

Marfat.com

مسلمان اور ریاضیات

کسے خبر تھی کہ عرب جیسی اجڈ قوم کبھی بھی آفتاب علوم وفنون بنکر افق عالم پر چمک اُٹھیگی، جہاں کشت وخون کا بازار گرم تھا وہاں کے لوگوں کو کون جانتا تھا کہ یونان کے فلسفہ کی بوسیدہ ہڈیوں کو قبریں کھود کھود کر نکالیں گے اور نئی رُوح پھونکیں گے ریاضیات وفلسفہ کی طرح ڈالیں گے، اُن کے کارہائے نمایاں ترقی یافتہ قوموں کے خضر راہ بنیں گے۔

ہرچند مسلمانوں نے تاریخ نویسی میں معتد بہ حصہ لیا اور جرح وتعدیل سے کام لیکر روایت ودرایت کا خوب خوب لحاظ کرکے اُمم سابقہ کی تاریخ لکھی۔ مگر اُن کی تاریخ سلطنت کے دائرہ سے آگے نہ بڑھ سکی. مسلمانوں میں تذکرہ نویسوں کی کمی نہیں لیکن ان کا تذکرہ صوفیائے کرام کی سوانح اور اُن کی کرامات کے اساطیر لایعنی اور خوش عقیدگی کے ذوق سے آگے قدم نہ رکھ سکا، وہی صوفیائے کرام جن کا تعلق عالم لاہوت سے رہا کرتا تھا وہ عالم ناسوت میں آکر علوم وفنون کی تحصیل وحصول میں بھی معتد بہ حصہ لیا کرتے تھے، آج ہم غیر اقوام کی لکھی ہوئی تاریخ پڑھتے ہیں اور اُس میں کہیں کہیں علماء سلف کا بھی تذکرہ آجاتا ہے تو آنکھیں خوشی سے چمک اٹھتی ہیں چہرہ پر مسرت کی رو دوڑ جاتی ہے. چونکہ یہی علماء ہمارے سامنے صوفی کے لباس میں آئے تھے لیکن ابھی وہ خرقہ وسالوس تصوف پہنکر سائنس کے گروہ میں پیش پیش نظر آرہے ہیں جس کی اُمید ہم کو مطلق نہ تھی ورنہ ہم کو آج یہ تعجب نہ ہوتا، اُن کی بہت سی چیزیں ایجاد کی ہوئی موجود ہیں، ہمارے زیر درس ہیں مگر وائے غفلت کہ ہم کو اُس کی خبر نہیں۔

آیئے آج کی صحبت میں ریاضیات کا مُطالعہ کریں، تاریخ ریاضیات کے سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مُسلمانوں نے اس میں معتد بہ حصہ لیا بہت سے مسائل کا اضافہ کیا.

اِس میں تو شک نہیں کہ اسلام جہاں جہاں پہنچا اپنے ساتھ اپنی برکتوں کو بھی لیتا گیا. عربی اقوام جاہل تھیں لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھیں. اس لئے جب فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اور مصر وشام وایران کی حکومت عربوں کے ہاتھ آئی تو علوم وفنون کی طرف توجہ منذول ہوئی. گو اُن کے پاس علوم فنون کا ذخیرہ نہ تھا، دیگر اقوام سے لیا. چونکہ خلفائے بغداد علم دوست تھے یہی وجہ ہوئی کہ علوم وفنون لطیفہ کو اُن کی خلافت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی، خلفائے بغداد میں خصوصًا مامون الرشید کا زمانہ احیائے علوم کے لئے زرین زمانہ کہلانیکا مستحق ہے، مامون الرشید خود فاضل اجل تھا اس لئے اُس نے

Marfat.com

اپنے دربار میں مختلف ممالک کے علما کو اور مختلف زبانوں سے عربی میں ترجمہ کتابوں کا کرایا بہت سی کتابیں قسطنطین اعظم کے یہاں سے بغداد منگوائیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علوم و فنون کا ماوی و ملجا بغداد بن گیا۔

بطلیموس (Blolemy) اور اقلیدس (Euclid) دو مصنفین یونانی ہیں کہ جن کی کتابوں کا پہلے پہل عربی میں ترجمہ ہوا۔ اقلیدس کی کتاب "تحریر اقلیدس" پہلا ترجمہ ہے لیکن بہت کچھ غلطیاں اس میں رہ گئیں گو اس پر نظر ثانی بھی کی گئی مگر سب سے صحیح ترجمہ حنین ابن اسحاق کا تھا۔ ثابت ابن کمال نے مجسطی کا ترجمہ کیا ہے، علاوہ ان کتابوں کے ارشمیدس (Archimedes)، اپالونس (Apollonius) ہیرن (Heron) اور ذالوفنطوس (Diophantus) کے تصنیفات کے تراجم عربی میں ہوئے اور اس طرح یونان کے علوم و حکمت کے خزانہ عرب میں منتقل ہو گئے۔

اس لئے آیئے اور دیکھیں کہ مسلمانوں نے ریاضیات پر کیا کیا احسان کئے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ علوم و حکمت کی ترقی بہت کچھ ہوئی اور مامون الرشید کے زمانہ میں ہوئی اور ترقی کی بنیاد بھی اسی علم پرور خلیفہ کے ہاتھوں پڑی، گو دوسرے فرماں روایان بغداد مامون الرشید کے نقش قدم پر چلے اگر وہ دلچسپی جو اس کو تھی دوسروں کو نہ رہی، یہی وجہ تھی کہ مامون الرشید کا دربار شاہی نہ تھا بلکہ علما و فضلا کی مجلس تھا۔

مامون الرشید کے دربار کا مشہور ریاضی دان محمد بن موسیٰ الخوارزمی ہے یہ خلیفہ کی طرف سے بطلیموس کے مرتب کردہ جدول (Tablet) جو علم ہیئت میں ہے نظر ثانی اور خط نصف النہار (Meridian) کے درجہ کی پیمائش پر مقرر تھا اس نے دو کتابیں علم الجبر والمقابلہ (Algebra) اور علم الحساب (Arithmetic) میں لکھیں، لیکن دوسرا جو علم الحساب کا ہے اصلی ناپید ہے مگر اس کا ترجمہ لاطینی زبان میں موجود ہے۔ حساب کی بنیاد بالکل ہندو اصول پر ہے الجبر کے اندر اس نے قوانین اربعہ (Four fundamental laws of math) حساب کے اور مساوات رابع (Quadratic Equations) کو حل کرنے کا قاعدہ بتایا ہے۔ اس میں نہ اس نے صرف ہندوؤں کی پیروی کی ہے اور نہ صرف یونانی اصول کو مد نظر رکھا۔ اس کا قاعدہ دونوں اصول کا ایک مجموعہ ہے یہی وجہ ہوئی کہ اس کے مرتب کردہ اصول کئی صدی تک جاری رہے اُس کی کتاب الجبرا میں علم ہندسہ سے کچھ بحث ہے۔ لیکن یہ سراسر ہندو اصول کا خاکہ ہے پہلے اس نے مثلث قائم الزاویہ کو ثابت کیا ہے گو یہ نہایت ابتدائی مسئلہ ہے اس کے بعد اُس نے مثلث شکل متوازی الاضلاع (Parallelogram) اور دائرہ کا رقبہ دریافت کیا چونکہ دائرہ کا رقبہ قطر دائرہ اور یونانی حرف π (اس کا تلفظ پائی ہے) کے حاصل ضرب سے حاصل ہوتا ہے، لیکن π کی قیمت مختلف ہے۔ ارشمیدس نے اس کی قیمت $\frac{22}{7}$ بتائی ہے۔ ہندوؤں نے اس کی دو قیمتیں لکھی ہیں۔ پہلی قیمت دس کا جذر مربع ہے ($\sqrt{10}$) اور دوسری قیمت $\frac{62832}{20000}$ ($\frac{62832}{20000}$) بتائی ہے۔ خوارزمی نے دائرہ کا رقبہ دریافت کرنے میں ہندوؤں کی قیمت کو استعمال کیا ہے، کبھی پہلی قیمت اور کبھی دوسری قیمت کو اُس نے استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ خوارزمی نے علم ہیئت (Astronomy) کا جدول (Tables) تیار کیا جس پر المسلمہ المجریطی نے نظر ثانی کی ہے، الخوارزمی کا نام لاطینی میں (Algorithmi) الگورتھمی ہے یہ معرب شکل الخوارزمی کی ہے اور اسی لاطینی لفظ سے انگریزی لفظ (Algorithm) الگورتھم نکلا ہے۔

خلیفہ مامون الرشید کے دربار کے دوسرے ریاضی دان موسیٰ شاکر کے تین لڑکے تھے جنہوں نے ریاضی میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ خصوصاً علم ہندسہ (Geometry)

Marfat.com

کی ایک کتاب قابل ذکر ہے جس میں ان بھائیوں نے شلث کا
رقبہ ضلع کے ارقام (Terms) میں دریافت کیا ہے ان
تینوں بھائیوں میں سے ایک نے علم ہئیت کے جدول کے
واسطے یونان کا سفر اختیار کیا۔ راستہ میں ثابت ابن قرہ سے
ملاقات ہوئی۔ اس کی قابلیت دیکھکر وہ خلیفہ مامون الرشید
کے دربار میں لایا۔ ثابت ابن قرہ نہ صرف علم ہیئت کا ماہر
ہی تھا بلکہ وہ ریاضی کے دوسرے شعبوں میں بھی طاق
تھا۔ یونانی، سریانی اور عربی زبانوں میں بھی اس کو کمال
حاصل تھا۔ اس نے بہت سے ممتاز یونانی مصنفین مثلاً
ابو لونس تھیوڈلیس (Theodosius) ارشمیدس اقلیدس اور
بطلیموس کی کتابوں کے تراجم عربی میں کئے اور بہت سے
نئے قواعد و ضوابط اور مسائل بھی ریاضی میں منضم کئے۔

مسلم ریاضی دانوں میں البطانی کا نام نہایت مشہور ہے
البطانی لاطینی زبان میں البطیگنیس (Albategnius)
کی شکل نظر آتا ہے۔ اس کی معرکۃ الآرا ایک کتاب علم ہیئت
میں ہے جس کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا گیا ہے۔ ترجمہ بارہویں
صدی عیسوی میں ہوا۔ اسی لاطینی مترجم نے لفظ (Sinus)
کو جو علم شلث یا مقیاس الزاویہ (Trigonometry)
میں ہے عربی لفظ جیب یا جیبا جس کا ہندی میں مترادف
لفظ جیوا ہے لفظ (Sinus) سے لاطینی زبان میں ترجمہ
کیا۔ بطانی گرچہ بطلیموس کا متبع تھا مگر بلا امور میں اس نے
بطلیموس کی اتباع نہ کیا۔ اسی مصنف نے لفظ جیب یا جیبا
(Sine) عربی میں وضع کیا اور غالباً یہ ہندی لفظ جیوا
سے ماخوذ ہے۔ ہندی میں اس کے معنی نصف قطر کے ہیں
بطلیموس نے اسی کو پورا قطر لیا ہے۔ اس نے مماس التمام
(Cotangent) کا جدول تیار کیا۔ بطانی کو جیب کے
متعلق تمام اصول اور قواعد معلوم تھے جس کو البیرونی نے
اپنے زمانہ میں حاصل کیا۔ علاوہ ازیں اس نے یونانی علم
مقیاس الزاویہ میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ اس نے الجبرا کے
ذریعہ ان چیزوں کو پیش کیا جس کو یونانیوں نے بذریعہ
علم ہندسہ (Geometry) پیش کیا تھا۔ اس نے مثلث کے
تمام قواعد کروی علم مقیاس الزاویہ (— SPHERICAL
TRIGONOMETRY) کے مسائل معلوم تھے۔ اس نے
ایک نہایت اہم بالشان ضابطہ شلث منحرف الزاویہ کے
متعلق اضافہ کیا وہ یہ ہے۔ جیب التمام ا = جیب التمام
ب جیب التمام س + جیب ب جیب س × جیب التمام
(Cos a = Cos b Cos c + Sin b Sin c Cos A) اور اس نے
زاویہ کی بھی تثلیث کی۔ مگر اس کا عمل اور ثبوت آج تک
نہ ملا)

دسویں صدی عیسوی اسلامی حکومت کے لئے شہر آشوب
واقع ہوئی۔ خلافت عباسیہ کمزور ہو چکی تھی۔ بغاوتیں ہر جگہ
پھیل رہی تھیں۔ ہلاکو کی خون آشام تلوار کی پیاس خلافت
عباسیہ کے خون سے سیراب ہوئی۔ لیکن زوال بغداد کے بعد
دوسرے فرماں رواؤں کو جو بغداد کے ہوئے علم ہیئت سے خاص
شغف تھا۔ ان سبھوں نے ریاضیات کو ترقی دی۔ شرف الدولہ
نے رصد گاہ (OBSRATORY) اپنے باغ میں بنوائی
اس کے دربار کا مشہور ریاضی داں ابوالوفا خراسانی ہے
اس نے اختلاف حرکت قمری (Variation of moon)
دریافت کیا۔ اس نے جیب کا جدول آدھ درجہ (Half degree)
تک کسور اعشاریہ کے نو مقام تک ہے اس کے علاوہ اس نے
مماس (Tangent) کا بھی جدول تیار کیا اور اس نے
قاطع (Secant) اور قاطع التمام (Cosecant) اختراع
کیا۔ اس نے (Biquadratic Equation) کو علم ہندسہ سے
حل کیا اور ہا = ا ($x^4 = a$) اور ہا + اہ = ب
($x^4 + ax^3 = b$) کو حل کیا۔ شرف الدولہ کا دوسرا
ہندس الکوہی ہے۔ اس نے کروی علم مقیاس الزاویہ

Marfat.com

میں مسئلہ لائیل کو حل کیا۔ ابوالجود بھی اسی کے دربار کا مشہور ریاضی داں ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی کا مشہور ریاضی داں کرخی ہے اس نے عربی میں الجبرا تصنیف کیا اسکی تصنیف نہایت معرکۃ الآرا ہے۔ یہی پہلا شخص تھا جس نے ا لا^۲ن + ب لا^ن = ج ($ax^{2n}+x^{n}=b$) کو حل کیا۔ مساوات مربع (Quadratic Equation) کو علم ہندسہ و علم حساب سے ثابت کیا۔ یہی پہلا عربی مصنف ہے جس نے سلسلہ حسابیہ ذیل "یعنی مربع اعداد طبعیہ اور مکعب اعداد طبعیہ" (Sion of Square and cube Natural Numbers) حاصل جمع دریافت کیا اور وہ یہ ہیں۔

۱^۲ + ۲^۲ + ۳^۲ + ۴^۲ + ۵^۲ + ... + ن^۲ = (۱ + ۲ + ۳ + ۴ + ... + ن) × (۲ن + ۱)/۳

$$(1^2+2^2+3^2+4^2+\dots+n^2)=(1+2+3+\dots+n)\times\frac{2n+1}{3}$$

۱^۳ + ۲^۳ + ۳^۳ + ۴^۳ + ۵^۳ + ... + ن^۳ = (۱ + ۲ + ۳ + ۴ + ... + ن)^۲

$$(1^3+2^3+3^3+4^3+\dots+n^3)=(1+2+3+4+\dots+n)^2$$

ایشیا سے سیلاب تاتار نے اگرچہ اسلامی حکومتوں کو ایک حد تک تباہ کر دیا۔ اس تباہ شورش کے زمانہ میں طوس میں ایک بہت بڑا ہندس پیدا ہوا۔ اس کا نام نصیر الدین طوسی ہے ہرچند ہلاکو خاں خونخوار مغول تھا۔ لیکن اس کا دل علم پروری کے جذبہ سے لبریز تھا۔ نصیر الدین نے ہلاکو سے رصدگاہ بنانے کی التجا کی۔ ہلاکو نے مراغہ میں رصدگاہ بنوا دی۔ وہاں طوسی نے اپنی تحقیق شروع کی۔ طوسی پہلا شخص ہے کہ جس نے علم مقیاس الزاویہ (Trigonometry) اور علم ہیئت (Astronomy) کی تحقیق علیحدہ علیحدہ کی اور اس کمال سے لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ امریکی مصنف تاریخ ریاضیات کیجوری (Cajori) نے لکھا ہے۔ کہ:-

"He for the first time elaborated Trigonometry independently of Astronomy and to such great perfection that had his work been known of the fifteen century might have spared their labour

اس نے پہلے پہل علم مقیاس الزاویہ کی تحقیق علم ہیئت سے علیحدہ ہو کر شروع کی اور اس کمال سے تحقیق کی کہ اگر اس کی تصنیفیں مشہور ہوتیں۔ تو پندرہویں صدی کے مغربی ہندسوں کی محنت بہت بچ جاتی۔"

اتنی ترقیاں مشرق میں ریاضیات کی ہوتیں۔ لیکن مغرب میں بھی اس کو کچھ کم ترقی نہ ہوئی۔ گرچہ بغداد اور قرطبہ میں مسلمانوں کی حکومتیں تھیں، عدالتی زبان، تحریری زبان عربی ہی تھی، مذہب دونوں کا ایک تھا۔ مگر علوم و حکمت کی ترقی میں ایک دوسرے سے آزاد تھے۔

آئیے اور سرسری نظر قاہرہ کی رصدگاہ پر ڈالیں۔ اسکا مشہور ہندس ابو یونس ہے۔ اس نے کروی علم مقیاس الزاویہ (Spherical Trigonometry) کے بہت مسائل حل کئے۔ مصر کا دوسرا ہیئت داں ابن الہیثم ہے۔ اس نے قطع مکافی (Parabola) کے گھومنے (Revolution) سے جو مجسم نما (Paraboloid) شکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا حجم دریافت کیا۔ اس نے اعداد طبعیہ کا حاصل جمع ایک سے چار قوت نما (Index) دریافت کیا۔ ہسپانیہ (Spain) میں بڑا ہندس اور ہیئت داں جابر بن فلاح ہے۔ انگریزی (Geber) جیبر کے نام سے مشہور ہے۔ اس نے علم ہیئت میں نو کتابیں لکھیں، جس کی پہلی کتاب علم مقیاس الزاویہ ہے۔ اس نے بہت سے مسائل میں اپنے ممتاز ہمعصروں اور بطلیموس سے اختلاف کیا۔ بہت سی باتوں کا انکشاف کیا۔ گرولی

Marfat.com

علم مقیاس الزاویہ میں ایک نیا مسئلہ اضافہ کیا، وہ مسئلہ جابر (Geber's Theorem) کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن بلطی علم مقیاس الزاویہ میں اس نے یونانی اور ہندی اصولوں کو اختیار کیا۔ ان سبھوں کے علاوہ سب ہندسہ اور ہیئت داں گذرے ہیں جن کا ذکر بخوف طوالت نظر انداز کرنا پڑا۔ انشاء اللہ کسی دوسری صحبت میں تشریح بیان کریں گے۔

عرب جیسی اجڈ قوم نے محض عرصہ قلیل میں دنیا کی حکمراں بن بیٹھی۔ لیکن اس سے زیادہ تعجب خیز امر یہ ہے کہ چند ہی دنوں میں عربوں نے وہ علوم و فنون سیکھے، جو یقین نہیں کیا جا سکتا اور وہ ترقی کی کہ جس کا ایک مجمل تذکرہ ہم نے پیش کیا۔

نوٹ :- مندرجہ بالا مضمون میں اصطلاحی الفاظ کی جو دشواریاں پیش آئیں وہ ناقابل تحریر ہیں۔ تمام اصطلاحی الفاظ انگریزی کے بشکل اردو کا جامہ پہن سکے۔ اسکی بڑی وجہ یہ ہوئی کہ اول تو یہ سب فنون موجودہ وقت میں انگریزی میں پڑھائے جاتے ہیں اور ہمارے علماء کے درس سے خارج ہیں اسوجہ سے یہ سب اصطلاحات ہم تک نہ پہنچیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ دور میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحات جس تیزی سے ہماری زبان میں رواج پا رہے ہیں بمشکل ان سے احتراز کیا جا سکتا ہے اور اگر اسوقت انگریزی اصطلاحات کے مرادف الفاظ عربی کے پیش کئے جائیں تو بمشکل اُسے کوئی سمجھ سکتا ہے اسلئے ہم نے بہت لحاظ اس امر کا کیا ہے کہ جہاں عربی اصطلاح ہے اسی جگہ قوسین میں انگریزی اصطلاح بھی لکھ دیا ہے تاکہ ناظرین کو دقت نہ ہو۔ آسانی کے واسطے ذیل میں مرادف الفاظ کی ایک فہرست لکھے دیتے ہیں۔

علم مقیاس الزاویہ	Trigonometry
علم ہندسہ	Geometry
علم ہیئت	Astronomy
جیب ا	Sin a
جیب التمام	Cos a
جیب ا	Sin A
جیب التمام ا	Cs A
مماس	Taugent
مماس التمام	Colongent
قاطع	Secant
قاطع التمام	Cosecaut

ارقام :	Terms	س :	C
ھ :	H	ا :	A
ن :	N	ب :	D
ا :	a	جیب س	Sin C
ب :	b.	جیب التمام س	Cs C

(فروری ۳۳ء)

عِلمِ طب اور مسلمان

از جناب نبی احمد صاحب اصلاحی، سرائے میر اعظم گڈھ

شریعت اسلامیہ اور طب

اسلام نے ابتداہی سے علم طب کے متعلق وہ فیاضانہ رویہ اختیار کیا جس کی نظیر دوسرے قدیم مذاہب میں نہیں مل سکتی۔ داعی اسلام علیہ السلام نے مبعوث ہونے کے بعد اپنے پیرووُں کو بارہا مرض کا علاج کرانے اور طبیب سے مشورہ لینے کی ترغیب دی۔ آنحضرت صلعم سے متعدد حدیثیں اس قسم کی مروی ہیں جن میں سے بعض تو مرض کے علاج کے استحباب اور بعض اس کے وجوب پر بھی دلالت کرتی ہیں مثلاً آپ نے فرمایا ہے کہ:۔

"ہر مرض کی کوئی نہ کوئی دوا ہے جب دوا مل جائے تو مرض خدا کے حکم سے ضرور اچھا ہو جائے گا" (مسلم)

"اے خدا کے بندو علاج کرو کیونکہ سوائے بڑھاپے کے خدا نے کوئی ایسا مرض پیدا نہیں کیا جس کی دوا نہ ہو" (ترمذی)

اسلام نے اپنے مذہبی امور کے ضمن میں بھی طب کی ہر طرح سے قدر و منزلت قائم رکھی۔ اس نے عبادت کے متعدد ارکان، جو اس کے نزدیک فرض عین تھے۔ تدبیر صحت کے اصولوں کا خیال کر کے ضرورت کے موقع پر ساقط کر دئے۔ تدبیر صحت کے اصول فی الجملہ تین ہی ہیں، حفظان صحت، مادہ فاسد کا نکالنا اور پرہیز کرنا۔

حفظان صحت کا خیال کر کے اسلام نے مسافر سے فرض روزے ساقط کر دئے کیونکہ سفر میں تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے اور کھانے پینے کا معقول انتظام نہیں ہوتا۔ مسافر اگر اپنا روزہ قائم رکھے گا، تو اس کی صحت میں خلل آنے اور آیندہ اس کے بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ استفراغ موادِ فاسدہ کی رعایت کی مثال اس کا وہ مشہور مسئلہ ہے جس کی بنا پر حج میں احرام باندھنے والے کے لئے یوں تو بالعموم سر منڈانا ناجائز ہے لیکن اگر سر میں کسی قسم کی شکایت یا مرض ہو جس کی بنا پر ردی بخارات کا خارج ہونا ضروری ہو تو اس وقت سر منڈانا جائز ہے۔ اسی طرح اصول پرہیز کی رعایت کرتے ہوئے اسلام نے مریض کو اس وقت، جبکہ پانی کے استعمال سے ضرر کا اندیشہ ہو، اس امر کی اجازت دی کہ وہ بجائے وضو کے تیمم کر سکتا ہے۔

طبیب سے مشورہ کرنے کی بھی داعی اسلام نے بہت تاکید کی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت ایک مریض کی

Marfat.com

عیادت کے واسطے تشریف لے گئے اور فرمایا "کسی طبیب کو بلاؤ" ایک شخص نے تعجب سے پوچھا کیا آپ کی بھی یہی رائے ہے، آپ نے فرمایا یقیناً کیونکہ خدا نے جس مرض کو پیدا کیا اس کے لئے کوئی نہ کوئی دوا بھی پیدا کی ہے"۔ (زاد المعاد جلد ۲ ص ۹۹)

اسی باب میں داعی اسلام نے اس پر بھی زیادہ زور دیا ہے کہ جس طبیب سے بیماری کے متعلق مشورہ لیا جائے وہ حتی الامکان اپنے فن میں ماہر ہو۔ چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت کے زمانہ میں ایک شخص زخمی ہو گیا اور اس کے زخم سے بہت زیادہ خون نکلنے لگا۔ اس شخص نے اپنے علاج کے لئے دو آدمی بلا بھیجے۔ آنحضرت نے ان سے پوچھا تم دونوں میں زیادہ ہوشیار طبیب کون ہے؟ (جو زیادہ ہوشیار ہو وہی مرہم پٹی کرے) ۔۔ ۔۔ ۔۔" (موطا امام مالک) ایک دوسری حدیث میں آنحضرت کا یہ قول مروی ہے "جو شخص طبیب کی حیثیت نہ رکھتا ہو اور علاج کرے تو اُسے اپنی فاش غلطی کا تاوان دینا پڑیگا" (ابو داؤد و ابن ماجہ) یہ حدیث صاف صاف اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ داعی اسلام نے صرف تعلیم یافتہ طبیبوں کو علاج کرنے کی اجازت دی ہے اور یہ کہ حتی الامکان اس طبیب سے علاج کرانا چاہئے۔ جو طب میں کافی تجربہ رکھتا ہو۔

اسلام نے اپنے پیروؤں کو مسلم و غیر مسلم دونوں قسم کے اطبا سے مشورہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ خود پیغمبر اسلام علیہ السلام نے کئی مرتبہ اپنے اور بعض صحابہ کے علاج کے واسطے حارث بن کلدہ کو بلا بھیجا۔ حالانکہ یہ طبیب ابھی تک مشرف با سلام نہ ہوا۔ متعدد حدیثوں میں اس کے علاج کا تذکرہ موجود ہے۔ یقیناً آنحضرت کا یہی عمل تھا۔ جس نے زمانہ ما بعد میں خلفائے بنی امیہ کو اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنے دربار میں عیسائی اور یہودی اطبا کو جگہ دیں۔ اور پھر بنو عباس نے ہندوستان کے طبیبوں کو دار الخلافہ میں بلا بھیجا۔

طب نبوی اور اس کی حقیقت حدیث کی کتابوں میں محدثین نے "طب النبی صلعم" کا ایک عنوان بھی قائم کر کے آنحضرت کے بہت سے طبی ارشادات نقل کئے ہیں۔ ان ارشادات میں متعدد دواؤں کے ساتھ ساتھ متعدد جراحی کا بھی ذکر موجود ہے۔ دوائیں زیادہ تر از قسم مفردات ہیں بعض بعض جگہ دو دو چیزوں کے مرکبات کے استعمال کی ہدایت کی گئی ہے۔ محدثین کا خیال ہے کہ اس قسم کی تمام حدیثوں میں جن طبی امور کا اظہار کیا گیا ہے، وہ نہایت محقق الہامات خداوندی ہیں جو آنحضرت کی جانب القاء کئے گئے وہ یقیناً صحیح اور قطعی ہیں اور ان پر ایمان لانا ضروری ہے، ابن قیم جوزی فرماتے ہیں :۔

> "آنحضرت کا طب اطبا کے طب کے مثل نہیں ہے کیونکہ آنحضرت کا طب تو یقینی، قطعی اور خداوندی ہے اور اس کا صدور وحی، نور نبوت اور کمال عقل سے ہوا ہے، بخلاف اس کے اطبا کا طب زیادہ تر تجربات اور ظنی اشیاء پر مشتمل ہے۔ اگر بہت سے مریضوں کو طب نبوی سے فائدہ نہیں ہوتا تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ فائدہ اسی کو ہو سکتا ہے جو اسے کامل اعتقاد اور ایمان کے ساتھ استعمال کرے۔ اسکی مثال بعینہٖ قرآن مجید کی سی ہے جس کے متعلق خدا "فیہ شفاء لما فی الصدور" کی صفت استعمال کرتا ہے حالانکہ یہی قرآن مجید شافی ہونے کے باوجود منافقین کے مرض کو اور بھی زیادہ کرتا ہے (جسکی وجہ محرومیت اعتقاد کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں)
>
> (زاد المعاد: جلد ۲ ص ۶۹)

نووی نے شرح مسلم میں اس قسم کی حدیثوں پر اعتراض کرنے والے اور ان میں شبہ کرنے والے کو "المعترض الملحد" کے لفظ سے یاد کیا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ان حدیثوں پر اعتقاد رکھنا مسلمان کے واسطے لابدی ہے۔

Marfat.com

ہمارے خیال میں محدثین کو اس موقعہ پر بہت کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیثیں جاہلیت کے بادیہ نشیں عربوں کے طبی خیالات کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ دوائیوں اور جراحی کے شعبہ کا بیشتر حصہ پرانے بدوی عربوں کے خیالات سے ماخوذ ہے گو اس امر کا امکان ہے کہ ان مفرد دوائیوں سے بعض کو آنحضرت نے خود تجربہ کرکے تجویز کیا ہو۔ زمانہ قدیم سے عرب کے بوڑھوں اور بوڑھیوں میں جو طب منقول ہوتا چلا آرہا تھا اُسی کو آپ نے بطور استحباب یا اجازت بیان کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان طبی حدیثوں میں بہت سی ناقابل فہم باتیں بھی ہیں جو ان کے الہام و وحی ہونے کے بالکل منافی ہیں، مثلاً:۔

بدہضمی اور پیچش کا علاج شہد تجویز کیا گیا ہے (صحیحین) حالانکہ صحیح تحقیق کے مطابق شہد خود مسہل شئے ہے پھر مرض اسہال کے لئے کیونکر مفید ہو سکتا ہے؟ اگر اس مریض کو جس کا اس حدیث میں ذکر ہے شہد سے فائدہ ہو گیا تو اس کے یقیناً دوسرے اسباب رہے ہونگے نہ کہ یہ مسہل شئے "شہد"۔ عہد جاہلیت میں شہد بطور مسہل کے استعمال ہونے کے علاوہ کبھی کبھی غلطی سے پیچش اور بدہضمی کے لئے بھی استعمال ہوتی رہی ہوگی لیکن طبی اصول سے اس کی غلطی ثابت ہو گئی ہے اور اس میں شہد کی گنجائش نہیں۔

بخار کا علاج ٹھنڈے پانی کا غسل بتایا گیا ہے (صحیحین) حالانکہ غسل اور بخار کے درمیان کوئی مناسبت نہیں[ف]۔

اسی طرح زہر کا حفظ ماتقدم یہ تجویز کیا گیا ہے کہ صبح کو سات خرمے کھا لئے جائیں (صحیحین) بعض دوسری روایتوں میں زہر کی دوا عجوہ خرما بتائی گئی ہے (نسائی و ابن ماجہ) حالانکہ زہر اور خرمے میں طبی حیثیت سے کوئی مناسبت نہیں۔ چونکہ محدثین نے ان روایتوں کو بالکل وحی اور الہام تصور کر لیا تھا، اس بنا پر انہیں ان کے مفہوم کے صدق کے لئے بہت سی بعید از تاویلیں کرنی پڑیں، کبھی تو انہوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ دوا آنحضرتؐ نے محض عرب یا بالخصوص اہل حجاز کے لئے تجویز کی تھی، کبھی یہ کہ یہ دوا آنحضرتؐ نے فلاں مرض کی محض مخصوص قسم کے لئے تجویز کی تھی۔ کبھی یہ کہ یونانیوں نے جو طبی اصول قائم کئے وہ محض اپنے ملک کے مزاج اور آب و ہوا کے لحاظ سے نہ کہ عرب یا دوسرے ملکوں کے حالات کے لحاظ سے۔ اور کبھی جب بالکل تاویل کی گنجائش نہ دیکھی تو انھوں نے یہ کہہ دیا کہ آنحضرت نے اس بات کو کسی ایسے نکتہ کی بنا پر فرمایا ہے جہاں تک اطبا یونان کی نظر ہرگز نہیں پہونچی۔ وغیرہ وغیرہ

ہمارے نزدیک اس قسم کی تاویلوں کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ آپ نے محض ماحول کے طبی خیالات بطور استحباب یا اجازت بیان کر دئے ہیں اور اس بنا پر وہ محض ظنی امور ہیں اور غیر صحیح ہونے کا احتمال رکھتے ہیں، آنحضرتؐ کی ذات والا پر کسی قسم کا حرف نہیں آسکتا، کیونکہ آپ نے خود ہی فرما دیا ہے کہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" یعنی تم لوگ دنیاوی معاملات کو زیادہ جاننے والے ہو۔ اس اعلان سے اس قسم کے شبہات دور ہو جاتے ہیں۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:۔

ف: مقالہ نگار نے آگے چل کر اس سلسلہ میں ابن خلدون کی رائے پیش کرکے جو کچھ لکھا ہے وہی اس سلسلہ میں حقیقت ہے لیکن اس سلسلہ میں یہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ کسی مرض کا علاج اسکے اسباب، امدادی کیفیتوں، ان کی تدریجی احتیاطوں کے لحاظ سے کیا جاتا ہے جس کی صحیح تشخیص اطبا ہی کر سکتے ہیں۔ ابھی گزشتہ سال کی بات ہے۔ میرا منجھلا بچہ ارشد علی سخت علیل تھا۔ ۱۰۵ تک درجہ حرارت پہنچ چکا تھا۔ ڈاکٹر محمد عنایت اللہ صاحب (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس لندن۔ ایل۔ آر۔ سی۔ پی انگلینڈ) اس کے معالج تھے۔ انھوں نے نہایت سکون خاطر کے ساتھ مریض کے کمرے کی کھڑکیاں بند کرائیں۔ اس کے جسم کے سارے کپڑے اتار دئے۔ اور ٹھنڈا پانی منگایا پھر ہم لوگوں نے حیرت سے دیکھا کہ انھوں نے خاص طبی طریق پر اس بچہ کو نہ صرف یہ کہ ٹھنڈے پانی سے غسل دیا، بلکہ غسل کے بعد ایک ریشمی چادر پانی میں بھگو کر اس سے اس کے سارے جسم کو گویا پیک کر کے لپیٹ دیا۔ بخار ایک سو پانچ ساڑھے پانچ پر تھا، پھر چادر اسی طرح بتدریج صرف آدھے گھنٹہ میں ۱۰۱ درجہ تک اتر آیا۔ اور اس وقت وہ چادر اس کے جسم سے اوتاری گئی۔ اور دوسرے کپڑے پہنائے گئے۔

جناب ڈاکٹر صاحب موصوف جس وقت یہ عمل طبی کر رہے تھے، اسوقت وہ حدیث نبوی مجھے بار بار یاد آرہی تھی۔ اور اس کی صداقت کی حلاوت سے ایمان میں تازگی آرہی تھی۔ اسلئے مقالہ نگار کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ "غسل اور بخار میں کوئی مناسبت ہی نہیں"۔ ٹھنڈے پانی کے غسل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شفایاب ہونا اگر قبول کیجئے تو محض معجزہ ہوتا یا یہ طریقہ علاج بتانا عرب کے جاہلی دور کے طب پر مبنی ہوتا تو اس چودہویں صدی کی ترقی کے دور میں انگلستان کا ایک ماہر تعلیم یافتہ ڈاکٹر اب اس طریقہ علاج کو کیوں اختیار کرتا؟ اور اس سے نصف گھنٹہ کے اندر اندر اس قدر محسوس فائدہ کیوں ظاہر ہوتا۔
"ر"

Marfat.com

وللبادیۃ من اھل العمران طب یبنونہ فی غالب الامر علی تجربۃ قاصرۃ علی بعض الاشخاص متوارثا عن مشایخ الحی وعجائزہ وربما یصح منہ البعض الا انہ لیس علی قانون طبیعی ولا علی موافقۃ للمزاج وکان عند العرب من ھذا الطب کثیر وکان فیھم اطباء معروفون کالحرث بن کلدۃ وغیرہ والطب المنقول فی الشرعیات من ھذا القبیل ولیس من الوحی فی شیئ وانما ھو امر کان عادیا للعرب

(مقدمہ عنوان "علم الطب")

عرب کے بادیہ نشینوں کے پاس ایک قسم کا طب تھا جس کی بنیاد ان لوگوں نے معدودے چند اشخاص پر تجربہ کرکے ڈالی تھی اور وہ قبیلے کے بوڑھے اور بوڑھیوں سے بطور وراثت منقول ہوتا چلا آتا تھا۔ اس کا بعض حصہ کبھی کبھی صحیح ثابت ہو جاتا تھا، لیکن وہ کسی طبعی قانون یا موافقت مزاج پر مبنی نہیں تھا، عربوں کے پاس اس قسم کا طب بہت تھا اور ان میں بہت سے مشہور اطبا بھی مثلاً حارث بن کلدہ وغیرہ گذرے ہیں، اور وہ طب جو شرع میں منقول ہے، اسی قسم کا ہے اور اس کا کوئی جز بھی الہامی نہیں ہے، یہ محض ایک ایسی چیز ہے جو عربوں کے درمیان معتاد و مروج تھی۔

اس کے بعد علامہ موصوف فرماتے ہیں کہ:-

"آنحضرت محض اس لئے مبعوث ہوئے تھے کہ ہم کو شریعت بتلادیں نہ اس لئے کہ طب یا اس قسم کی دوسری معتاد و مروج اشیاء سکھائیں"

بہ کیف اس "طب نبوی" کا بیشتر حصہ عرب میں پہلے سے متعارف تھا اور اس بنا پر ان طبی حدیثوں میں ایسی باتیں مل سکتی ہیں جو جاہل عربوں کے طبی تجربات ہوں، اگر کوئی شخص اہل جاہلیت کے طبی خیالات کے متعلق تحقیق کرنا چاہے تو اُسے بہت سا مواد انہیں حدیثوں میں مل سکتا ہے۔

خلافت راشدہ کا طب

جہاں تک تاریخ کے صفحات ہماری رہبری کرسکتے ہیں، یہی پتہ چلتا ہے کہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں عرب کی طبی دنیا میں کسی نئی بات کا ظہور نہیں ہوا۔ امراض اور ان کے علاج کے متعلق وہی معلومات پائے جاتے ہیں جو زمانۂ جاہلیت میں یا تو بادیہ نشیں عربوں کو معلوم تھے یا جو ایک آدھ سیاح عربوں نے اجنبی اطبا کے حلقۂ درس میں بیٹھ کر حاصل کئے تھے اور اپنے بعض ہموطنوں کے درمیان پھیلا دئے تھے۔ خلافت راشدہ کے عہد میں مسلمانوں کی توجہ طب یا دوسرے علوم و فنون کی طرف مائل ہی نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ آنحضرتؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے سامنے سب سے زیادہ اہم مسئلہ ان کی قومیت اور مذہب کا استحکام تھا اور یہ بدیہی ہے کہ ہر شخص پہلے پہل اپنے وجود کے استحکام و بقا کی فکر کرتا ہے، اس کے بعد ان خارجی امور کی طرف اس کی توجہ مبذول ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی قومیت اور مذہب جیسے جیسے جس قدر مستحکم ہوتی گئی، اسی قدر طب یا دوسرے لوازم تمدن کی ترقی میں انہوں نے حصہ لیا۔ یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے زمانہ کی بہ نسبت طب کا کہیں زیادہ چرچا بنو امیہ کے عہد میں ہوا اور اس سے کہیں زیادہ عہد بنی عباس میں ہوا۔

اگر خلافت راشدہ کے زمانہ میں عربوں نے خود علم طب کی خدمت نہیں کی تو دوسری متمدن قوموں کے طبی مدرسوں اور شفاخانوں سے کچھ تعرض بھی نہیں کیا۔ ایران کا طبی مرکز جندشاپور خلیفہ دوم کے عہد میں فتح ہوا، ممکن ہے کہ فاتح مسلمانوں کے ہاتھوں وہاں کی ذاتی جائداد اور ملکیت کو نقصان پہونچا ہو لیکن علم دوست مسلمانوں نے جندشاپور کی طبی درسگاہیں اور شفاخانے بالکل اسی حالت پر قائم رہنے دے جیسے وہ پہلے تھے، نہ انکے کسی طبیب کو انکی ذات سے صدمہ پہونچا اور نہ اس جنگ کی بنا پر ان کے علمی شغل میں کوئی رکاوٹ پیدا ہوئی۔

Marfat.com

مدرسہ اسکندریہ کے متعلق بعض غیر محتاط مورخین نے کچھ گل فشانی کی تھی۔ لیکن اس کی حقیقت علامہ شبلی نعمانی کے مقالہ "کتب خانہ اسکندریہ" سے واضح ہو چکی ہے۔

عہد بنو امیہ کا طب

خلفائے راشدین کے بعد بنو امیہ کا زمانہ آیا۔ انہوں نے ان تمام عرب اطبا کو، جو محض ناقص جاہلی طب سے بہرہ ور ہو کر مریضوں کا علاج کرتے تھے، مشغلۂ طبابت سے روک دیا اور محض انہیں لوگوں کو اس کی اجازت دی جو فی الواقع اس میں کمال رکھتے تھے۔ چونکہ ایسے لوگ مسلمانوں میں نہیں تھے، اس بنا پر عیسائی اور یہودی اطبا کا رسوخ ان کے دربار میں بہت زیادہ ہوا۔ خود حضرت معاویہ بن ابو سفیانؓ کا شاہی طبیب ایک عیسائی ابن اثال نامی تھا۔ یہ اطبا جو لحاظ قومیت رومی تھے، یونانی طب میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ وہی تمام مسلمان امرا اور اکابر کا علاج کرنے لگے اور ان سے بعض مسلمانوں نے بھی علم طب سیکھا۔ فی الحقیقت مسلمان پہلے پہل بنو امیہ ہی کے زمانے میں یونانی طب کے اصولی مسائل سے آشنا ہوئے۔ یہ سچ ہے کہ عہد عباسی میں علم طب کی جو خدمت اور ترقی ہوئی بنو امیہ کے زمانے میں اس کا ہزارواں حصہ بھی نہیں انجام پایا، بایں ہمہ بنو عباس کی متعدد طبی خدمتوں کی بنیاد بنو امیہ ہی کے زمانے میں پڑ چکی تھی جنہوں نے متعدد رومی الاصل اور سریانی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرایا۔ طبی تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی ان کے وقت میں شروع ہو گیا تھا۔ علاوہ بریں بنی امیہ کی سب سے بڑی مایۂ ناز طبی خدمت یہ تھی کہ مسلمانوں میں پہلے پہل انہیں نے بیمارستان اور شفا خانہ کی بنیاد ڈالی۔ ابتدا میں ولید بن عبدالملک نے جذامیوں اور اندھوں کے ٹھہرانے کے لئے ایک بیمارستان بنوایا اور ان کے لئے وظیفے مقرر کئے۔ اگرچہ اس کی مصلحت اس وقت محض اس قدر تھی کہ جذامی ادھر ادھر نکل کر اپنا متعدی مرض نہ پھیلاویں اور اندھے در بدر مارے مارے نہ پھریں۔ تاہم اسی عمارت کے بعد آہستہ آہستہ بڑے بڑے شفا خانے بنے جن میں اطبا مریضوں کے علاج کے واسطے لازم رکھے گئے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس قسم کا مکمل شفا خانہ بھی بنو امیہ ہی کے عہد میں تیار ہو گیا تھا۔

عہد اموی کے غیر مسلم اطبا میں مندرجہ ذیل ہستیوں کو زیادہ شہرت ہوئی۔

(۱) موریانوس یہ ایک رومی راہب تھا اور طب و کیمیا میں کافی دستگاہ رکھتا تھا۔ اس کے شاگردوں میں خالد بن یزید کا نام زیادہ قابل الذکر ہے۔

(۲) اصطفانوس رومی، اس عیسائی طبیب نے خالد مذکور کے ایما سے متعدد طبی کتابوں کا لاطینی سے عربی میں ترجمہ کیا۔

(۳) ماسرجویہ بصری، اس یہودی طبیب کی مادری زبان سریانی تھی، خلافت مروان میں اسے پادری اہرون اسکندری کی مشہور طبی تصنیف کو سریانی سے عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم ملا اس نے تعمیل کی۔ ایوب بن حکم کہتے ہیں کہ میں ایک بار اس طبیب کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ اتفاق سے ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میرے معدہ میں روزانہ جانوروں کی سی اشتہا پیدا ہو جاتی ہے اور اس وقت میری آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب میں کچھ کھا پی لیتا ہوں تو یہ شکایت دور ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر سہ پہر سے مجھے وہی شکایت لاحق ہوتی ہے اور شام کو کھانے کے بعد پھر دور ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسی دوا دیجئے کہ یہ بیماری ایک ہی بار کے علاج میں ہمیشہ کے لئے دفع ہو جائے اور بار بار کھانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ ماسرجویہ نے کہا۔ برا ہو تیری اس نابکار بیماری کا جس کو اتنی تمیز نہ ہوئی کہ میں کس نااہل کے پاس جا رہی ہوں، کاش وہ تیرے بجائے میرے اور میرے بچوں کے پاس آئی ہوتی۔ ارے نادان، یہ انتہائی تندرستی ہے جس کے مستحق تجھ جیسے نااہل نہیں ہیں، خدا سے دعا کرو کہ وہ زیادہ حقدار بندوں کو نصیب ہو۔

(۴) تھیوڈا، تیودوکس اور تیودون، خلافت مروان کے زمانے میں یہ دونوں رومی طبیب حجاج بن یوسف ثقفی کی خدمت میں رہتے تھے۔ ان میں سے اول الذکر نے متعدد تلامذہ کو طبی معلومات سے بہرہ ور کیا اور متعدد طبی کتابیں بھی تصنیف کیں۔ اس کے تلامذہ میں فرات بن شحنا تھا جس نے عباسی خلیفہ منصور کا زمانہ پایا، زیادہ مشہور ہے۔

Marfat.com

خلافت بنی امیہ کے مسلمان اطبا میں زیادہ قابل ذکر ممعق تین شخص ہیں۔

(۱) خالد بن یزید (متوفی سنہ ۸۵ھ) یہ اپنے زمانہ میں قریش کیا بلکہ عرب کے تمام قبائل میں علم و فن میں اپنا نظیر نہیں رکھتا اس نے کیمیا اور طب موریانوس سے سیکھا اور ان دونوں علموں میں متعدد رسائل لکھے جو اس کی قابلیت کی شہادت میں ایک طبی رسالہ میں اس نے اپنے استاد موریانوس کی صحبت اور اس کے سکھائے ہوئے طبی مسائل و حقائق کو بالتفصیل بیان کیا ہے، موریانوس کے فیض صحبت کے متعلق اس نے بہت سے اشعار بھی کہے ہیں۔

(۲) احمد بن ابراہیم یہ ۱۰۱ھ میں خلیفہ یزید بن عبدالملک کا شاہی طبیب تھا۔ اس نے بقراط کی مختلف تصانیف سے کچھ مسائل انتخاب کئے اور انہیں ایک کتاب کی صورت میں جمع کر دیا جس کا نام اس نے "اصول الطب" رکھا۔ ایک دوسری کتاب بھی لکھی جس میں ان تمام جڑی بوٹیوں پر مفصل بحث کی جو علاج کے واسطے کام آتی ہیں۔

(۳) ابوبکر محمد بن سیرین بصری، ان کا شمار اکابر علمائے اسلام میں ہے۔ ان کے باپ سیرین جو جرایا میں تانبے کا کام کرنے کے لئے کسی ضرورت سے عین التمر آئے تو انہیں خالد بن ولید نے مع دوسرے چالیس آدمیوں کے گرفتار کیا، انس ابن مالک نے انہیں بطور غلام مول لے لیا۔ انھوں نے بیس درہم بطور فدیہ دیا اور آزاد ہو گئے۔ پھر انھوں نے ایک لونڈی سے دیبا سے نکاح کیا جس سے یہی محمد سنہ ۳۳ھ میں پیدا ہوئے، نوفل آفندی نے انکو اطبا کی فہرست میں شامل کیا ہے، (صناجۃ العرب ص ۲۲۰) لیکن انکو شہرت محض حدیث اور خوابوں کی تعبیر میں حاصل ہوئی۔ اس فن میں انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی جو زمانہ مابعد میں بہت زیادہ مقبول ہوئی، انکی وفات سنہ ۱۱۰ھ میں ہوئی۔

ندیم جولائی سنہ ۱۹۳۶ء

(۲)

خلفاء عباسیہ کا زمانہ اور اسلامی طب کی ترقی

عباسیوں کا تخت خلافت پر متمکن ہونا تھا کہ عربی طب میں ترقی کی ایک نئی روح پیدا ہو گئی۔ جس نے اسے اوج کمال پر پہونچا دیا۔ پیشتر ہم خلافت راشدہ کے حال میں بیان کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کی قومیت اور مذہب میں جیسے جیسے زیادہ استحکام آتا گیا اسی قدر تحصیل علوم کی جانب ان کا میلان بڑھتا گیا۔ اور رفتہ رفتہ اسی عہد حکومت میں تکمیل کو پہنچ گیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے مطمئن ہو کر متعدد علوم کا مطالعہ شروع کیا اور انھیں ترقی کے بہت اونچے زینہ پر پہنچا دیا۔ منجملہ ان علوم کے طب تھا۔

بنو امیہ کے زمانہ میں جو کچھ طبی خدمتیں تصنیف و تالیف کی صورت میں انجام پائی تھیں وہ اگرچہ ابھی تک بالکل محفوظ تھیں لیکن علم دوست عرب اتنے پر قناعت نہ کر سکے، ان کے کان یونانی طب کی وسعت اور دقیقہ سنجی سے آشنا ہو چکے تھے۔ بیرونی اور اندرونی لڑائی جھگڑوں سے جب انھیں فرصت ملی تو انھیں پہلی فکر یہ لاحق ہوئی کہ یونانیوں کی طبی کتابیں حاصل کر کے عربی میں ترجمہ کی جائیں۔ یونانی کتابوں کا ترجمہ پہلے ہارون الرشید کے زمانے اور پھر مامون رشید اور معتصم باللہ کے عہد میں رفتہ رفتہ انجام پاتا گیا۔

ہارون الرشید نے جب انگورہ فتح کیا، تو مسلمان سپاہیوں کو وہاں کے شاہی خزانوں میں بہت سی یونانی فلسفہ اور طب کی کتابیں ملیں جنہیں وہ اپنے ساتھ بغداد لائے خلیفہ نے اپنے عیسائی طبیب یوحنا بن ماسویہ کو انہیں عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا۔ اس عیسائی طبیب کو طب اور فلسفہ میں کمال حاصل ہونے کے علاوہ یونانی زبان میں

Marfat.com

پوری مہارت تھی۔ علاوہ ترجموں کے اس نے خود بھی بہت سی کتابیں لکھیں جنہیں سے کتاب الحمیات، کتاب الفصد والحجامۃ کتاب الجذام، کتاب الحمام، کتاب اصلاح الاغذیہ، کتاب المعدہ، کتاب الادویہ المسہلہ، دغل العین، اور قرابادین معروف بالشجر خاص طبی عنوانات پر مشتمل ہیں۔ یوحنا کے بعد دوسرے مترجمین بھی اپنے اپنے زمانہ میں طبی کتابوں کا ترجمہ کیا انہیں یا ذہشہور ذیل کی طبیبا

(۱) حنین بن اسحاق مسیحی، یہ یوحنا بن ماسویہ کا شاگرد اور مامون رشید کا طبیب خاص تھا۔ مامون رشید نے متعدد سیاحوں کے ہاتھوں گوشہ گوشہ سے یونانی کتابیں زر کثیر صرف کر کے منگوائیں جنمیں سے بقراط اور جالینوس کی بعض تصنیفوں کے ترجمے اور تلخیص حنین کے ہاتھوں انجام پائے، اس کا ترجمہ دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ سلیس اور واضح ہوتا تھا۔ وہ ہر بات میں طبی اصول کا بہت زیادہ پابند تھا، مشہور ہے کہ وہ ہر روز غسل کرتا تھا جس کے بعد اپنا بدن کپڑے سے پونچھ کر عود اور عنبر کی دھونی لیتا تھا۔ اس کی خوراک مرغ اور میوے تھی اور وہ ہر روز چار رطل پرانی شراب پیتا تھا۔ ۲۶۴ھ میں ۷۴ برس کی عمر میں وفات پائی۔ اسکی طبی تصنیفوں میں کتاب الاغذیہ، کتاب تدبیر الناقہین، اور العشر مقالات فی العین زیادہ مشہور ہیں۔ اسکے بیٹے اسحاق بن حنین (متوفی ۲۹۸ھ) نے بھی متعدد طبی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ فصاحت و بلاغت اور قابلیت کے لحاظ سے وہ اپنے باپ کا نظیر تھا۔

(۲) ثابت بن قرۃ (متوفی ۲۸۸ھ) یہ طبیب حران کے ایک صابی المذہب خاندان سے تھا۔ علاوہ طب کے وہ فلسفہ اور نجوم کا امام تھا۔ اس نے ایک رسالہ صابئیت کی تائید میں لکھا جس کی بنا پر خلیفہ مامون نے اسکی جلا وطنی کا حکم صادر کیا لیکن اتفاق سے اسے محمد بن موسیٰ ملے جو ملک روم میں ایک عرصہ تک سفر کرنے کے بعد بہت سی طبی کتابیں لیکر واپس آرہے تھے۔ وہ اسکو خلیفہ کے پاس لائے جس نے ان کتابوں کا ترجمہ کرنے کیواسطے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ اور اس نے خدمات انجام دیں۔

ثابت بن قرۃ کے بیٹوں ابراہیم اور سنان نے بھی متعدد طبی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔ مترجمین کے متعلق کہیں صراحتۃً یہ تفصیل مذکور نہیں کہ ان میں سے کس نے کس کتاب کا ترجمہ کیا۔ تاہم بعض مورخین کے اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ نویں صدی عیسوی میں مندرجہ ذیل کتابیں عربی میں آچکی تھیں۔

(۱) بقراط کے رسائل جنہیں سے کتاب الفصول، مقدمۃ المعرفہ کتاب اقیدیمیا، کتاب ماء الشعیر، کتاب الجنین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

(۲) جالینوس رومی کی تصانیف مشہور ہے کہ وہ سو سے زیادہ تھیں۔

(۳) ڈیوس کوریڈیس کی مشہور تصنیف جس میں اس نے اپنے زمانہ کی تمام ادویہ مفردہ کے افعال و خواص پر مفصل بحث کی ہے۔

(۴) ارسطو کی کتاب الصحۃ والسقم، کتاب الشباب والہرم

(۵) بعض ہندو مصنفین کی تصنیفیں جن کی ذات سے اسلام کے قبل ہی عربوں کو طبی فیض پہنچا لیکن انکی کتابیں خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ترجمہ ہوئیں۔ ان میں سے بعض کتابیں بواسطہ فارسی عربی میں منقول ہوئیں

درحقیقت انہیں ترجموں سے یونانی طب کو زندگی ملی ورنہ وہ تو کبھی کا مردہ ہو چکا تھا محاربات صلیبیہ کے زمانے میں جب فرنگی مجاہدین انہیں پہلے پہل فرانس اور اٹلی میں لائے تو عرصہ دراز تک یورپ والوں کو اصلی کتابوں کا پتہ ہی نہیں چلا، اور عربی ہی سے لاطینی اور فرنچ میں ان کا ترجمہ ہوا۔ قرون وسطی میں، قدیم یونانی زبان

Marfat.com

سے یورپ والے اس قدر ناآشنا ہو گئے تھے کہ اگر اصلی کتابیں ملتیں بھی تو ان کے لئے بیکار تھیں۔ اور اگر عربوں نے ان کا ترجمہ نہ کیا ہوتا تو یقیناً ان کے نام و نشان اور ان کے مصنفین کے خیالات سے دنیا محروم ہی رہتی دسویں صدی کے آغاز میں اندلس کے عربوں میں بھی ان ترجموں کی اشاعت ہوئی اور انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ یونانی اطبا کے خیالات سے آشنا ہونے کے بعد عربوں نے خود بھی طب کے متعدد شعبوں میں غور و خوض کیا۔ اور بہت سے امور کا اضافہ کیا۔ دسویں اور چودھویں صدی کے درمیان کا زمانہ اسلامی طب کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے، اور اسی عروج کی حالت میں اس کے اندر جو امتیازی صفات موجود تھیں۔ ان میں چند کو مثال کے طور پر ناظرین کے سامنے پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

اسلامی طب کی تحقیق امراض

عربوں نے اسلامی دور میں متعدد بیماریوں کی جن سے اہل یونان بالکل ناواقف تھے! اور جنھیں دنیا کی متعدد قومیں ایک قسم کا لاعلاج عذاب الٰہی تصور کرتی تھیں تحقیق کی، مثلاً چیچک اور خسرہ (حصبہ) کے متعلق جالینوس اور بقراط کی تصنیفات بالکل خاموش تھیں۔ پہلے پہل ابوبکر رازی نے ان دونوں بیماریوں کی بابت اپنے ایک رسالہ میں جسکا ترجمہ گذشتہ صدی کے دوران میں انگریزی میں ہو چکا ہے۔ بحث کی اور ان کا فرق بتلایا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ چیچک کا ٹیکہ بھی معلوم کیا۔ جو رفتہ رفتہ اس قدر رواج پذیر ہو گیا۔ کہ عرب عورتیں گھر گھر خود اپنے بچوں کو بازو میں زخم لگا کر ٹیکہ دیتی تھیں۔ مغربی مورخین ڈاکٹر جینر کو ٹیکہ کا موجد قرار دیتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے بہت زمانہ پہلے مسلمان اسے جان چکے تھے۔

ابن رشد نے "الکلیات فی الطب" میں یہ خیال تحریر کیا کہ چیچک کا حملہ کسی شخص پر دوبارہ نہیں ہوتا۔" مثانہ کی چیچک کی بابت ابوالقاسم زہراوی نے "التصریف لمن عجز عن تالیف" میں مبسوط بحث کی۔

خارش کے اصلی سبب کا اکتشاف احمد طبری نے کیا جس نے "المعالجۃ البقراطیہ" میں لکھا کہ اس مرض کے حقیقی بانی خیند جراثیم ہوتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی میں اس قسم کی تحقیق یقیناً حیرت انگیز ہے کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دنیا جراثیم کے نام سے بھی آشنا نہیں تھی۔ زمانہ مابعد میں ابن زہر اشبیلی نے بھی اس پر کافی روشنی ڈالی۔

۱۳۴۸ء میں ایک قسم کے طاعون کا ظہور ہوا جس نے یورپ میں ڈھائی کروڑ اور ایشیا اور افریقہ میں اس سے بھی زیادہ نفوس کو موت کی گھاٹ اتار دیا۔ یورپ میں اس کا نام سیاہ موت پڑا۔ کیونکہ اس میں بیمار کا جسم سیاہ ہو جاتا تھا۔ تمام مغربیوں نے اسے آسمانی بلا سمجھا لیکن اسپین کے ایک عالم لسان الدین ابن خطیب (۱۳۱۳ء - ۱۳۷۴ء) نے ایک طبی رسالہ لکھا جس میں ثابت کیا کہ طاعون کا اصلی سبب ایک قسم کے جراثیم ہے۔ بواسیر کا سبب ابن میمون نے قبض معدہ اور اس کا بہترین علاج سبزی اور ترکاری قرار دیا۔ جیسا کہ اس کی کتاب "الوصول فی الطب" سے معلوم ہوتا ہے۔

ہیضہ اور دماغ کی بیماریوں کے متعلق سب سے پہلے اسلامی ہی اطبا نے مفصل گفتگو کی۔

اسلامی طب کی مفردات اور فن دواسازی

اسلامی اطبا نے مفردات کی فہرست میں بیشمار نئی دواؤں کا اضافہ کیا۔ یہ دوائیں یا تو اس قسم کی تھیں جو یونان اور اٹلی میں پیدا نہیں ہوتی تھیں! ور اسی بنا پر یونانی اور رومی اطبا ان سے بے خبر تھے اور یا ایسی تھیں کہ بکثرت موجود ہونے پر بھی قدما کا گمان نہیں تھا کہ یہ امراض کے علاج میں بھی کام آسکتی ہیں۔ مثلاً سنا رکی۔ خیار سنبر، تمر ہندی

Marfat.com

ریوند چینی، جائفل، لونگ، کافور، کہربا، ایلوا، ابنسلوچین، لوہا، سونا، چاندی وغیرہ۔

نباتی غذاؤں کے اکتشاف اور ان کے افعال و خواص کی تحقیق میں بھی عربوں نے بیشمار امور کا اضافہ کیا۔ اس موضوع پر پہلی کامیاب تصنیف قرطبہ کے ایک مشہور طبیب ابو جعفر غافقی کی ہے جس نے کتاب الادویۃ المفردۃ" میں اسپین، مراکش، بربر، لاطینیہ، اور وسطی افریقہ کی تمام اہم نباتات کے ناموں کا استقصا کیا ہے اور انکے طبی خواص بتائے ہیں۔ غافقی کے بعد اس کے ہم وطن ابن بیطار نے اپنی کتاب الجامع فی الادویہ المفردہ" میں اسکے اکتشاف کردہ نباتات کے علاوہ مصر و شام اور ایشیائے کوچک کی بعض نباتات کا اضافہ کیا۔ اس کتاب کے لکھنے کے پیشتر اس نے یونان کا سفر کیا تھا۔ اور وہاں سے بہت سی نادر جڑی بوٹیوں اور نباتات کا ذخیرہ جمع کر کے اپنے ملک کو واپس آیا تھا۔

قرون وسطی میں مسلمانوں نے کیمیا میں بہت زیادہ مہارت پیدا کی تھی۔ جابر بن حیان جو آٹھویں صدی عیسوی میں تھا۔ اس فن کا امام مانا گیا ہے۔ اسکی کتاب اصول الکیمیا ہسپانیہ ۱۵۷۳ء میں بیسل میں چھپی، چونکہ علم کیمیا کا وہ حصہ جو کیمیائے علی مہ کے نام سے مشہور ہے۔ مختلف قسم کی دوائیں طیار کرنے میں بہت زیادہ مد ہے اس بنا پر اسلامی اطبا نے بہت سے کیمیائی آلات اور مشینیں بنائی تھیں۔ جن سے وہ مختلف قسم کے عرقیات اور شربت، طیار کرتے تھے، اور بسا اوقات بعض نباتات یا ان کے پھلوں سے اس قسم کا تیل نکالتے تھے جو بطور دوا کام آتا۔ انبیق انھیں کا ایجاد ہے جس کے ذریعہ سے دوا کشید کرنے کو تقطیر کہتے تھے کبھی کبھی وہ دواؤں کے بعض اجزائے لطیف کو آگ کی مدد سے دیگ وغیرہ کے سرپوش میں جلاتے تھے۔ اس عمل کا نام تصعید تھا، کافور اور نوشادر وغیرہ اسی طرح تیار ہوتے تھے۔

وہ مختلف قسم کے خمیرے بھی بناتے تھے جن کے متعلق مشہور ہے کہ انھوں نے تاتاریوں سے سیکھا تھا۔ انہیں نے پہلے پہل دواؤں میں شکر یا مصری کا استعمال تجویز کیا قدما یا تو بالکل روکھی پھیکی دوائیں تجویز کرتے تھے یا اگر کوئی میٹھی چیز ملانے کی اجازت دیتے تھے تو محض شہد کی۔

انھیں نے پہلے پہل باقاعدہ نسخہ نویسی کی۔ ایسے نسخے جن میں تمام دواؤں کے اوزان، ان کے پکانے اور طیار کرنے کے طریقے اور ترکیب استعمال قلمبند ہوں، قدما نہیں لکھتے تھے وہ محض اسلامی دور میں لکھے گئے۔ اسلامی دور میں عباسی اور اندلسی حکام کی ہدایتوں کے بموجب عطار خانوں کی مفردات اور مرکبات کی بہت زیادہ جانچ ہوتی تھی۔ تاکہ کہیں دھوکے سے دوا کے خراب ہونے کی بنا پر بیمار کو بجائے فائدے کے نقصان نہو عربوں نے دوا فروشی کی تعلیم کے واسطے متعدد مدارس قائم کئے۔ جہاں دوائیں پرکھنے کا ڈھنگ اور عرقیات، شربت اور مرکب دوائیں تیار کرنے کا طریقہ سکھایا جاتا تھا۔ تفطی (مرتبہ لیبرٹ ص ۱۸۸) کی تصریحات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مامون رشید کے زمانہ میں عطاروں کے لئے دوا فروشی سے قبل اس کا باقاعدہ امتحان دینا اور سند اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔

اسلامی طب کی جراحی

عربوں نے اسلامی دور میں اگرچہ جراحی میں اتنی ترقی نہیں کی جتنا کہ انھوں نے علم الامراض اور علم الادویۃ میں کی تاہم اس علم میں بھی انھوں نے بہت کچھ مہارت پیدا کی، ابوالقاسم کی کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ اندلس میں مردوں کے علاوہ عورتیں بھی جراحی کی ماہر ہوتی ہیں۔ اور بہت سے جراحی عمل اپنے ہم جنس زنانہ بیماروں پر کرتی تھیں،

Marfat.com

آنکھ کی جراحی کے طرف ان کی توجہ ابتدا ہی سے مبذول تھی۔ کیونکہ عرب کے گرم ممالک میں امراض چشم کی کثرت نے متعدد اطبا کو اسکی طرف مائل کیا۔ اور ان میں رقیبانہ حیثیت سے ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی رغبت پیدا کی۔ امراض چشم اور ان کے جراحی علاج کے عنوان پر سب سے پہلے یوحنا بن ماسویہ نے "دغل العین" تصنیف کی جس کا ایک قلمی نسخہ قاہرہ کے کتبخانہ تیموریہ میں۔ اور دوسرا لینن گراڈ میں موجود ہے حنین بن اسحاق نے بھی اسی موضوع پہ "العشر مقالات فی العین" لکھا جس کو ڈاکٹر مایر ہوف نے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا ہے۔

ابو القاسم زہراوی کی کتاب بہت سے جراحی آلات کی تصویروں سے مزین ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب جراحوں نے مختلف قسم کے عملیات کے لئے مختلف اوزار ایجاد کئے تھے بعض عملیات کے واسطے مشینیں بھی ایجاد ہوئی تھیں۔

طب کی اکثر کتابوں میں ہمیں جراحی اور بالخصوص فصد اور حجامت کا ایک وسیع باب نظر آتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے پرانے اطبا ان تمام مسائل اور ان کے متعلقات سے خوب واقف تھے اور تمام عملیات کو اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے تھے۔ ابو القاسم زہراوی کے متعلق ایک متعصب مرکین مصنف بھی اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ وہ دلیری کے ساتھ تمام عملیات خود انجام دیتا تھا۔ اور بہت ذہین آدمی تھا۔ پھر کیا بات ہے کہ فی زمانہ ہمارے مسلمان اطبا کو ان عملیات کے انجام دینے کا بالکل سلیقہ نہیں، وہ ان رگوں کی شناخت بھی نہیں کر سکتے جن میں فصد لیجاتی ہے! اگر کسی طبیب سے آپ صافن، باسلیق، قیفال، اکحل وغیرہ کے متعلق پوچھیں کہ وہ کہاں کہاں واقع ہیں۔ تو وہ ان میں سے ایک کو بھی نہیں بتا سکتا۔ اس کی وجہ محض ایک ہی سمجھ میں آتی ہے کہ تیرھویں صدی کے اطبا میں کچھ اس قسم کا خیال پیدا ہو چلا تھا کہ جراحی عملیات انجام دینا طبیب کی شان کے خلاف ہے ڈاکٹر تھیوڈور ایلین نے ایک مصنف کی عبارت سے مندرجہ ذیل فقرات نقل کئے ہیں۔ لیکن اس کا نام نہیں بتایا (کتاب خاکۂ علم جلد ۸ ص ۳۵۰)

> "فصد لینا۔ داغنا، شرائین میں زخم لگانا۔ یا اس قسم کے دوسرے کام جو ہاتھ سے کئے جائیں، ایک معزز طبیب کے شایان شان نہیں۔ وہ محض طبیب کے نوکروں کے لئے موزوں ہیں۔ طبیب کے ایسے نوکروں کو دوسرے عملیات بھی مثلاً پلکوں میں زخم لگانا، آنکھ کے اوپر سے پردہ ہٹانا۔ اور دصندھ نکالنا انجام دینے چاہئیں۔ ایک معزز طبیب کے لئے محض اتنا کافی ہے کہ وہ بیمار کے لئے دوا تجویز کرے۔ اس کے استعمال کی ترکیب بتلائے۔ اور پرہیزی غذا کے متعلق ہدایت کرے۔"[1]

اسلامی طب کا فن تشریح

عرب اطبا کی تشریحی معلومات اگرچہ بقراط اور ارسطو کی بہ نسبت زیادہ تھیں۔ تاہم اس موقع پر ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑیگا کہ عربوں نے خود فن تشریح میں کوئی حصہ نہ لیا۔ اس ضمن میں ان کو وہی باتیں معلوم تھیں۔ جو رومی اطبا اور اسکندریہ کے طبی پروفیسروں کی وساطت سے یونانی طب میں داخل کر لی گئیں تھیں

---

[1] ٹھیک ہے لیکن یہ تخیل متاخرین میں پیدا ہوا۔ عہد اموی و عباسی اور اس سے قریب کے دور میں اطبا اپنے ہاتھ سے نشتر دیتے تھے۔ اصلی میں ایک تصویر آج بھی موجود ہے جسمیں مسلمان عرب اطبا شاہ ناٹلی پر عمل جراحی کر رہے ہیں متاخرین کے یہی خیالات موجودہ زمانہ میں ہمارے طبیبوں کو ورثہ میں ملے لیکن ادھر خصوصاً ہندوستان میں اسلامی طب کے علمبرداروں کو پھر سے اس کا خیال پیدا ہو گیا ہے چنانچہ ہندوستان میں اسلامی طب کے دونوں مرکزوں۔ یعنی لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ طبی مدارس اور طبیہ کالج میں جراحی کی تعلیم دیجاتی ہے۔ اور علیگڈھ کے طبیہ کالج میں تو اسلامی طب کے ساتھ اصلی نمونہ پہ عمل جراحی کی تعلیمات کا اہتمام ہے۔

Marfat.com

تاہم اس امر کا امکان ہے کہ اسلامی دور کے اطبا نے خود بھی جانوروں کی قطع و برید سے تشریحی مسائل حل کرنے کی کوشش کی ہو ابن ابی اصیبعہ (مرتبہ مولر جلد ۱ ص ۱۷۰) میں لکھا ہے کہ یوحنا ابن ماسویہ نے بندروں کے اعضائے جسمانی کی تشریح کی توجہ کی تھی، اور ملک نوبہ سے کسی شخص نے خلیفہ معتصم کے پاس اسی غرض سے ایک بندر ہدیۃً بھیجا تھا۔

بہرحال، اگر عربوں نے خود اس فن میں اقدام نہیں کیا تو اقدام کرنیوالوں کے اکتشافات کو فراموش بھی نہیں کیا۔ ان کے پیشروؤں نے جو کچھ کیا تھا۔ اسے بالکل محفوظ رکھا جیسا کہ ان کے تصنیفات شاہد ہیں۔

ندیم۔ جون ۳۹ء

(۳)

یورپ کے ابتدائی معلمین

بارھویں صدی تک یورپ پر انتہائی جہل و ضلالت کی تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ ان کی طبی معلومات محض چند ناقص تجربوں اور اساطیری اوہام و خرافات کا مجموعہ تھیں شروع شروع میں جب یورپ میں اصولی طب کی تحصیل کا احساس پیدا ہوا تو یہ غرض محض مسلمان اطبا کی تصانیف کا ترجمہ کر کے پوری کی گئی، اس بنا پر ان اطبا کو اگر "یورپ کے ابتدائی معلمین طب" کے لقب سے یاد کیا جائے تو بالکل بجا ہے۔ اہل یورپ بارہویں صدی کو "دور ترجمہ" کہتے ہیں۔ کیونکہ اس صدی میں انھوں نے عربی کی مختلف علمی کتابوں کا ترجمہ لاطینی اور فرنچ میں کیا۔ فی الحال ہمارے پاس کوئی اس قسم کا مکمل تذکرہ موجود نہیں جس سے ان تمام اطبا کا استقصا کیا جائے۔ جنھوں نے یورپ پر طبی احسان کیا تاہم ان میں سے دو تین ہستیوں کے متعلق تمام کتابوں میں اشارے موجود ہیں اور انکی طبی خدمتیں اور خیالات اختصار کے ساتھ قلمبند کرنا مناسب نظر آتا ہے۔

(۱) ابوبکر محمد بن زکریا رازی، یہ شخص موسیقی، ہندسہ، منطق اور طب کا امام وقت تھا پہلے رے پھر بغداد کے شفاخانہ کا رئیس الاطبا مقرر رہا۔ ابن ندیم نے الفہرست میں اسکی تصنیفات کی تعداد ۲۱۲ بتائی ہے۔ جن میں سے بارہ صرف علم کیمیا پر مشتمل ہیں۔ طب میں انکی مشہور ترین کتابیں الحاوی۔ المنصوری، کتاب الاعصاب، کتاب النجاح ہیں۔ ان میں سے الحاوی اور المنصوری کا ترجمہ ۱۲ویں صدی میں لاطینی میں ہوا اور اسی وقت سے یہ دونوں کتابیں یورپ کے کالجوں کے طبی نصاب کے لئے مستند قرار دی گئیں۔ الحاوی جو ابن خلکان کے اندازہ کے مطابق تقریباً تیس جلدوں میں تھی۔ جالینوس کی تمام کتابوں کا لب لباب ہے۔ المنصوری اگرچہ نسبتہً بہت مختصر کتاب تھی۔ تاہم مقبول عام ہوئی اور ہر خاص و عام نے اسے پسند کیا اس کو مصنف نے اس کا نام ابو صالح منصور بن نصر سامانی کے انتساب سے المنصوری رکھا۔ رازی نے چیچک کی تحقیق میں بھی ایک رسالہ لکھا جس کا ذکر پیشتر ہو چکا ہے۔

ابن خلکان کی تحریر کے مطابق رازی کیمیا گری کا قائل تھا۔ اور اسکی تائید میں منصور کیواسطے ایک رسالہ لکھا۔ منصور نے خوش ہو کر اسے ایک ہزار دینار دیا۔ پھر کہا کہ اس کتاب کے نسخوں کو تم عملی صورت میں لا کر صحیح ثابت کر دو اور اس مقصد کی تکمیل کے واسطے جو کچھ آلات اور جڑی بوٹیاں وغیرہ مصنف نے مانگیں، اس بادشاہ نے مہیا کر دیں۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ تمام نسخے غلط ثابت ہوئے اور نہ تو پیتل سونا ہوا اور نہ ٹین یا رانگا چاندی بنا تو منصور بہت غضبناک ہوا اسے کوڑے لگائے۔ اور کتاب مذکور اس کے سر پر زور سے دے ماری جس سے وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ اور ضرب سے رازی کی آنکھ میں موتیا بند کا مرض پیدا ہو گیا۔ چنانچہ وہ کچھ عرصہ بعد اندھا ہو گیا۔ اس کی وفات ۹۲۲ء میں ہوئی۔ اور یہ وہ سال تھا جسمیں خلیفہ مقتدر باللہ کا بھی انتقال ہوا۔

Marfat.com

رازی نے علم طب میں جراحی اور ادویہ کی ترکیب کے سلسلے میں بہت اہم اضافے کئے۔ اس کا علم تشخیص اور علم الاسباب والعلامات بھی بہت زیادہ ممتاز و مشہور ہیں۔ لیکن ان کا وہ حصہ جس میں قارورہ کی علامتوں اور ستاروں کے جسمانی صحت پر اثر ڈالنے سے بحث کی گئی ہے، اس سے مستثنیٰ ہے۔ علم تشریح اور فزیالوجی میں اسکی تمام رائیں بعینہٖ جالینوس کی رائیں ہیں۔ اس کا قول ہے :-

"جب غذا کے ذریعے سے علاج ہو سکے تو دوا کے ذریعے نہیں کرنا چاہئے! اور جب مفرد دوا سے مریض اچھا ہو سکے تو مرکب دوا اسکو نہیں دینی چاہئے۔ اگر طبیب اپنے فن کا ماہر ہو اور مریض اسکی بات مانے تو ممکن نہیں کہ مرض جلدی دور نہ ہو۔ علاج مرض کے شروع میں کرنا چاہئے اور دوا ایسی ہو جس سے قوت کم نہ ہو۔"

(۲) ابو علی حسین بن عبد اللہ جو بالعموم بو علی سینا کے نام سے مشہور ہے بخارا کے قریب ایک گاؤں میں ۳۷۰ھ میں پیدا ہوا تھا۔ بخارا میں اس نے حساب، ہندسہ، جبرو مقابلہ، منطق اور فلسفہ میں کمال حاصل کرنے کے بعد طب کی جانب توجہ کی اور کتب طبیہ کے متواتر مطالعہ اور اپنی ذاتی تحقیقات کی بدولت وہ مرتبہ حاصل کیا کہ دنیا اسے "شیخ الرئیس" کے لقب سے پکارنے لگی۔

یوں تو اسکی تصنیفات کے متعلق بعضوں کا قول ہے کہ سو کے قریب تھیں۔ لیکن ان میں شہرت محض معدودے چند کتابوں کو ہوئی۔ اس کی طبی تصنیف "القانون فی الطب" کو جو عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی۔ شاید ہی کسی طبی کتاب کو حاصل ہوئی ہو جیسے ہی اس کا ترجمہ بارہویں صدی میں لاطینی زبان میں ہوا اپنے حسن ترتیب اور سہل الفہم ہونے کی بنا پر اس قدر پسند کی گئی کہ یورپ کے مختلف کالجوں میں اس وقت سے لیکر سترہویں صدی عیسوی تک ایک مستند اور قابل اعتماد کتاب کی حیثیت سے داخل نصاب رہی۔ علمی اداروں میں جالینوس، رازی، اور مجوسی کی مولفات کے بجائے سب لوگ اسی کو استعمال کرنے لگے۔ عربی نسخہ زیور طباعت سے سب سے پہلی مرتبہ یورپ ہی کے ایک خطہ یعنی روم میں ۱۵۹۳ء میں مزین ہوئی۔ اور اس وقت اس کا شمار قدیم ترین عربی کتب مطبوعہ میں تھا اس کے بعض اجزا کا ترجمہ ابھی حال میں انگریزی میں ہوا ہے۔ القانون میں طب کی دونوں قسمیں یعنی نظری اور عملی کے قوانین کلیہ پر بحث کی گئی ہے پھر ادویہ مفردہ کے کلی اور جزئی احکام پر مبسوط گفتگو کی گئی ہے اس عنوان کے ضمن میں شیخ نے بہت سی عجیب و غریب دواؤں مثلاً کہربا کا فولاد لوہے کی مختلف شکلوں، سونا اور چاندی کا ذکر کیا ہے، وہ سونے اور چاندی کو مصفی خون سمجھتا ہے اس بنا پر اسکی رائے میں سونے اور چاندی سے ملمع کی ہوئی گولیاں زیادہ مفید و موثر ہیں۔

علم الامراض کے ضمن میں اس نے دماغی بیماریوں کا خصوصیت کے ساتھ بہت مفصل تذکرہ کیا ہے اور چہرہ کے اعصابی درد، کزاز، سینے کی تین مختلف قسم کی جلن (INFLAMMATION) ذات الجنب کی مختلف شکلوں، عضلات پر اثر ڈالنے والے وجع مفاصل، خسرہ، اور نیلے داغ والی بیماری (PURP ES) کے متعلق بالکل نئی اور محققانہ بحث کی ہے۔ ایک جرمن مستشرق "لائخ ٹنسٹون" کہتا ہے کہ پہلے اسی کو مرض سل کے متعدی ہونے کا علم ہوا۔ اسی طرح روزمرہ کی عام بیماریوں کے متعلق بھی اس نے عجیب و غریب باتیں دریافت کیں، مثلاً اس نے یرقان کی پندرہ قسمیں بتائیں، اور ان کے درمیان صحیح امتیاز قائم کیا۔ جالینوس کا یہ نظریہ کہ تمام قدرتی بیماریاں اخلاط کی خرابی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کے نزدیک بھی مسلم ہے۔ اس کے نزدیک کسی دوا کا ایک ملک یا شہر میں مفید ہونا اور دوسرے ملک یا شہر میں مضر ہونا ممکن ہے۔

جراحی کے ضمن میں، اس کی رائے ہے کہ آنکھ سے دھندھ نکالنے کا محفوظ طریقہ یہ ہے کہ سوئی سے دبا کر نکالا

Marfat.com

جائے، دوسرے ایسے قسم کے عملیات سے اسے نکالنا خطرناک ہے۔ درد اور تکلیف والے فتق (STRANGULATED
HERNIA) میں جراحی عمل نامناسب ہے مثانہ کا پانی نکالنے کے واسطے اس میں سوراخ کرنے گلے سے اترنے
والے جونک یا زندہ جانوروں کے نکالنے، کان کا میل اور آلائش صاف کرنے اور اس قسم کے دوسرے عملیات کو اس نے
مفصل طریقہ سے بیان کیا ہے اس کا خیال ہے کہ دانتوں کو زنبور سے اکھاڑنے کے بجائے اگر ان کی جڑوں میں ایک قسم کے
مینڈک (TREETOAD) کی چربی لگا دی جائے تاکہ وہ ڈھیلے ہو کر خود گر جائیں تو بہتر ہے علم القوالید (OBSTETRICS)
میں وہ اپنے پیشرو مصنفین کا مقلد ہے

"ایک دوسرا جرمن مستشرق فردنخ کہتا ہے کہ
اس نے لڑائی اور مار پیٹ کے زخم اور چوٹ کے متعلق بہت کم جراحی عمل لکھے اور جو لکھا۔ وہ محض یونانیوں سے
لیا تھا۔ اس نے اپنی ذاتی رائے بالکل نہیں ظاہر کی"
اس کی وفات ۱۰۳۶ء میں ہوئی۔

(۳) ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی۔ گیارہویں صدی عیسوی میں اندلس کی ممتاز طبی ہستیوں میں سے
تھا۔ بہ نسبت طب کے اس کو جراحی میں زیادہ کمال حاصل تھا اور وہ جراح کی حیثیت سے اتنا ہی مشہور تھا جو ابوعلی
سینا طبیب کی حیثیت سے وہ فن تشریح میں بہت زیادہ ماہر تھا۔ اور کہتا تھا کہ اس فن کی واقفیت سے جراحی میں بہت
زیادہ .... مدد ملتی ہے اس نے اپنی ذہانت اور ذکاوت
سے جراحی کے واسطے بیسوں آلات اور مشینیں ایجاد کیں، طب میں بہت سی مفید کتابیں لکھیں۔ جن میں سے ایک محض
زنانہ امراض کے مباحث پر مشتمل تھی فن دوا سازی میں بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا ترجمہ بارہویں صدی میں لاطینی میں
ہوا اور مغربی مدارس میں درسی کتاب کی حیثیت سے داخل ہوئی اصل کتاب پہلے وینس میں ۱۵۱۹ء میں چھپی۔

اس کی مشہور ترین تصنیف "التصریف لمن عجز عن التالیف" ہے جو طب نظری اور طب عملی کی ایک مبسوط
کتاب ہے اس کتاب کے ان اجزاء کو جو علم جراحت پر مشتمل تھے بارہویں صدی میں لاطینی کا جامہ پہنایا۔ اور وہ سلرنو اور
مونپیلیہ وغیرہ کے کالجوں میں داخل نصاب ہو گئے۔

عرب اطباء کے دستور کے موافق اس کی تجویز ہے کہ بیماری کی حالت میں فصد صحیح و سالم پہلو پر لیجائے۔ نیز اس کا خیال
ہے کہ فصد تندرستی آدمی کو بہت سی بیماریوں سے بچاتی ہے علاوہ ان بیماریوں کے جو اس کی مذکورہ بالا طبی کتاب کے
جراحی مباحث میں مذکور ہیں۔ اس نے سرخ مادہ اور بڑھے گوشت کے واسطے بھی جراحی علاج تجویز کیا۔ ٹوٹی ہڈیاں وہ
آلات کے ذریعہ سے درست کرتا تھا۔ زخموں کو داغ کر اچھا کرنے کے مسائل پر اس نے مفید ترین اصولی اشارات تحریر کئے ہیں

ندیم اگست ۲۰۰۳ء

Marfat.com

اسلام چین میں

جدید دنیائے اسلام سے ہندوستان کا علمی طبقہ اچھی طرح واقف ہے کہ یہ کتاب ترجمہ ہے ۔ The new world of Islam. کا جس کا مولف لوتھروپ اسٹاڈرڈ ایک امریکی اہل قلم ہے آج سے تقریباً دس، بارہ برس پہلے سے یہ کتاب ہندوستان میں اصل اور مترجم شائع ہو چکی ہے، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ یہ کتاب مشرق کی بیداری کو جسکی لہر تقریباً سوڈیڑھ سو برس سے دنیائے اسلام میں دھیرے دھیرے پھیل رہی ہے، واضح کرنے میں ایک قابل قدر کتاب ہے ۔ لیکن پھر بھی ضرورت تھی کہ ایک ایسے مشرقی اہل قلم کے قلم کو حرکت میں آنی جو اسلام کی گذشتہ تاریخ سے واقف رکھنے کے ساتھ اسلام کی تگ و دو سے بھی واقفیت ہو۔ اس بیداری کا علم رکھتا ہو جسکی چنگاری تقریباً سوڈیڑھ سو برس سے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں میں وقتاً فوقتاً کبھی سلگتی ہے اور کبھی خاکستر میں دبجاتی ہے ۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کا احساس عالم اسلام کے ایک بہت بڑے مجاہد بالسیف والقلم کو ہوا، یہ مجاہد بالسیف والقلم

کوئی عالم اسلام کا گمنام یا گمنام شخص نہیں بلکہ یہ وہ ہیں جنکو عالم اسلام کے حالات سے واقفیت رکھنے والے اچھی طرح جانتے ہیں یہ مجاہد اعظم اسلام کے قابل فخر اور مشرق کے گوہر تابندہ امیر شکیب ارسلان ہیں۔ جنھوں نے اپنی عمر جہاد فی سبیل اللہ کے لئے وقف کردی ہے، یہ کبھی تیغ و تفنگ کے مقابلہ میں تلوار و سنان سے مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں اور کبھی غیروں کے علمی حملے کے مقابلہ میں قلم و زبان سے، جنگ طرابلس میں بنفس نفیس شریک جہاد تھے ۔ پھر اور بھی دوسرے مواقع جنگ میں شریک جنگ رہ چکے ہیں۔ آج تقریباً پچاس سال سے مسلسل اسلام کی خدمت کی خاطر ہزاروں نہیں بلکہ بلا مبالغہ لاکھوں مضامین اور متعدد مستقل تصنیفیں آپ کی زبان قلم سے نکل چکی ہیں ۔ چنانچہ امیر شکیب ارسلان نے اس مذکورہ بالا کتاب پر ایک بسیط حاشیہ عربی میں لکھا ہے، جو اصل کتاب سے بہت زیادہ قیمتی ہے کیونکہ بہت سے واقعات اور حادثات جنکا ذکر اصل کتاب میں اجمالی ہے آپ نے تفصیل اور انتہائی وضاحت کیساتھ بیان کیا ہے ۔ نیز اس حاشیہ کی قدر و قیمت اس سے

Marfat.com

اور بڑھ جاتی ہے کہ وہ بہت سے واقعات جن کا ذکر امیر شکیب ارسلان نے اپنے حاشیہ میں کیا ہے یا تو وہ واقعات آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوئے یا خود ان لوگوں سے روایت کی ہے جو ان واقعات میں شریک رہے ہیں۔ کاش! اس قیمتی حاشیہ کا ترجمہ اردو میں بھی ہو جاتا کہ اردو داں طبقہ بھی اس سے بہرہ اندوز ہو سکتا۔ آج اسی حاشیہ کے ایک حصّہ کا تدیم کیلئے ترجمہ کر رہا ہوں۔ اگر ترجمہ مکمل ہو گیا تو ناظرین تدیم تک اس کو پیش کر سکونگا۔

دنیائے اسلام کے تمام حصّوں میں سے جسقدر مسلمانان چین سے مسلمانان عالم بے خبر ہیں شاید دنیا کے کسی حصّہ کے مسلمانوں سے اسقدر ناواقف نہ ہونگے۔ یہاں تک کہ وہاں کے مسلمانوں کی صحیح تعداد بھی ابتک لوگوں کو معلوم نہیں کوئی سیّاح ۵ کروڑ بتاتا ہے تو کوئی دو کروڑ کوئی کہتا ہے کہ چھ کروڑ سے کسی حال میں کم نہیں بہرحال ابتک ہمیں مسلمانان چین کی صحیح تعداد معلوم نہیں۔ حال میں بدرالدین صاحب (بی۔ اے جامعہ) مقیم ندوہ نے اپنے مضمون میں مسلمانان چین کی تعداد ۵ کروڑ بتائی ہے لیکن یہ سب ظنّی اور تخمینی ہے۔ ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح بہت سی حالتیں جن سے واقفیت مسلمانان عالم کا فرض ہے پردۂ خفا میں ہیں۔ آج ناظرین کے لئے حاشیہ کے اس حصّہ کا ترجمہ کر رہا ہوں جس کا تعلق مسلمانان چین سے ہے۔

اسلام کی روشنی ارض چین میں بہت پہلے پھیلی ہے چینی مورخ کہتے ہیں کہ اسلام چین میں سلطان تاتیسونغ کے عہد میں پہنچا ہے۔ یعنی ساتویں صدی مسیحی میں، اور سب سے پہلا مسلمان جس نے سرزمین چین کو مشرف کیا۔ نبی کریم صلعم کے خاندان کا ابن حمزہ نامی ایک شخص ہے جو تین ہزار مہاجرین کی ایک جماعت لیکر چین آیا اور مقام سنغان فو میں مقیم ہو گیا۔ اس گروہ کے بعد دوسرے مسلمان بھی بحری راہ سے چین آئے۔ اور مقام یونان کے اطراف ونواحی میں مقیم ہو گئے۔

نیز چینی مورخین کا بیان ہے کہ ۸۷۸ء کے زمانہ میں عرب کا ایک لٹیرا گروہ بحر چین تک قزاقی کرتا ہوا آیا تھا اور جہاز و کشتیوں پر چھاپے مارتا ہوا ملک کے اندر گھسکر کنتوں کے علاقوں کو لوٹا اور بہت شاہی باغوں پر قابض ہو گیا۔" مذکورہ بالا بیان چینی تاریخ سے ماخوذ ہے۔

اسلامی تاریخ میں جہاں تک میرے علم کا تعلق ہے ابن حمزہ کے واقعہ کا کوئی ذکر نہیں اور نہ کوئی ایسے دوسرے واقعہ کا جو اس واقعہ کے موافق ہو تاریخ مسعودی میں ایک قصہ جو اس قصہ سے کچھ ملتا ہوا ہے مذکور ہے۔ مختصراً یہاں ذکر کرتا ہوں۔ روایت یہ ہے۔

"ایک قریشی ھبار بن اسود کی اولاد سے شہر سیراف گیا یہ شخص صاحب بصیرت اور اچھے اخلاق والا تھا۔ پھر وہاں سے کشتی پر سوار ہو کر ہندوستان آیا۔ اور مدت تک ایک کشتی سے دوسری کشتی پر سوار ہو کر ایک شہر سے دوسرے شہر کو گھومتا رہا اور آخر کار چین کے شہر خانفو تک پہنچ گیا۔ پھر اس کی بلند ہمتی نے اسے چین کے بادشاہ کے شہر کی طرف رخ کرنے پر مجبور کیا۔

Marfat.com

اس وقت بادشاہ وقت شہر حمدان میں تھا۔ یہ شہر چین کے بڑے شہروں میں شمار کیا جاتا ہے بہت دنوں تک یہ دربار شاہی تک باریاب نہ ہو سکا اور عرضیاں بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا رہا جنہیں اپنے کو اہلبیت کا ایک فرد لکھتا۔ زمانۂ دراز کے بعد بادشاہ ایک مکان میں رہنے اور اس کی ضروریات کے پورا کرنے کا حکم صادر کیا۔ اور خانفو کے بادشاہ کو لکھ بھیجا کہ اس شخص کے حالات اور تجارت اور نیز اس کے اس دعویٰ کی تصدیق کرکے مطلع کرے کہ کیا واقعی نبی کریم کے خاندان سے ہے؟۔ خانفو کے بادشاہ نے اسکے اس انتساب کی تصدیق لکھ بھیجی، اس پر بادشاہ نے اسے خوب انعام واکرام دیکر عراق واپس کردیا۔

عربی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چین کا سب سے پہلا خطہ جسے مسلمانوں نے پہچانا ہے کاشغر ہے۔ یعنی ۹۶ھ میں عہد ولید بن عبدالملک میں جب قتیبہ ابن مسلم باہلی اپنی ترکتازیوں سے خراسان کی طرف اسلامی فتوحات کا سیلاب بڑھاتا ہوا داد شجاعت دے رہا تھا۔

ابن اثیر جزری اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ قتیبہ ابن مسلم مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مع ان کے اہل وعیال روانہ ہوا اور سمرقند میں ان کے اہل وعیال کو چھوڑا نہر کو عبور کرنے کے وقت ایک شخص کو گذرگاہ نہر پر متعین کردیا کہ کوئی شخص بلا پاسپورٹ نہر سے نہ گذرنے پائے اور خود فرغانہ روانہ ہوگیا اور کچھ لوگ عصام کی گھاٹیوں کی طرف اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ کاشغر تک کی راہ طے کرنے میں سہولت بہم پہنچائیں۔ کیونکہ کاشغر فرغانہ سے چین کا سب سے قریب تر حصہ ہے۔ قتیبہ بن مسلم کو اس سفر میں خوب مال غنیمت ہاتھ آئے یہاں تک کہ ترکتاز کرتا ہوا چین کے قریب پہنچ گیا۔ چین کے قریب پہنچنے کے بعد شاہ چین نے قتیبہ ابن مسلم کو لکھا کہ تم میرے پاس اپنی جماعت سے ایک ایسے شریف شخص کو بھیجو جو تم سے اور تمہارے دین کی حقیقت سے مجھکو مطلع کرسکے۔ قتیبہ نے ایسے دس شخصوں کا انتخاب کیا جو حسن صورت اور حسن سیرت طلاقت لسانی اور فصاحت بیانی میں سب سے ممتاز تھے پھر ان کو حریر و پرنیان دیا اور دوسرے بیش قیمتی سامان کے ساتھ روانہ کیا۔

مسلمانوں میں ہبیرہ بن شمرج کلابی نام کا ایک شخص تھا جس نے اس جماعت سے کہا کہ جب تم بادشاہ چین کے پاس پہنچو تو بادشاہ سے کہنا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ میں اسوقت تک واپس نہیں ہونگا جب تک کہ تمہارے ملک کو پامال نہ کرلوں، تمہارے بادشاہوں پر مہر نہ لگادوں اور تمہارے ملک سے خراج نہ وصول کرلوں اسکے بعد ہبیرہ کی سرکردگی میں یہ جماعت روانہ ہوئی.....

شاہ چین کے دربار میں جب یہ مسلمان پہنچے تو شاہ چین نے ان سے کہا کہ تم اپنے سردار سے جاکر کہو کہ وہ واپس جائے۔ مجھے تمہاری قلت تعداد کا اچھی طرح علم ہے اور اگر تم واپس نہیں گئے تو یاد رکھو! ساتی موت کو بھیجکر سب کو موت کے گھاٹ اتار دونگا۔ مسلمانوں نے جواب دیا کہ تم اس جماعت کو قلیل التعداد کس طرح کہتے ہو جس کی فوج کا ایک سرا تمہارے ملک میں ہے اور دوسرا سرا زیتون کی زمینوں میں ہے (یعنی شام

Marfat.com

(ہیں) رہا تمہارا ہمیں قتل سے ڈرانا سو ہمارے نزدیک
(کو)ئی باعث خوف نہیں ہے ہمارے لئے موتیں مقرر
(ہ)یں جب موت آتی ہے تو سب سے باعزت موت
ہمارے نزدیک قتل ہے۔ ہم قتل سے نہ ڈرتے
ہیں اور نہ جان چراتے ہیں، اور یہ بھی سن لو ہمارے
سردار نے قسم کھائی ہے کہ وہ جب تک تمہارے ملک
کو پامال نہ کریگا۔ تمہارے بادشاہوں پر مہر نہ لگالیگا
اور تم سے جزیہ نہ لے لیگا واپس نہیں ہوگا۔ اس پر
بادشاہ نے کہا کہ ہم اسے اس کی قسم کو پورا کر کے
اسے عہدہ برآ کرتے ہیں، ہم اپنی زمین کی تھوڑی سی
مٹی بھیجے دیتے ہیں کہ اسے وہ پامال کر دے، اور
اپنے بعض لڑکوں کو کہ ان پر مہر لگائے اور اتنا جزیہ
بھیجے دیتے ہیں۔ جس سے وہ خوش اور راضی ہو جائیگا
پھر ان مسلمانوں کو انعام واکرام دیکر روانہ کیا اور قتیبہ
بن مسلم کے پاس تمام چیزیں روانہ کر دیں۔ قتیبہ نے
جزیہ قبول کر لیا۔ اور نوجوانوں کو مہر لگا کر واپس کر دیا۔
اور مٹی کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھ کر اپنی قسم پوری کی۔
ابھی قتیبہ اسی جنگ میں مصروف تھا کہ خلیفۃ المسلمین
ولید بن عبدالملک کے موت کی خبر ملی۔ پھر اسی سال
قتیبہ قتل ہوا۔ ورنہ اگر قتیبہ زندہ رہتا تو اس کی بہادری
اور بلند ہمتی سے قوی امید تھی کہ وہ دوبارہ چین پر حملہ
کرتا۔ بلاشبہ اسلام اسوقت چین میں پہنچ چکا تھا
اور اس کے متبعین کی تعداد کافی ہو چکی تھی اور مسلمان
دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہے تھے۔ کیونکہ عربی
تواریخ میں اس قسم کے بہت سے واقعات ملتے ہیں
جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی صدی ہجری میں اسلام
چین تک پہنچ گیا تھا۔ ابن اثیر میں ایک روایت ہے کہ ۲۶۶ھ
میں ملک چین میں ایک غیر معروف شخص ظاہر ہوا جس نے
ناتجربہ کار عوام اور اوباش کی ایک جماعت اکٹھا کر کے خانفو
پر چڑھائی کر دی۔ اور محاصرہ کر لیا۔ اور ابن اثیر نے یہ بھی
لکھا ہے کہ یہ شہر بہت ہی مستحکم ہے اور اس میں ایک بہت
بڑی نہر ہے اس کی آبادی بہت بڑی ہے۔ جس میں بہت
بڑی تعداد میں مسلمان اور نصاریٰ، یہود، مجوس اور انکے
علاوہ اہل چین میں یہ واقعہ تیسری صدی ہجری کا ہے۔ اسکے
بعد چینی مسلمانوں کے متعلق خبریں کثرت سے تاریخ میں ملتی
ہیں۔ امام احمد قستقلندری متوفی ۸۲۱ھ ہجری نے شریف حسین
بن جلال سمرقندی سے ایک روایت کی ہے۔ آخر الذکر
بہت بڑے سیاح ہیں چین اور اس کے دور دراز ممالک کی سیاحت
کر چکے ہیں۔ روایت یہ ہے کہ سب سے تعجب انگیز چیز
جو انھوں نے خان کے ملک میں دیکھی (چین مختلف حصوں
پر تقسیم ہے ہر حصہ کے بادشاہ کو خان یا قان کہتے ہیں
اور سب قان کا بادشاہ خاقان چین کہلاتا ہے) وہ یہ کہ
خان کی رعایا میں باوجود اسکے کافر ہونے کے مسلمان
بہت کثرت سے ہیں۔ نیز باعزت اور صاحب احترام ہیں
اگر کوئی کافر کسی مسلمان کو قتل کرتا ہے تو وہ کافر قاتل
اپنے خاندان کے ساتھ قتل کیا جاتا ہے۔ اور اس کے
مال واسباب لوٹ لئے جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی مسلمان
کسی کافر کو قتل کرتا ہے تو مسلمان اسکے قصاص میں نہیں
قتل کیا جاتا بلکہ اس سے دیتہ مانگی جاتی ہے اور کافر کی
دیتہ ان کے نزدیک ایک گدھا ہے۔ گدھا کے علاوہ کسی

Marfat.com

دوسری چیز کا مطالبہ نہیں ہوتا۔"

صرف کاشغر اور منغولیا میں چنگیز خاں کی اولاد میں اسلام نے اپنا قدم شاہی تخت تاج میں رکھا ورنہ چینی ممالک میں اسلام شاہی خاندان میں نہ پھیل سکا۔ تاریخ ابن خلدون جلد ۵ میں ترکوں کے ذکر میں لکھا ہے کہ ترکوں کی حکومت ترکستان اور کاشغر میں تھی خاندان کے بادشاہ بعض رعایا کے مسلمان ہونے کے بعد اپنے ملک میں اسلام لائے۔

ماوراء النہر کے بنی سامان کے درمیان جو دولۃ عباسیہ کے زیر نگین تھے، اور ان ترکوں کے درمیان جنگ و صلح رہتی تھی۔

یحییٰ ابن احمد نسائی نے جو جلال خوارزم شاہ کا کاتب تھا۔ جلال الدین خوارزم شاہ کی حکومت کی تاریخ میں لکھا ہے کہ چین زمانۂ قدیم سے نو حصوں پر منقسم ہے۔ ہر حصّہ کا طول ایک ماہ کی مسافت ہے۔ اور ہر حصّہ کا ایک چھوٹا بادشاہ ہوتا ہے۔ جو خان کے نام سے موسوم اور خان اعظم کا نائب ہوتا ہے۔ چنگیز خاں بھی ان ہی خانوں میں سے ایک خان تھا۔ لیکن اپنی طاقت و سطوت سے تمام بادشاہوں پر غالب آگیا اور خان اعظم بن بیٹھا۔ علاء الدین عطار سے ابن فضل اللہ نے روائت کی ہے کہ چنگیز خاں اور اس کی قوم مذہبًا مجوسی تھے۔ یہانتک کہ زمین کے بہت بڑے خطہ کے مالک اور بادشاہ ہو گئے تھے۔ عراق، شمالی ماوراء ہند میں انھوں نے ایک مستحکم حکومت قائم کرلی تھی۔ اس کے بعد اللہ نے ان کے حسن بادشاہ کی ہدایت کی وہ اسلام لایا۔ ابن خلدون نے ترکستان، کاشغر اور ماوراء النہر کے بنی خطائی خاندان کے بادشاہ کے ذکر میں لکھا ہے کہ یہ متشدد مجوسی تھے لیکن جب ترماشین سریر آرائے سلطنت ہوا تو ۷۲۵ھ میں اسلام لایا اور جہاد کیا۔ نیز ادھر سے گذرنے والے تاجروں کی عزت و احترام کرنے لگا۔

تاریخ ملک مؤید میں بادشاہوں کے بیان کے ماتحت دمرشی خاں کی اولاد کا ذکر ہے۔ دمرشی خاں چنگیز خاں کی اولاد سے تھا۔ دوشی خاں کے مرنے کے بعد اس کی جگہ پر اس کا بیٹا ناطو خاں تخت نشین ہوا۔ ناطو خاں کے بعد طرطو خاں تخت نشین ہوا۔ طرطوں خاں کے مرنے کے بعد اس کا بھتیجا برکت نامی تخت نشین ہوا اور یہ اسلام لایا۔ اس کے اسلام لانے کی صورت یہ ہوئی کہ شمس الدین باخوری نے جو اسوقت بخاری میں مقیم تھے شاہ برکت کو ایک خط لکھا جس میں انھوں نے اسے اسلام کی دعوت دی تھی۔ شاہ برکت خط پہنچتے ہی اسلام لایا۔ اس کے بعد شاہ برکت نے شمس الدین باخوریؒ کی زیارت کے لئے رخت سفر باندھا اور بخاری پہنچا۔ شمس الدینؒ نے اولاً شاہ برکت کو اپنے پاس آنے کی اجازت نہیں دی لیکن اپنے دوستوں کے اصرار پر شاہ برکت کو شرف زیارت کی اجازت دی۔ شاہ برکت شمس الدینؒ کے پاس آکر تجدید اسلام کی اور اپنے اسلام کے اظہار و اعلان اور اپنی تمام رعایا کو اسلام کی طرف رغبت دلانے کا معاہدہ کیا۔ چنانچہ شاہ برکت نے تمام لوگوں کو اسلام لانے پر ابھارا۔ مسجدیں اور مدارس بنوائے۔ علماء و فقہاء کو مقرب کیا۔ دوسرے مورخین نے ازبک بن طغر لجائی کے اسلام کا ذکر کیا ہے جو چنگیز خانی نسل سے تھا۔ یکدار بن ہلاکو، خربندا ابن ار

Marfat.com

احمد ابن ہلاکو ان سب کے اسلام کا ذکر کتب تاریخ میں موجود ہے۔ قلقشندی نے صبح الاعشیٰ میں لکھا ہے اس چینی دیار کا سب سے پہلا بادشاہ جو مشرف بہ اسلام ہوا ترماشیرین ہے۔ اس نے اسلام لانے کے بعد اسلام کی مدد واعانت کی اور اسلام کے تمام فرائض کو پورا کیا۔ اپنے ملک کے امراء روساء سے فوج ولشکر سے اسلام لانے کو کہا۔ قلقشندی نے بکدار کے اسلام لانے کا بھی ذکر کیا ہے چنگیز خاں کی جماعت کے اخلاف میں اتبک اسلام ہے۔

جغرافیہ الینرو رکلوس میں ہے کہ قوم اولیغور وطانغون جو کانسو کے رہنے والے تھے زمانۂ قدیم میں لامہ کے پجاری اور مذہب نسطوریہ کے پیرو تھے بعد کو اسلام لائے۔ ان کے اسلام کے ساتھ جغطائی کے شمالی اور مغربی حصّہ کے تمام باشندے مسلمان ہو گئے۔ پھر مشرقی ترکستان کے باشندے اور عہد تمر لیک کے بقیہ مغل مسلمان کی ہجرت سے چین کے اس حصّہ میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور آج اس خطہ میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے۔"

مشہور سیاح ابن بطوطہ کی کتاب سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ جسوقت چین گیا ہے اسوقت نخل اسلام چین میں برگ وبار لا چکا تھا۔ اپنے سفر نامہ کے چوتھے حصّہ میں لکھتا ہے۔ چین کے ہر شہر میں ایک حصہ مسلمانوں کیلئے مخصوص ہے جسمیں صرف مسلمان رہتے ہیں۔ اسمیں مسلمانوں کی مسجدیں جمعہ اور دوسری اسلامی ضرورتوں کے لئے ہوتی ہیں۔ مسلمان باعزت ہیں۔

شہر زیتون کا بھی تذکرہ کیا ہے شہر زیتون کے ذکر کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ شہر زیتوں اور دوسرے چینی شہر میں رہنے کی صورت یہ ہوتی ہے لوگوں کے مکانات باغ اور کھیتوں کے وسط میں ہوتے ہیں اور اس سبب شہر بہت وسیع ہوتے ہیں۔ مسلمان سب سے الگ ایک شہر میں رہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد اس ملک کے اکابر کے نام گنائے ہیں جن سے ابن بطوطہ کو وہاں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس سلسلہ میں بیان کیا کہ مسلمانوں کے قاضی تاج الدین اردویلی جن کا شمار افاضل چین میں ہے اور شیخ الاسلام کمال الدین عبداللہ اصفہانی جن کا شمار صلحاء مسلمین میں ہے مجھ سے ملنے آئے بڑے تاجروں میں سے شرف الدین تبریزی جن سے میں نے ہندوستان جانے کے وقت قرض بھی لیا تھا مجھ سے ملنے آئے یہ تجار چونکہ کفرستان میں ہیں اس لئے اگر کوئی مسلمان دوسرے ممالک سے آتا ہے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔ "اللہ اللہ" یہ سرزمین اسلام سے آرہا ہے"۔ اسے اپنے مال کے زکوۃ سے اس قدر دیتے ہیں کہ وہ اپنے مکان انھیں کی طرح مالدار ہو کر جاتا ہے۔ شہر چین کلاں کے حالات بیان کرنے کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ اس کے ایک طرف مسلمانوں کا شہر ہے جس میں جامع مسجد، خانقاہ، اور بازار ہیں ایک قاضی اور ایک شیخ الاسلام ہیں۔ چین کے ہر شہر میں شیخ الاسلام کا ہونا ضروری ہے۔ جس کی طرف مذہبی معاملات میں مسلمان رجوع کرتے ہیں اور ایک قاضی بھی ہوتا ہے جو مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے اپنی قیامگاہ کے متعلق لکھتا ہے۔ میں اوحد الدین السنجاری کے مکان میں جنکا شمار فضلائے چین اور مالدار لوگوں میں ہے ٹھہرا تھا۔

Marfat.com

جب ابن بطوطہ شہر تخنفو پہنچا تو اس نے مندرجہ ذیل حالات تحریر کئے۔ لکھتا ہے "مسلمان اس شہر میں تیسری شہر پناہ کے قریب داخلی حصہ میں مقیم ہیں"۔ خود ابن بطوطہ شیخ ظہیر الدین قرلانی کے ہاں ٹھہرا۔ شہر خنسار کے متعلق لکھتا ہے "یہ شہر چھ بڑے بڑے شہر کا مجموعہ ہے اس شہر کے دوسرے حصہ میں ترک، یہود، نصاریٰ رہتے ہیں تیسرے حصہ میں مسلمان رہتے ہیں، اس حصہ میں مسجدیں بھی ہیں ایک عثمانی نام کی خانقاہ بھی ہے یہ خانقاہ عثمان بن عفان مصری کی اولاد کی ہے۔ ان لوگ کا شمار اس شہر کے معززین اور اکابر مسلمین میں ہوتا ہے اس میں صوفیہ کرام کی ایک جماعت بھی ہے۔ مسلمان اس شہر میں بہت بڑی تعداد میں ہیں۔

مذکورہ بالا تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام چینی ممالک میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیلا اور مسلمانوں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ گئی۔ لیکن مسلمان کئی کروڑ ہیں؟ یہ صحیح طور پر معلوم نہیں اسکاٹ شوفت کا گمان ہے کہ مسلمان صرف دو کروڑ ہیں۔ لیکن اکثر سیاح کا گمان ہے کہ مسلمان دو کروڑ سے کہیں زیادہ ہیں۔ "مسلمان چین میں" کے نام سے ایک کتاب ایک فرانسیسی مصنف کے قلم سے شائع ہوئی ہے جس میں مسلمانان چین کو ڈھائی کروڑ لکھا ہے۔ لیکن بعض چار کروڑ سے چھ کروڑ تک بیان کرتے ہیں۔ (بہر حال یہ پیش نظر رہے کہ مسلمانوں کی تعداد کم بیان کرنے میں اعداد اسلام کے پیش نظر مسلمانوں کی اہمیت کو کم کرنا ہے) صوبہ کانسو میں سواد اعظم مسلمانوں ہی سے ہے۔

کانسو میں دو شہر سالاذ اور کنکیا یو چینی طلبہ کیلئے علمی مرکز ہیں۔ چین کے تمام شہروں سے تشنۂ علم مسلمان طلبہ وہاں اپنی پیاس بجھانے کو جاتے ہیں۔ صوبہ کانسو کے بعض شہروں کی مسجدیں شمار کرنے کے بعد سیکڑوں کی تعداد تک پہنچتی ہیں۔ اور یقیناً یہ تعداد اسلام کے بڑے بڑے دار السلطنت جیسے دمشق، قاہرہ، استانہ کی مسجدوں کی تعداد کے برابر ہے۔

شمالی چین کے بہت سے صوبوں میں مسلمان ثلث ہیں، مسلمان، تاجر، جفاکش، اور باکار ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ شمالی حصہ کے مسلمان عام چینیوں سے بہت اچھے ہیں مسلمان بسا اوقات غریب بت پرست چینیوں کی اولاد لیکر ان کی پرورش کرتے ہیں۔ یہ صورت اکثر قحط و گرانی کے زمانہ میں زیادہ ہوتی ہے، چینی فقہاء زکوٰۃ کے ادا کرنے میں بہت سخت ہیں۔ ہر شہر کی زکوۃ صندوقوں میں جمع کی جاتی ہے۔ مصیبت اور قحط سالی کے زمانہ میں وہ زکواۃ خرچ ہوتی ہے۔ غریب اور مسکین اس زکواۃ سے اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، اس حسن انتظام کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں بالکل فقیر اور تنگ دست بہت کم ہیں، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر کی طرح رہتے ہیں، ان کے درمیان اتفاق و اتحاد ہے دشمن کے مقابلہ میں سب ایک دوسرے کے معین و مددگار رہتے ہیں۔ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق اس طرح ہے کہ دوسری قومیں جو پہلو بہ پہلو رہتی ہیں ایسے اتحاد و اتفاق کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ چونکہ افیون اور دوسری مسکرات سے مسلمان سخت پرہیز کرتے ہیں۔ اس لئے

Marfat.com

ے قوی بہت ہی مضبوط ان کی شکلیں بہت ہی اچھی
ہیں۔ عام چینی ان کے قوی کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔
ت وسیرت دونوں میں چینی مسلمانوں کو غیر مسلم چینی
تیت ہے۔ عام چینی مسلمانوں کو "ھوائی ھوائی"
پکارتے ہیں۔ یہ لقب زمانہ گذشتہ میں ادیغوری
ت کا تھا۔ مسلمانان چین "کیاون" کے نام سے
دم ہونا پسند کرتے ہیں۔ اس چینی جملہ کے معنی اہل دین
ہیں۔ غالباً ان الدین عند اللہ الاسلام کی طرف اشارہ
ے کیلئے اس لقب کو پسند کرتے۔ جنوبی یونان کے
ان "بانطی" کے نام سے مشہور ہیں۔ یہاں کے مسلمان
باشندوں سے اپنی یکرنگی لباس، خاص حلیہ اور
وتوں کے باعث ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کی صورتوں سے
ت، حمیت، خودداری کے اوصاف نظر آتے ہیں اور
صفتوں میں یہ اپنا شریک و سہیم نہیں رکھتے۔ جنوبی
ان کے علاقہ کے رہنے والے سب اہل سنت والجماعت
با اہل فقہ میں بعض حنفی ہیں اور بعض شافعی۔ بت پرستوں
ے بالکل اختلاط نہیں رکھتے بلکہ ایک حد تک ان سے
نفرت کرتے ہیں ان سے شادی بیاہ تو بڑی بات ہے
بھی کبھی بت پرستوں کی لڑکیوں کو خرید لیتے ہیں۔
بت پرستوں اور مسلمانوں میں کوئی قابل ذکر جنگ
وا اس صدی کی ایک جنگ کے نہیں ہوئی۔ لیکن موجودہ
صدی میں چینی مسلمانوں اور چینی بت پرستوں میں ایسی ہولناک
جنگ ہوئی کہ اس جنگ کے حالات سنکر دل کانپ جاتے
ہیں۔ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں اور اس جنگ کے
واقعات کا اگر استقصار کیا جائے تو کئی جلدیں ان سے

سیاہ ہوجائیں۔ خلاصہ اس جنگ کا یہ ہے کہ ۱۸۵۵ء
میں صوبہ یونان میں مسلم اور غیر مسلم مزدور پیشہ جماعت
میں، جو کسی کان میں کام کرتے تھے کسی بات پر جنگ
چھڑ گئی۔ جنگ میں مسلم مزدور پیشہ جماعت غالب آئی۔
لیکن اس غلبہ کے بعد جنگ ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ اسکے
بعد جدال و قتال کا بازار گرم ہوگیا۔ اور پے در پے
جنگیں ہوئیں۔ چینی حکام بالادست اس جنگ کی آگ
بجھانے میں بالکل عاجز تھے۔ جب جنگ اس حد تک
پہنچ گئی تو چینی حکام نے ایک ندائے عام سے تمام چینی
بت پرستوں کو جمع کیا اور مئی ۱۸۵۶ء میں ایک روز مقرر کیا
کہ اس متعین روز میں مسلمانوں پر حملہ کیا جائے اور اس
جنگ میں مسلمانوں کو تہ و بالا کرکے ان کو صفحہ ہستی سے
حرف غلط کی طرح مٹا دیا جائے، مسلمانوں کو اس سازش
کا علم کچھ پہلے ہوگیا۔ مسلمانوں نے بھی حتی الوسع اس جنگ
کے لئے سامان بہم کیا۔ ہتیار بند ہوکر، تلوار، زرہ سے آراستہ
ہوکر میدان جنگ میں اتر آئے۔ چینی مسلمانوں نے متعدد
میدان مارے اور جنگ میں فریق ثانی ہی کو زیادہ نقصان
اٹھانا پڑے۔ حکومت صرف ان دیہاتوں کے مسلمانوں
کو نقصان پہنچا سکے جن میں مسلمان بہت کم تعداد میں تھے۔
جنگ اس طرح جاری رہی۔ تمام ملک کے باشندے مسلم
اور غیر مسلم آپس میں ٹکرا گئے لیکن چینی مسلمان تقریباً ہر
جگہ غالب رہے۔ اب جنگ نے دوسرا رنگ اختیار کیا۔
مسلمانوں نے بڑے بڑے شہر فتح کرنا شروع کر دیئے
شہر "طالی فو" جس کا قلعہ بہت ہی مستحکم اور قدیم طرز پر ہے
مسلمانوں نے اسے فتح کر لیا۔ اس شہر سے ایک راہ

Marfat.com

برما نیا کو جانے والی نکالی جہاں سے رسد اور آلات جنگ مہیا کرنا شروع کر دیئے اس شہر کی فتح کے بعد "یونان فو" کو جو اس صوبہ کا دارالسلطنت ہے فتح کیا۔ اس طرح ۱۲ سال تک آتش جنگ حکومت اور مسلمانوں کے درمیان مشتعل رہی اور حکومت اور عام چینی ان کے مقابلہ میں پس پا رہے جب حکومت چین کو یقین ہو گیا کہ تلوار و تفنگ سے یہ سر نہیں ہونے کے تو حیلہ اور دسیسہ کاری پر اتر آئی۔

مسلم زعماء کو پوشیدہ طریقہ پر رشوت کے ذریعہ سے ملانا شروع کیا۔ بڑے بڑے وعدے اور عطیے سے انھیں رام کرنا شروع کیا۔ بہتوں کو بڑے بڑے سرکاری عہدے پر سرفراز کیا۔ اس دسیسہ کاری سے مسلمانوں کی اتحادی قوت میں کمزوری آگئی اور اب خود مسلمانوں میں افتراق و اختلاف اس حد تک کو پہنچ گیا کہ مسلمانوں میں دو فرقے ہو گئے اور دونوں صف میں مسلمان نظر آنے لگے۔ اب جب مسلمانوں کے رؤساء اور زعماء فریب میں آکر اپنے بھائیوں کے خون بہانے پر اتر آئے تو ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو شکست پر شکست ہونی چاہیئے۔ اور یہی ہوا۔ حکومت اور عام چینیوں نے جوش انتقام میں تیس ہزار چینی مسلمانوں کو تلوار کے بھینٹ چڑھا دیئے۔ اور بقیہ مسلمان برمانیا میں پناہ گزین ہو گئے۔

اسی طرح شمالی چین میں ۱۸۶۲ء میں مقام "ہوا تشیو" یعنی مشرقی "سینغان فو" میں چینی مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فتنہ و فساد کی آگ بھڑکی۔ اس میں مسلمانوں ہی کا پلہ بھاری رہا۔ مسلمانوں نے ریگستان و مرغزار ہر جگہ چینیوں کو قتل کیا، قید کیا، لیکن انھیں افسوس ہے کہ وہ "سینغان فو" کے مستحکم قلعہ کو نہ فتح کر سکے۔ ابھی جنگ ختم نہیں ہوتی ہے۔ دار و گیر کا بازار گرم سے گرم تر ہوتا گیا اور معمولی جنگ ہولناک جنگ سے بدل گئی

جنگ کی چنگاری شمالی چین کے ہر حصہ میں سرعت سے پھیل گئی منادی اسلام نے خوں بہا، قصاص، انتقام کے نعرے لگا لگا کر لوگوں کو جمع کرنا شروع کیا۔ چینی مسلمان لوہے کی دیوار کی طرح دشمن کے مقابلہ میں اکٹھا ہوئے۔ عام چینی مغل، چینی مسلم کے سیلاب کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ اور خس و خاشاک کی طرح بھگئے۔ مسلمانوں نے مفرور دشمن کا تعاقب اس جوش سے کیا کہ کشتے کے پشتے لگا دیئے شانسی کا تمام علاقہ خون و غارت گری سے میدان جنگ بن گیا۔ چینی بت پرست و مغلوں کو جب آبادی میں پناہ نہ ملی تو پہاڑوں، جنگلوں، گھاٹیوں کی طرف پناہ لینے کو بھاگے۔ کہ شاید یہ انھیں اپنی پناہ میں رکھ سکیں لیکن ان کا گمان غلط نکلا، وہاں بھی وہی دشمن انسے انتقام لینے کے لئے موجود تھے۔ اس جنگ میں سوا بڑے بڑے شہروں کے شمالی چین کے تمام دیہات گاؤں تباہ و برباد ہو گئے۔ بڑے بڑے شہر اپنی مستحکم شہر پناہ کے سبب سے مسلمانوں کے ہاتھوں سے بچ گئے۔ ورنہ ان کا بھی حشر وہی ہوتا جو دیہاتوں کا ہوا۔ مسلمانوں نے اس جنگ میں سوا نصاریٰ کے جو بھی ان کی راہ میں حائل ہوا کانٹوں کی طرح اسے کاٹ چھانٹ کر الگ کر دیا۔ اس جنگ میں مقتولین کی تعداد کروڑ تک پہنچ گئی تھی۔ بعض مغربی مورخین کا بیان ہے کہ مسلمانوں نے اس جنگ میں اپنی اولاد اور عورتوں کو اپنے

Marfat.com

ہاتھوں سے اس غرض سے قتل کیا کہ وہ جہاد میں شریک ہو سکیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ جنگ بھی پندرہ سال تک شعلہ زن رہی، اور حکومت چین کو مسلمانوں کے ہاتھ سے مفتوحہ اور غصب شدہ ممالک کے واپس لینے کی امید رہی، لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد مسلمانوں میں وہی اختلاف و شقاق کی وبا پھیل گئی۔ جس سے فتح کے بعد شکست، کامیابی کے بعد ناکامیابی، قوت و غلبہ کے بعد ضعف و پست پائی کے برے دن دیکھنے پڑے تھے چنانچہ حکومت کی فوجوں نے ان سے مقابلہ کر کے ان کو نقصان پہنچانا شروع کیا۔ شانسی، کانسو مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ پھر تیال شان کے قلعے بھی ہاتھ سے جاتے رہے۔ شاہی فوج نے باغیوں کی جماعت کو ہزارہ اور نغاریا کے علاقوں میں منتشر کر دیا۔ لیکن پھر بھی اس جنگجو جماعت کی طاقت کا لوہا مانا جاتا ہے اور اب تک ان کی طاقت میں کمی نہیں آئی ہے بلکہ روز بروز ان کی قوت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ان مسلمانوں میں سے بہت سے حکومت میں افسر اعلیٰ و حکام ہیں اور بہت بڑی تعداد حکومت کی فوج میں افسر و سپہ سالار ہے۔ اور چینی مسلمانوں کے اسی فوجی اعزاز اور حکومت میں شریک ہونے کے باعث بہت سے مغربی مورخین کا خیال ہے کہ صرف مسلمان ہی مستقبل قریب میں چینی تخت و تاج کے مالک ہونگے۔ ایک مرتبہ روسی حکومت نے ایک علمی کمیشن چین کو بھیجا تھا۔ کہ وہ تفحص و تفتیش کے بعد چین کے صحیح حالات کی رپورٹ حکومت روس کے سامنے پیش کرے۔ اس کمیشن نے چین کی اندرونی حالات کو بڑی جانفشانی سے معلوم کیا۔ چنانچہ منجملہ اور باتوں کے حکومت روس کو جس سے ڈرایا تھا وہ یہ تھا کہ چین کا مستقبل اسلام نظر آتا ہے کیونکہ اسلام چین میں انتہائی سرعت سے پھیل رہا ہے اور اگر کہیں چینی مسلمانوں کے ہاتھ میں زمام حکومت آئی تو مشرق میں ایک انقلاب عظیم برپا ہو جائے گا۔ کیونکہ بت پرست حکومتِ چین اور اسلامی حکومتِ چین دونوں یکساں نہیں ہیں۔ "وانتم الاعلون ان کنتم مومنین"۔

(بقیہ آئندہ)

محمد ناظم ندوی

(ندیم، دسمبر ۱۹۳۳ء)

Marfat.com

مسلمانانِ چین کی سابقہ غفلت اور موجودہ بیداری

کہاں چین! اور کہاں ہندوستان! ان کے درمیان ہزاروں میل کی مسافت، آنے جانے میں مہینوں کی ضرورت، ان کے دامن میں سمندر حائل، اور پشت پر کوہ ہمالیہ کی دیوار! ان رکاوٹوں کی وجہ سے ہندوستان اور چین کے تعلقات عرصے سے منقطع ہو گئے۔ اب اہلِ چین کو یہ خبر نہیں کہ ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے؟ اور غالباً اہلِ ہند بھی اس سے بے علم کہ چین میں ہے کیا؟

صرف ایشیا ہی میں نہیں! بلکہ تمام عالم میں ــ چین اور ہندوستان ہی ایسے دو ملک ہیں جن کا رقبہ سب سے وسیع، جن کی آبادی سب سے زیادہ جن کی زمین سب سے زرخیز، جن کا تمدن سب سے پرانا، جن کی تہذیب سب سے شائستہ جن کی معاشی زندگی سب سے عمدہ، اور جن کی زرعی پیداوار سب سے اعلیٰ۔ لیکن باوجود ان خوبیوں اور خصوصیات کے ان دونوں میں ایک دوسرے سے سب سے زیادہ بے تعلقی ہے اور ایک دوسرے سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں!

حقیقت یہ ہے کہ نہ کسی ہندوستانی نے ان دونوں میں تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی اور نہ کسی چینی نے اس کی اہمیت کو سمجھا۔ جبکہ ان کے درمیان سیاسی اور معاشی رشتے ہی نہ ہوں تو کون ایسا جوانمرد ہے جو ان کے مذہبی تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرے! کسی زمانہ میں ہندوستان اور چین کے مابین اچھے تعلقات تھے مگر ہم عہدِ جدید کے فرزند ہیں۔ عہدِ کہن کی باتیں یاد کرنے سے شرم آتی ہے کہ ہم اپنے آبا و اجداد سے کہیں پیچھے ہیں۔ بہت سے "ناممکنات" "ممکنات" بن گئے ہیں اور فطرت کی بے پناہ چیزیں انسان کے بس میں آگئیں۔ مگر افسوس باوجود ان ترقیوں اور آسانیوں کے ہم اپنے پرانے تعلقات اب تک جوڑ نہ سکے۔

ان دونوں ملکوں کے درمیان سیاسی اور معاشی رشتے منقطع ہونے کی وجہ سے، مذہبی تعلقات ناچار منقطع ہو گئے۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں اکثر چینی یہ بھی نہیں جانتے کہ ہندوستان میں کون کون بستے ہیں اور اکثر ہندوستانیوں کو یہ علم نہیں کہ چین میں لوگ کیسے رہتے ہیں؟ عام طور پر ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ جو لوگ ہندوستان میں بستے ہیں وہ ہندوستانی کہلاتے ہیں اور جو چین میں آباد ہیں ان کو چینی کہا جاتا ہے۔ یہی ہمارا علم اور یہی ہماری واقفیت! جب ہم ان عام اور موٹی موٹی باتوں سے بیگانہ ہیں تو کیسے ممکن ہے کہ ہم ایک دوسرے کی خاص حالات دریافت کر سکیں۔ اس عام بیگانگی اور ناواقفیت کی وجہ سے نہ صرف مسلمانانِ چین اپنے غیر ممالک کے بھائیوں سے بے تعلق ہیں، بلکہ زعمِ غالب یہ ہے کہ اسلامی دنیا بھی ان سے ناواقف۔

مسلمانانِ چین ناموشی اور گوشہ نشینی اختیار کرنے کی وجہ سے قابلِ فراموش ہو گئے کیونکہ جب وہ خود باہر کے اپنے بھائیوں سے ملنے کی کوشش

Marfat.com

ذکریں تو غیر ممالک کے مسلمان کیسے ان سے مل سکے؟ جب انہوں نے اپنے بھائیوں کو یاد نہیں کیا، تو ان کو کون یاد کریگا؟ بس اسکی سزا یہی کافی ہے کہ آج ان کے دوسرے بھائی انہیں جانتے بھی نہیں!۔

خیر، جو ہونیوالا تھا، ہو چکا، اور جو گذرنے والا تھا گذر چکا۔ ہم اپنی بے توجہی اور غفلت کی وجہ سے مسلمانان ہند سے تعلقات قائم نہ کر سکے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ ہماری غلطی اور جرم ہے مگر اسکی سزا ہمیں تو کافی مل گئی۔ اس غلطی کو محسوس کرتے ہوئے اب ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ کوئی ایسا ذریعہ اختیار کریں جن سے یہ ٹوٹے ہوئے رشتے پھر جوڑے جا سکیں۔ کوئی ایسی صورت نکالیں جن سے یہ باہمی تعلقات برابر قائم رہ سکیں۔ اور کوئی ایسی تدبیر کریں جس سے ادھر کی خبریں ادھر پہنچ سکیں، اور ادھر کی خبریں ادھر آ سکیں۔ تاکہ اسی طریقے ایک دوسرے باخبر رہیں۔ اور معاون و مددگار بنانے کے لئے غالباً اس سے بہتر کوئی اچھا ذریعہ نہیں کہ اخبارات اور رسائل سے کام لیں اور اس طرح ان کی حالات ایک دوسرے کو پہونچائیں۔ مگر دشواری یہ پیش آتی ہے کہ "زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم"۔ چین کی زبان اور ہے اور ہندوستان کی اور۔ چینی مسلمانوں کے جو حالات ہیں صرف چینی ہی زبان میں مل سکتے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کی حالات اگرچہ انگریزی یا اسی قسم کی اور زبانوں سے معلوم ہو سکتی ہیں مگر زیادہ تر ناقابل قبول اور غیر صحیح۔ صحیح اور معتبر حالات اردو ہی میں مل سکتے ہیں اب ضرورت اسکی ہے کہ کچھ ہندوستانی ایسے ہوں کہ چینی زبان سیکھیں اور کچھ چینی اردو سیکھیں۔ جب زبان سے واقفیت ہو گئی تو جملہ حالات نہایت آسانی کیساتھ ایک دوسرے کو پہنچ سکتے ہیں۔

عرصہ سے مسلمانان چین یہ محسوس کر رہے ہیں کہ بحیثیت مسلمان ہونیکے وہ ہرگز اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ عالم اسلام ——— سے تعلقات رہے۔ ایک مسلمان کے لئے چاہے وہ دنیا کے کسی گوشہ میں ہو یہ ضروری ہے کہ وہ اسلامی دنیا سے آگاہ رہے اور اپنے تعلقات و روابط کی کڑیوں کو کبھی منقطع نہ ہونے دے تاکہ بوقت ضرورت اسکی مدد کیجا سکے، اور اسی سے کام لیا جا سکے۔ ورنہ اسکی تباہی یقینی ہے جیسا کہ آج دنیا میں ہو رہا ہے۔

اسلام میں توحید اور ایمان ایک ایسا رابطہ ہے جو مسلمانوں کے تمام آواز، ان کی بکھری ہوئی قوتیں اور بے تعلق اعضا کو اس مضبوطی اور ربط سے جوڑتا ہے کہ ان میں اگر کوئی ایک فرد مصیبت میں پڑ جائے، تو دوسرے تمام افراد بھی اسکی ہی مصیبت کو اپنی ہی مصیبت سمجھتے ہیں جیسے کوئی عضو درد میں مبتلا ہو، تو سارے اعضا اسی درد کو محسوس کرتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمانان چین بھی وقت کے مد و جزر کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ اسکی اہمیت کو سمجھتے ہیں کہ مرکز کو چھوڑنا اور اپنی جماعت سے علیحدگی اختیار کرنا نہ وہ ان کے تنزل کا باعث ہے۔ بلکہ موت کے منہ میں گرنے کا خطرہ ہے۔ جبکہ وہ غفلت اور بے پروائی کی نیند میں سوتے رہے، تو انھوں نے بہت سے زرین مواقع کھو دئے ہیں جن سے وہ غیر ممالک کے برادران اسلام سے ہمدردی اور اعانت حاصل کر سکتے تھے۔ اور ان کو وہ اپنے نذر و نیاز پیش کر سکتے تھے۔ ایسے زرین مواقع کے کھو جانے سے نہ صرف خود بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا، بلکہ عالم اسلام کو کافی نقصان پہونچایا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ایک مدت کی بے حسی اور لاپروائی کے بعد اب انمیں جدید زندگی کے آثار نظر آ رہے ہیں، ان کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ بیدار ہو گئے ہیں۔ وہ اب اپنا مرکز اور منبع تلاش کر رہے ہیں انھوں نے یہ بات سمجھ لی کہ:۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں!
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں!

مرکز کی طرف رجوع کرنے کے لئے اور جماعت کیساتھ کام کرنے کیلئے انہوں نے یہ بات سب سے اہم سمجھا کہ اسلامی دنیا میں جو زبانیں ہیں انکو سیکھیں جن کی وجہ سے مسلمان چین اور غیر ممالک کے درمیان ہم آہنگی ———

Marfat.com

اور تعلقات پیدا کر سکے۔ چنانچہ ایک طرف بعض بیدار چین مسلمانان نے ملک میں اس وقت نہایت منظم کیساتھ جدید طریقہ پر اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی۔ اور اسلامی عقائد و خیالات وسیع طور پر پھیلانے کیلئے جرائد اور رسالے جاری کئے اور بعض مذہبی کتابیں جو انگریزی اور عربی زبانوں میں تھیں، چینی زبان میں ترجمہ کرائی۔ دوسری طرف بعض مسلمان طلبہ نے ذاتی شوق کی بنا پر، ان پرانے رسموں اور عادتوں کو توڑ دیا جو عرصے سے چینی مسلمانوں کی طبیعت ثانی بنگئے تھے۔ یعنی انہوں نے علم کی تلاش میں گھر چھوڑ کر باہر نکلے۔ بعض ترکی گئے۔ بعض مصر اور بعض ہندوستان۔ یہ لوگ اگرچہ محسوس کرتے تھے کہ ان کے راہ میں بہت رکاوٹیں ہیں اور ان پر غالب آنا بہت مشکل ہے مگر باوجود ان دشواریوں کے وہ اپنی ہمت اور استقلال کے بھروسے پر اپنی ملک کیلئے فا[illegible] سمجھتے ہیں۔ منجملہ ان مقاصد کے جنکی سلسلہ پر یہ لوگ اپنی زندگی [illegible] کے لئے تیار ہیں۔ انمیں سے ایک یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعے سے مسل[illegible] چین اور غیر ممالک کے درمیان اچھے تعلقات قائم کریں باہر کے مسلمانوں کے حالات ملک والوں کو آگاہ کریں۔ اور ملک کے مسلمانوں کی خبریں غیر ممالک کے بھائیوں تک پہنچائیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانان چین کی طرف سے ان بھائیوں تک جو دور دراز ملکوں میں مقیم ہیں یہ پیغام پہنچا دیں کہ اُسی سرزمین میں جنکو جغرافی اصطلاح میں چین کہتے ہیں کوئی ساڑھے چھ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ معاشی اور سیاسی حیثیت سے ان کی حالت اچھی ہے۔ کیونکہ ان میں ہر طبقہ کے لوگ موجود ہیں، بہت کم ایسے ہیں جو غیر کے مقروض ہوں۔ اور ان کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرتے ہوں۔ سیاسی میدان میں وہ بھی کسی سے پیچھے نہیں

حکومت چین کے قوموں کی جو حیثیت ہے، وہی مسلمانوں کی۔ انکو جو حقوق حاصل ہیں وہی حقوق مسلمانوں کو۔ کیونکہ اور دوسرے موٹو چین کی جمہوری حکومت کی بنیادی اُصولوں میں سے ایک اُصول یہ ہے کہ "ہنتی، مانچو، منگوئی ہانتی اور مسلمان سب برابر ہیں" ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی تفوق یا فضیلت قانوناً حاصل نہیں ہے۔ مگر ہاں! مذہبی تعلیم میں مسلمان بہت پیچھے ہیں، وجہ یہ ہے کہ وہاں مذہبی تعلیم کا چرچا بہت کم ہے اور عام مسلمان جاہل ہیں۔ مذہبی کام کرنے کے لئے اچھے اور مناسب آدمی ملنا دشوار ہے۔ جو لوگ کچھ عربی یا فارسی جانتے ہیں، وہ انگریزی سے بالکل ناواقف۔ اور جو انگریزی جانتے ہیں، وہ عربی سے بالکل بے خبر۔ مزید برآں معلومات عامہ اور دنیا کی اہم تحریکوں سے باخبر اور واقف رہنا مذہبی پیشواؤں کے نزدیک بیکار بلکہ گناہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرزمین چین میں اسلام کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہے جو مسیحیت کو حاصل ہے۔ مگر اُمید قوی ہے کہ دس پندرہ سال کے اندر ایک طرف وہ اپنی جد و جہد سے، اور دوسری طرف بیرونی مسلمانوں کی مدد سے اسلامی تعلیم کی روشنی چین کے تمام تاریک گوشہ میں پھیلا دیں گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ تکبیر کے غلغلے اور اذان کی آوازیں فضائے آسمانی میں گونجتی رہیں گی۔ اور پھر ہم یہ کہیں گے۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

بدرالدین چینی
متعلم۔ جامعہ۔ دہلی

دسمبر ۱۹۳۲ء

Marfat.com

رسالہ ندیم گیا (۱۹۳۱ء — ۱۹۴۹ء) سے انتخاب ۱۶

نام نیک رفتگاں ضائع مکن

اسلامی تہذیب و ثقافت

۲

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ

Marfat.com